روشن آبگینے
(تذکرۂ محسناتِ جماعتِ اسلامی)

مرتبہ: روبینہ فرید

تدوینِ تاریخ کمیٹی، حلقہ خواتین، جماعت اسلامی پاکستان

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ!

کتاب: روشن آبگینے (تذکرۂ محسناتِ جماعت اسلامی)
مرتبہ: روبینہ فرید
معاونین: عالیہ شمیم، مہر افشاں، فریحہ مبارک
ناشر: تدوینِ تاریخ کمیٹی، جماعت اسلامی پاکستان (حلقہ خواتین)
تصمیم وتزئین: معارف پبلی کیشنز 033 3322 6789
اشاعت: رجب المرجب ۱۴۳۶ھ - مئی ۲۰۱۵ء
تعداد: ۲۲۰۰
قیمت: ..... روپے
تقسیم کنندہ:

انتساب

''اُن مسافروں کے نام
جو دعوتِ حق کے سفر
کا حصہ بنے۔''

ارشادِ الٰہی

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝

(الاحزاب۔۲۳)

''ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔ انھوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی''۔

فہرستِ مضامین

☆ اقامت دین میں خواتین کا کردار سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۷

☆ پیغامات

محترم سراج الحق صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان ۱۱

محترمہ عائشہ منور صاحبہ سابقہ قیمّہ حلقہ خواتین ۱۳

ڈاکٹر کوثر فردوس صاحبہ سابقہ قیمّہ حلقہ خواتین ۱۴

ڈاکٹر رخسانہ جبیں صاحبہ سابقہ قیمّہ حلقہ خواتین ۱۵

محترمہ دردانہ صدیقی صاحبہ قیمّہ حلقہ خواتین ۱۷

☆ پیش لفظ حافظ محمد ادریس ۱۸

☆ ابتدائیہ روبینہ فرید ۲۲

مضامین

m حمیدہ بیگم ۲۹

m اُمّ زبیر ۴۵

m نیّر بانو ۶۱

m محمودہ بیگم (بیگم سید ابوالاعلیٰ مودودی) ۸۱

m کرم النساء (امّی جی) ۹۱

m بنت الاسلام ۱۰۳

m احمدیہ بیگم ۱۲۱

m مسعودہ بیگم ۱۳۱

m بنتِ مجتبیٰ مینا ۱۴۵

m روشن نسرین ۱۵۵

m بدرالنساء (امّ اکبر) ۱۶۵

m زبیدہ صلاح الدین ۱۸۷

m عذرا جمال ۲۰۳

m فیض النساء ۲۲۱

m صفیہ ناہید ۲۳۳

m ڈاکٹر فوزیہ ناہید ۲۴۳

m کلثوم عبیدی ۲۶۹

m سیدہ میمونہ رضوی ۲۷۹

m مسعودہ افضل ۲۸۵

m مشعل پروین ۳۰۳

m ڈاکٹر عذرا بتول ۳۱۵

m نور جہاں کنول ۳۳۷

اقامتِ دین میں خواتین کا کردار

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

’’خدا کے ہاں کوئی شخص کچھ بھی نہیں پا سکتا جب تک کہ اس نے خود کچھ پانے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس لیے اسلام کا تقاضا ہے کہ عورتوں اور مردوں کو یکساں اپنی اپنی نجات کی فکر ہو۔ ہر ایک دل و جان سے وہ خدمات بجا لائے جو اسے خدا کی سزا سے بچائیں اور اس کے انعام کا مستحق بنائیں۔ اس وقت عورتوں کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنے گھروں اور اپنے خاندان، اور اپنے ہمسایوں اور اپنے ملنے جلنے والوں کے گھروں کو شرک و جاہلیت اور فسق سے پاک کرنے کی کوشش کریں، گھروں کی معاشرت کو اسلامی بنائیں، اَن پڑھ اور نیم خواندہ عورتوں میں علم دین کی روشنی پھیلائیں۔ تعلیم یافتہ خواتین کے خیالات کی اصلاح کریں، خوشحال گھرانوں میں خدا سے غفلت اور اسلام سے دوری کی جو بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں، ان کو روکیں، اپنی اولاد کو اسلام پہ اٹھائیں، اپنے گھروں کے مردوں کو، اگر وہ فسق و فجور اور بے دینی میں مبتلا ہوں تو راہِ راست پہ لانے کی کوشش کریں اور اگر وہ اسلام کی راہ میں کوئی خدمت کر رہے ہوں تو اپنی رفاقت اور معاونت سے ان کا ہاتھ بٹائیں۔‘‘ (روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم)

’’خوب سمجھ لیجیے کہ والدین ہوں یا بھائی بہن یا شوہر یا اولاد، کسی کا حق بھی آپ کے اوپر خدا اور اس کے رسولؐ سے بڑھ کر نہیں، برابر نہیں۔ کوئی بھی اس کا مستحق نہیں کہ اس کو خوش کرنے اور راضی رکھنے کے لیے آپ خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کریں۔ کوئی آپ کو خدا اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین سے بڑھ کر عزیز نہیں ہونا چاہیے اور کسی کا خوف بھی آپ کے دل میں اس حد تک نہ ہونا چاہیے کہ آپ اس سے ڈر کر خدا سے نڈر ہو جائیں۔ یہ کیفیت اگر آپ کے اندر پیدا ہو جائے تو دین کا راستہ آپ کے لیے آسان ہو جائے گا اور کوئی طاقت آپ کو راہِ حق سے نہ روک سکے گی نہ ہٹا سکے گی۔‘‘ (روداد جماعت اسلامی حصہ پنجم)

پیغامات

جماعت اسلامی پاکستان

محترم سراج الحق صاحب

امیر جماعت اسلامی، پاکستان

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی زندگی کو ہمارے لیے بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.

''تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے''۔ نبی اکرم ﷺ کی اتباع ہی سے بندہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ.

''اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا''۔

بہت ہی سعادت مند ہیں وہ ہستیاں جنہوں نے زندگی کے ہر ہر گوشے میں نبی اکرم ﷺ کی پیروی کرنے کی بھرپور کوشش کی، حتیٰ کہ اللہ کی زمین پر اللہ کے نظام کو غالب کرنے کی جدوجہد میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ حلقہ خواتین نے ''مرحوم رہنما خواتین'' کے نام سے ایسی ہی سعادت مند ہستیوں کے حسین تذکروں سے معمور کتاب شائع کرنے کا عزم کیا ہے اور اس کتاب کا مقصد بھی متعین کر لیا ہے کہ کارکنان کو نصب العین کے عملی تقاضوں کی رہنمائی ملے۔ اپنے محسنوں کو یاد کرنا اور زندگی کی عملی جدوجہد میں ان کے افکار و اعمال سے رہنمائی لینا عظیم قوموں کا شیوہ ہوتا ہے۔ میں اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اس کتاب سے ضرور استفادہ کریں گی اور اس کتاب کے مقاصد کو عملی جامہ پہنائیں گی۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ ہمارے لیے حقیقی نمونہ تو نبی اکرم ﷺ کی زندگی ہے، لیکن وہ عظیم ہستیاں جنہوں نے اپنا پل پل آپ ﷺ کے اسوہ کے مطابق گزارنے کی کوشش کی

ہو اور موجودہ دور کی مشکلات کو اسوہ نبوی ﷺ کے مطابق حل کرنے کی سعی میں اپنا حصہ ڈالا ہو، ان سے بھی اس طرح رہنمائی لینا کہ جس طرح انہوں نے آپ ﷺ کی اتباع کی ہے، اسی طرح ہم بھی اتباع کرنے کی کوشش کریں، اس سے بھی مشکلات دم توڑتی ہیں اور منزل کی طرف بڑھنے کے عزم اور ولولے کو مہمیز ملتی ہے۔

حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سوال کرے گا، میری خاطر محبت کرنے والے لوگ کہاں ہیں، آج جبکہ میرے عرش کے سوا کوئی سایہ نہیں میں ان کو اپنے عرش کے نیچے جگہ دوں گا۔ (صحیح مسلم)

اسی طرح ایک اور روایت میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک شخص اپنے گھر سے دوسری بستی کی طرف چلا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو بھیجا جس نے اس شخص سے پوچھا ''کہاں کا ارادہ ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''اس بستی میں میرا ایک بھائی ہے، اس سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں'' اس نے پوچھا کہ کیا کوئی دنیوی لین دین کا معاملہ ہے، تو اس نے جواب میں کہا ''نہیں، میں تو اس سے محض اللہ کی خاطر محبت کرتا ہوں''۔ اس پر فرشتے نے کہا: ''میں اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں تاکہ تجھے اللہ کا پیغام پہنچا دوں کہ جس طرح تو اس بھائی سے محبت کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت کرتا ہے''۔

میری نظر میں یہ کتاب راہِ حق میں جدوجہد کرنے والی ان خواتین کی اللہ کے لیے آپس میں محبت کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ حلقہ خواتین کو میں اس حسین کاوش پر پیشگی مبارک باد دیتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ کے لیے آپس میں محبت کرنے والوں کا یہ قافلہ اتباع رسول ﷺ میں منزل کی جانب پیش قدمی کرتا رہے اور کامیابی اس کے قدم چومے۔ اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت ان کا مقدر نہ بنے۔ وہ تو ایک قدم آگے بڑھنے والوں کی طرف دس قدم آگے بڑھتا ہے۔

محترمہ عائشہ منور صاحبہ

سابقہ قیمّہ، حلقہ خواتین

قرآن مجید جو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جس پر ہمارا ایمان ہے اور جس کی ہدایات پر عمل ہی آخرت اور دنیا میں کامیابی کی کنجی ہے اس کی تعلیمات میں واضح طور پر یہ بات موجود ہے کہ انسانیت کی فلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف انفرادی زندگی کے لیے احکامات دیے ہیں بلکہ مسلمان معاشرے کے نظام کو چلانے کے لیے مکمل اجتماعی نظام بھی دیا ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ دنیا میں آنے والا ہر مسلمان خیر امت کا حصہ ہے۔ **كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ** (آل عمران) اور تمام انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا اس کی ذمہ داری ہے اور اگر مسلمانوں کی کمزوریاں اس حد تک بڑھ جائیں کہ وہ خیرِ امت کا فرض انجام نہ دے رہے ہوں تو پھر ایک مسلمان جماعت کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ مسلمان امت کو ان کا فرضِ عین یاد دلائے اور مسلم معاشرے کا اجتماعی نظام ان احکامات کی روشنی میں بنانے کی کوشش کرے جو قرآن مجید میں انسانیت کی بھلائی کے لیے طے کر دیے گئے ہیں۔

الحمدللہ جماعت اسلامی قرآن و حدیث کی دعوت کو عام کرنے اور اس کے نظام کو نافذ کرنے کی مقدور بھر کوشش کر رہی ہے۔ یہ کتاب اُن پاکیزہ سیرت خواتین کے تذکرے پر مشتمل ہے، جنھوں نے دعوت الی اللہ کو حرزِ جاں بنایا اور یہی ان کی شناخت و پہچان بن گئی۔ ان خواتین کے تذکرے پر مشتمل کتاب مرتب کرنے پر تدوینِ تاریخ کمیٹی مبارکباد کی مستحق ہے۔

ڈاکٹر کوثر فردوس صاحبہ

سابقہ قیمّہ، حلقہ خواتین

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نزولِ وحی کے بعد حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لاتے ہیں، تو وہ تسلی و تشفی دیتی ہیں، اپنے چچا کے پاس لے جاتی ہیں اور پھر اپنا مال دیتی ہیں اور زندگی بھر کی رفاقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معاون بنتی ہیں۔

خواتین دعوت دین کے لیے مردوں کی دست و باز و رہی ہیں۔ حلقہ خواتین جماعت اسلامی بھی ایسی ہی خواتین کا قافلہ ہے، جو اپنے میدانِ کار میں استطاعت بھر مصروفِ عمل رہی ہیں۔ ان خواتین کے حالات زندگی آئندہ آنے والوں کے لیے مشعل راہ ہی نہیں بلکہ جماعت کی تاریخ کی داستان بھی ہیں، جس سے بہت سارے سبق حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

اِن خواتین کے حالاتِ زندگی، دعوتِ دین کی سرگرمیاں، تنظیم کے استحکام کے لیے اِن کی جدو جہد اور اِس کا ارتقاء، اپنے گھر اور خاندان کے ساتھ محلے اور حلقہ تعارف کی خواتین میں دین سکھانے کی مساعی شامل ہیں۔ جو ہم سب کے حوصلے کو بڑھانے کا ذریعہ اور کام کی راہیں نکالنے کے لیے تجربہ کار لوگوں کی طرف سے فراہم کی گئی رہنمائی ہے۔

اِن قابلِ ستائش مساعی کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کا کام کرنے والوں کو اجرِ عظیم سے نوازے، آمین۔

ڈاکٹر رخسانہ جبیں صاحبہ

سابقہ قیمّہ، حلقہ خواتین

اقامتِ دین کی رواں دواں تحریک کے چمن کی مہکتی کلیوں کا یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ان پاکباز ہستیوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے آخر دم تک انتھک جدو جہد کی۔

یہ جماعت اسلامی حلقہ خواتین کی زندگیوں کے چیدہ روشن ابواب ہیں، جو تحریک کے ہر کارکن کے لیے روشنی کے چراغ ہیں۔ ان کا مطالعہ جذبات کو مہمیز دینے والا ۔۔عمل کی نئی راہیں دکھانے والا اور مشکلات میں عزم کو جوان رکھنے والا ثابت ہوگا، ان شاءاللہ

ہماری ان رہنما خواتین نے دعوت وتبلیغ کے ساتھ اخلاقی معاملات اور رشتوں کی پاسداری میں بھی مثالیں قائم کی ہیں ۔ان میں سے بیشتر معزز خواتین بیک وقت بہترین بیوی، محبت کرنے والی ماں، احساس کرنے والی ساس اور عزت کرنے والی سمدھن بھی رہیں ساتھ ہی تحریکی زندگی میں منتظمہ، مدرسہ اور مثالی کارکن بھی رہیں۔

اگر چہ وقت کے یہی چوبیس گھنٹے ان خواتین کے پاس بھی تھے، جو ہمارے پاس ہیں لیکن وہ ان کا بہترین استعمال کر کے ہم سب کے لیے رول ماڈل بن گئیں۔ان کی زندگیوں کو آزمایا بھی گیا، کسی کو کینسر اور فالج سے، کسی کے بچے شہید کیے گئے۔لیکن ان کا مشن ہر حال میں جاری رہا۔کوئی بھی مشکل ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی۔تقریباً سب کی زندگی میں نصب العین سے لگن کے ساتھ ساتھ جہدِ مسلسل، فکرِ آخرت، توکل علی اللہ، صبر واستقامت اور ذوق مطالعہ کی صفات مشترک نظر آتی ہیں ۔کوئی بھی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک اس کے ارکان باہم سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہ ہوں، باہم محبتوں سے جڑے ہوئے نہ ہوں ان بزرگ خواتین میں تحریکی ساتھیوں سے محبت اور ان کا خیال رکھنے، باہم ایک دوسرے کی مدد

کرنے کی عملی مثالیں بھی ہمیں نظر آتی ہیں۔

تاریخ ان خواتین کو سنہری الفاظ میں یاد رکھے گی، جنہوں نے قوم کو قرآن سے جوڑنے اور پاکستان کو عملی طور پر اسلامی نظریاتی ریاست بنانے کے لیے تن من دھن لگا دیا اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے معاشرے میں ایسے بہترین بیج بوئے کہ اسلامی تحریک کی کھیتی آج اپنے تنے پر کھڑی ہے جس کی گواہی ۲۰۱۴ء میں ہونے والے اجتماع عام میں مینار پاکستان نے دی کہ خواتین کی اتنی بڑی تعداد حاضر ہوئی کہ جس کو سمیٹنے سے اس کا دامن قاصر تھا۔

اللہ ان پاکباز خواتین کی قبروں کو نور سے بھر دے، ان کی محنتوں کا صلہ جنت کے اعلیٰ مقامات اور پاکستان میں اسلامی انقلاب کی صورت میں دے۔ان کی تمام نیکیوں کو ان کی کمزوریوں کا کفارہ بنا دے اور ہم سب کو ان کی طرح رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

محترمہ دردانہ صدیقی صاحبہ

قیمّہ حلقہ خواتین

''کچھ لوگ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور کچھ ہیں جو ابھی منتظر ہیں''۔(سورۃ الاحزاب)

گنج ہائے گراں مایہ کی حیثیت رکھنے والی یہ مرحوم رہنما خواتین روشن آ بگینوں کی مانند ہیں۔ مبارک اور شکریہ کی مستحق ہیں وہ خواتین جنہوں نے اپنی ان بہنوں کے حالاتِ زندگی تحریر کرنے کے بارے میں سوچا اور فیصلہ کیا، اور اس کے لیے محنت اور کاوش کی۔ یقیناً یہ کتاب اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی داعیاتِ حق کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہوگی۔ جس سے ہم آج بھی اور آنے والے ہر دَور میں ایک رہنمائی اور اپنے جذبوں اور ولولوں کے لیے توانائی حاصل کرتے رہیں گے۔ اس کتاب کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ الٰہی اور نبوی مشن رکھنے والی اس اجتماعیت کے دامن میں کیسے کیسے گوہرِ نایاب رب کائنات نے اس صدی میں عطا فرمائے، جنہوں نے واقعی اپنے آپ کو اس عظیم نصب العین کا اہل ثابت کرتے ہوئے قرونِ اولیٰ کی مثالوں کو تازہ کیا۔

اللہ سے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اپنی ان پاک باز مخلص بندیوں کو جوارِ رحمت میں بہتر سے بہتر مقام عطا فرمائے اور ہم سب کو ان جیسا خلوص و استقلال، للّٰہیت، مقصد کے حصول کی لگن اور فرض شناسی کا جذبہ عطا فرمائے، تاکہ ہم بھی دنیا میں سچی مومنات کا کردار عطا کریں اور آخرت میں رضائے الٰہی سے ہمکنار ہوں، آمین۔

حلقہ خواتین جماعت اسلامی کے اس قیمتی اثاثے کو مرتب کرنے میں بنیادی کردار ادا کرنے والی بہن روبینہ فرید کے لیے جزائے خیر کی دعائیں ہیں۔ ان مرحوم بہنوں کے لیے دُعا گو ہوں کہ:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

پیش لفظ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ۱۹۴۱ء میں جب جماعت اسلامی قائم کی تو اس کے مقاصد عالیہ میں فرد اور معاشرے کی اصلاح کے ذریعے حکومت الٰہیہ کا قیام بھی پیشِ نظر تھا۔ جماعت اسلامی کی جدوجہد میں جن رجال کار نے ایفائے عہد، استقامت اور جانثاری و وفاداری کی شمعیں روشن کیں، ان کی نظیر عصر حاضر میں ملنا مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مردانِ کار نے شب و روز اسلامی حکومت کے قیام کے لیے انتہائی جانگسل، حوصلہ شکن اور صبر آزما حالات میں فقط اللہ کی رضا کے لیے محنت و مشقت سے کام کیا۔ اُس زمانے کی برطانوی حکومت کی ملازمتیں ترک کر کے اور اپنے خاندان کی فہمائشوں کے علی الرغم جماعت اسلامی کی اقامتِ دین کی تحریک میں شرکت کی اور مرتے دَم تک وفاداری کا عہد نبھایا۔

اِن رجالِ کار کی سوانح حیات میں جھانک کر دیکھیں تو ذرّہ بھر شک نہیں رہتا کہ ان کے ان تمام عظیم کارناموں کے پیچھے ان کے گھر کی خواتین، بصورت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کا کلیدی کردار ہے۔ بیویاں بالخصوص اس حوالے سے روشنی کے چراغ ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اقامتِ دین کی آواز پر جن سعید روحوں نے لبیک کہا ان میں مردوں کے علاوہ خواتین بھی شامل تھیں۔ جماعت کے قیام پر اگرچہ مردوں نے سبقت حاصل کی، لیکن خواتین کی ایک بڑی تعداد بھی اسلامی لٹریچر سے متاثر ہو چکی تھی، جماعت اسلامی کے جن ارکان کو نقل مکانی کے مراحل سے گزرنا پڑا، ان کی ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کو بھی یہ شدائد برداشت کرنے پڑے۔ اپنے رکن مردوں کے ساتھ انہیں بھی پٹھان کوٹ میں بے سروسامانی کے عالم میں چند برس گزار کر ۱۹۴۷ء میں پھر پاکستان ہجرت کرنا پڑی۔ یوں یہ خواتین دورِ نبویؐ کی عظیم صحابیات کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے روزِ اوّل سے اس قافلہ سخت جان کا حصہ رہی ہیں۔

کسی بھی تحریک کے لیے خواتین کی شرکت ناگزیر ہے۔ مردوں کی جدوجہد کے ساتھ خواتین کی کارکردگی مل کر ہی بہترین نتائج پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لیے گاڑی کے

دو پہیوں کی مانند ہیں۔ دونوں ایک ہی سمت میں ایک ہی رفتار سے کام کریں تو بہتر نتائج ہوں گے، ورنہ گاڑی کے منزل پر پہنچنے کے امکانات کم ہو جائیں گے۔ حضور اکرمؐ کے عہد میں ابتدائی دور سے لے کر آپؐ کی رحلت تک خواتین صحابیاتؓ، مرد صحابہؓ کی معاون و مددگار تھیں۔ سید مودودیؒ نے بھی مسلم معاشرے میں خواتین کی اہمیت واضح کی اور انہیں اقامتِ دین کے لیے کی جانے والی جدوجہد میں شرکت پر آمادہ کیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے خواتین اور طالبات سے متعدد مرتبہ خطاب کیا، جلسوں اور رسالوں کے لیے پیغامات بھیجے، خواتین اور طالبات کے سوالوں کے جوابات دیے۔

۱۹۴۷ء میں سید مودودیؒ نے خواتین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''ہر اجتماعی تحریک عورتوں کی شرکت اور تعاون کو اہمیت دینے پر مجبور ہے .....اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ اسلام ٹھیک ٹھیک خدا کی بنائی ہوئی ساخت کے مطابق انسانی زندگی کا نظام درست کرنا چاہتا ہے جس کے لیے عورتوں کا درست ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا مردوں کا درست ہونا''۔

سید مودودی کی ان ہدایات پر جماعت اسلامی سے وابستہ خواتین نے جس خلوص، دیانت اور محنت سے عمل کیا اور ایسے جاں گسل حالات میں اپنے آپ کو اقامتِ دین کے لیے وقف کیا، یہ ہمارے حلقۂ خواتین سے وابستہ ہر خاتون کے لیے ایک عظیم اعزاز ہے۔ اقامتِ دین کی جدوجہد میں ان خواتین کی کارگزاریوں سے جماعت اسلامی کو بے پناہ تقویت حاصل ہوئی۔ زیرِنظر کتاب ان ہی خواتین کے کارناموں کی یاد تازہ رکھنے کے لیے مرتّب کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ان چند مرحوم خواتین کی داعیانہ سرگرمیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو جماعت اسلامی میں سرگرم عمل تھیں۔ آج بھی جب ہم مردانہ اور زنانہ نظم کا موازنہ کرتے ہیں تو سچی بات یہ ہے کہ اپنی مجبوریوں اور محدودیت کے باوجود خواتین بہنیں اور بیٹیاں بہت آگے نظر آتی ہیں۔ کارکردگی رپورٹس کے اعداد و شمار بھی اس پر گواہ ہیں اور راقم نے بارہا مختلف اجتماعات و نشستوں میں اس کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔

خواتین کا دائرہ کار ان کی گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ دعوت و تبلیغ کی سرگرمیوں، اجتماعات میں شرکت اور لٹریچر کی توسیع تک پھیلا ہوا ہے۔ جماعت اسلامی کی خواتین نے اپنے گھروں کے ماحول کو اسلامی بنانے، اپنے بچوں کو اسلام کا داعی بنانے اور اقامتِ دین کی

جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے تیار کیا۔ مردوں پر جب سرکاری مظالم اور ابتلا کے دور آئے تو گھر کے محاذ پر ان خواتین نے نہایت جرأت و عزیمت اور صبر و استقامت کے ساتھ اپنا فرض ادا کیا۔ ان کے تعاون ہی کی بدولت مرد کارکنان و قائدین حکمرانوں کے لیے لوہے کے چنے ثابت ہوئے۔ روکھی سوکھی کھا کر، مشکلات برداشت کر کے ان خواتین نے اپنے بچوں کو سنبھالا دیا۔ اللہ ان سب کو اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔

جماعت اسلامی کی ان خواتین کی کارگزاریوں کا پورا ریکارڈ دستیاب نہیں۔ ان کے سوانح سے متعلق جو مضامین دستیاب ہوئے انہیں کتاب کی صورت میں ''روشن آ گینے'' کے نام سے جماعت کے حلقۂ خواتین کی طرف سے شائع کیا جا رہا ہے۔ جماعت اسلامی کی ہزاروں خواتین میں سے صرف چند خواتین کی ولولہ انگیز، ایمان افروز اور فقط اللہ کی رضا کے لیے کی گئی جدوجہد کے کچھ واقعات، آج بھی قارئین کے دلوں میں دینِ حق کی سربلندی کے لیے سعی و عمل کا داعیہ پیدا کرنے میں اتنے ہی مؤثر ہیں جتنی یہ خواتین میدانِ عمل میں مؤثر تھیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے قارئین کو یہ اندازہ ہوگا کہ کام کرنے کا جذبہ ہو اور اخلاص کی نعمت اللہ نے عطا کی ہو تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لیے اپنی راہیں کھول دیتا ہے جیسے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا..... (العنکبوت:۶۹)

''جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے''۔

یہ کتاب انہی خدا رسیدہ مومنات و صالحات کی حیات مستعار کی کارگاہ زندگی میں کارہائے نمایاں کا مرقع ہے۔ یہ کتاب ہر اُس شخص کے مطالعہ میں رہنی چاہیے جو دعوت دین کے کام کا ذوق رکھتا ہے اور جسے اللہ کے دین کی سربلندی اور اقامتِ دین کا شوق ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائے اور قارئین کو اقامتِ دین کے لیے کوشش کرنے کا جذبہ عطا فرمائے۔ حلقہ خواتین مبارکباد کا مستحق ہے کہ اپنی محسنات کی خدمات پر یہ دستاویز تیار کر کے شائع کی جا رہی ہے۔

حافظ محمد ادریس
نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان
ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی، منصورہ لاہور

ابتدائیہ

تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں جس نے موت وزندگی کو تخلیق کیا تا کہ آزما کر دیکھے کہ ہم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ قرآن پاک واضح کرتا ہے کہ روزِ جزا تمام انسان تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ بائیں ہاتھ والے، دائیں ہاتھ والے اور آگے رہنے والے۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ کی قرآنی پکار دراصل آگے رہنے والوں کے مرتبے کو حاصل کرنے کی جدوجہد کی پکار ہے۔ بندہ مومن کو اِس کا رب بار بار پکارتا ہے کہ دوڑ کر چلو، جلدی کرو، سبقت لے جاؤ۔ تمہارا توشۂ عمر قلیل اور آخرت کی راہ طویل ہے۔

لاکھوں درود اور کروڑوں سلام پیارے نبی کریم حضرت محمد ﷺ پر جو ہمیں دین پر عمل کرنا سکھا کر اور مدینہ جیسی اسلامی بستی کا نمونہ قائم کر کے ہماری رہنمائی فرما گئے۔ اللہ کی زمین پر دین کے غلبے کا نصب العین آپؐ کے بعد اب امت مسلمہ کا بنیادی فریضہ ہے اور امت کے ہر فرد کی پرکھ اسی کسوٹی پر کی جانی ہے۔

یہ اللہ رب العالمین کا احسان ہے کہ اس نے ہر دور میں تاریکی و جہالت کی طغیانی کو حق کے نور سے جگمگانے کے لیے کسی نہ کسی مردِ کامل کو اٹھا کھڑا کیا جس نے کفر کے آگے بند باندھے، مسلمانوں کو ان کا فرض منصبی یاد دلایا اور معرکۂ روح وبدن کو پھر سے گرم کیا۔

انگریزوں کی حکمرانی ایک ایسا المیہ تھا جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو مغلوبیت کے جذبہ سے اس طرح دوچار کر دیا تھا کہ ان کی فکری بنیادیں شدید ارتعاش سے دوچار تھیں۔ مغرب کے علم، ٹیکنالوجی اور نظریات کی چکا چوند نے ان کا اپنے دینی عقائد ونظریات اور اقدار و روایات پر سے ایمان متزلزل کر دیا تھا۔ زندگی گزارنے کا مغربی نظریہ رواج پاتا چلا جا رہا تھا اور اسلام کو مغرب کے معیار کے مطابق ڈھالنے کا عمل شروع ہو چلا تھا ایسے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اللہ تعالیٰ نے دین کا سپاہی بنا کر اتارا۔ قرآن پاک کو شاہ کلید سمجھنے والے مولانا

مودودیؒ اللہ کے دین کے بہترین داعی بن کر اٹھے اور دلائل کے ہتھیار سے شک کی ہر الجھن کو سلجھایا۔ دین کو مکمل نظام کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کو اقامت دین کی فرضیت کے لیے محو جہاد ہونے پر ابھارا۔ سالہا سال آپ ترجمان القرآن کے ذریعہ صدائے حق کو بلند کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں اس خیال کو راسخ کر دیا کہ اس اذانِ حق کو قبول کرنے والوں کو ایک اجتماعیت کی شکل دینا ناگزیر ہے۔

۲۶/اگست ۱۹۴۱ء کا تاریخی دن تھا جب اس خیال نے جماعت اسلامی کی شکل اختیار کی۔ ایک کمرے میں سما جانے والے چند لوگوں نے اللہ رب العالمین کو حاضر و ناظر جان کر اس کے دین کی اقامت میں اپنے آپ کو کھپا دینے کا عزم کیا اور مولانا مودودی کو سالار قافلہ منتخب کر لیا۔ آغاز ہی سے سالار قافلہ کے ذہن میں یہ بات واضح تھی کہ اجتماعی نظام کی گاڑی کو صحیح سمت میں رواں رکھنے کے لیے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی شرکت بھی ضروری ہے لہٰذا انھوں نے ارکان جماعت کو ہدایت کی کہ اپنے گھروں کی خواتین کو دینِ حق اور جماعتِ اسلامی کی دعوت سے حکمت کے ساتھ آشنا کروائیں اور انھیں اس دعوت کو آگے پھیلانے پر تیار کریں۔ ارکانِ جماعت کی دعوت اور مولانا کے لٹریچر کے پھیلاؤ کے ذریعے خواتین بھی اس تحریک کی دعوت سے متعارف ہوتی گئیں۔ چراغ سے چراغ جلتا گیا یہاں تک کہ ۱۵/فروری ۱۹۴۸ء کو اِچھرہ لاہور میں ڈیڑھ سو نمائندہ خواتین کا اجتماع منعقد ہوا جس میں مرکزی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق جماعت اسلامی حلقہ خواتین کا قیام عمل میں لایا گیا اور امیر جماعت سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے رکن جماعت محترمہ حمیدہ بیگم کو حلقہ خواتین کی پہلی قیمہ مقرر کیا۔ اجتماع میں موجود خواتین نے مولانا مودودیؒ کی اس ہدایت کو حرزِ جاں بنا لیا کہ:

''اگر دین قبول ہے تو سچے دل سے اس کی پیروی کرو، ادھورے نہیں بلکہ پورے دین کو اپناؤ۔ اپنی گودوں اور گھروں کو مسلمان بناؤ تا کہ ان میں ایک مسلمان نسل پروان چڑھ سکے۔۔''

اس دن سے لے کر آج کے دن تک حلقہ خواتین اللہ کے دین کی دعوت اللہ کی بندیوں تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہے۔ نسل در نسل ہدایت کا سفر جاری ہے۔ دعوت حق کی اس رواں کشتی

کا ہر کوئی حسب استطاعت چپو چلا کر اگلے کے حوالے کر دیتا ہے۔ آپا حمیدہ بیگم سے لے کر ڈاکٹر رخسانہ جبین تک ہر قیادت نے کارکن خواتین کو اپنے جلو میں لے کر پاکستان کے چپّے چپّے پر حق کی شمعوں کو جلایا ہے۔ شہر ہوں یا دیہات، تعلیم یافتہ طبقہ ہو یا ناخواندہ، گھریلو خواتین ہوں یا ورکنگ ویمن، ایوان سیاست ہو یا خدمت خلق کا وسیع میدان حلقہ خواتین کی کارکن بہنیں حیا کی پوری پاسداری کے ساتھ ساتھ ہر جگہ فریضہ اقامت دین میں مصروف نظر آتی ہیں۔

ڈیڑھ سو خواتین سے بڑھ کر لاکھوں خواتین کا قافلہ بننے کا یہ سفر مکمل ہونا اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک اس کی بنیادوں میں صاحب عزیمت خواتین کے خلوص، محنت، ایثار و قربانی اور ہمہ جہتی جدو جہد کے جذبے کی اینٹیں نہ رکھی جائیں۔ زمین کے نمک کی حیثیت رکھنے والی چند خواتین نے اس پرآشوب دور میں خواتین میں دین کی دعوت اور اسلام کے مکمل نظام زندگی ہونے کے تصور کو پیش کرنا شروع کیا جب مرد و خواتین دین کے روایتی تصور پر عمل پیرا تھے جہاں چند عبادات و رسوم کو ہی کل دین سمجھا جاتا تھا۔ آج بلا مبالغہ حلقہ خواتین جماعت اسلامی، پاکستان میں خواتین کی سب سے بڑی تنظیم قرار دی جاسکتی ہے جو اپنے ایک مضبوط نظام کے ساتھ ہر عمر اور طبقہ فکر کی خواتین کو دین کا پیغام پہنچانے کے لیے کوشاں ہے۔

حلقہ خواتین کی مجلس شوریٰ نے جب اس بات کا فیصلہ کیا کہ ابتدا سے اب تک حلقہ خواتین کی تاریخ کو مرتب کیا جائے تو وہیں اس بات کی ضرورت بھی محسوس ہوئی کہ اس سفر میں شریک ان رہنما خواتین کے حالاتِ زندگی کو سامنے لایا جائے جنہوں نے اللہ کے حضور اٹھائے گئے عہد وفا کو بھرپور طریقے سے نبھانے کی جدوجہد کی۔ اگرچہ صحابہ و صحابیات کے عملی نمونے ہمارے سامنے موجود ہیں لیکن یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے وقت کے افراد کی عملی رہنمائی سے بہت کچھ سیکھنے اور اخذ کرنے والا ہوتا ہے۔ ایک تحریک میں کام کرنے والے افراد کا تجربہ، جدو جہد، اقوال و افعال نئے آنے والوں کے لیے ایک قیمتی متاع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اپنے ادوار کی تاریخ بنانے کے لیے
اپنے اسلاف کی تاریخ سے نسبت رکھنا

آپ کے ہاتھوں میں موجود کتاب میں ان رہنما خواتین کا تذکرہ محض چند یادوں کا تذکرہ

نہیں بلکہ دراصل یہ دعوت کو عمل میں ڈھالنے کا سبق ہے۔ وہ خواتین جنہوں نے اس جماعت کی دعوت کو سمجھا اور پورے شعور کے ساتھ قبول کیا ان کا کردار ایک ایسے چراغ کی مانند بن گیا جس نے ہر اس جگہ روشنی پھیلائی جہاں اسے رکھا گیا۔ اللہ، اللہ کے رسولؐ اور اللہ کے دین سے بے پناہ محبت رکھنے والی ان بہنوں کے تذکرے پر مشتمل اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ آج دین کا کام کرنے والیاں یہ سبق حاصل کریں کہ جذبے کو جنوں کیسے بنایا جاتا ہے؟ رکاوٹوں کے درمیان راستہ کیسے تلاش کیا جاتا ہے؟ بیج کس طرح ڈالے جاتے ہیں اور کیسے انہیں پروان چڑھایا جاتا ہے؟ نصب العین کو مقصد بنا کر اوقات کی تقسیم کس طور کی جاتی ہے؟ دلوں میں گھر کیسے کیا جاتا ہے اور عزیمت کی راہ پر کیسے چلا جاتا ہے؟

اس کتاب سے ایک کارکن کو یہ رہنمائی دینا مقصود ہے کہ وہ کس طرح اپنی ذات، گھر اور خاندان کے دائرے میں تزکیہ و تربیت، اصلاحِ معاشرہ اور اِقامتِ دین کی جدوجہد میں اجتماعیت کے ساتھ جُڑ کر اپنے جذبۂ حُبِّ دین کی تکمیل کرسکتا ہے۔

تاریخ جماعت کمیٹی حلقہ خواتین کو جب اس کتاب کے مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تو پہلے قدم پر ان خواتین کے ناموں کے انتخاب کا مرحلہ درپیش تھا جن کا اس کتاب میں تذکرہ کیا جائے۔ بہت سی ایسی بہنیں تھیں جو اپنے حصّے کا کام مکمل کر کے رب کے حضور پہنچ چکی ہیں۔ اللہ ان کی نیکیوں کی قدر دانی کرنے والا ہے لیکن کتاب میں ہر ایک کا تذکرہ کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا اس حوالے سے کچھ معیارات طے کیے گئے۔ یہ طے کیا گیا کہ ان خواتین کے ذکر کو لیا جائے جو بیس سے پچیس سال تحریک میں خدمت انجام دے چکی ہوں اور اس عرصے میں دعوتی، تربیتی اور تنظیمی میدان میں تحریکی خدمات اس طرح سرانجام دی ہوں کہ دوسروں سے نمایاں نظر آتی ہوں۔

کمیٹی نے اس معیار کی روشنی میں غور و خوض کے بعد ایک فہرست مرتب کی جس پر اس وقت کی قیّمہ حلقہ خواتین ڈاکٹر رخسانہ جبیں اور ناظمات صوبہ سے رہنمائی حاصل کی گئی۔ فہرست کی تکمیل کے بعد ان رہنما خواتین کے حالات زندگی سے تفصیلی واقفیت کے لیے ان کے اہل خانہ اور قریبی تحریکی افراد کو ایک سوالنامہ روانہ کیا گیا۔ ان افراد کے ساتھ انٹرویوز بھی کیے

گئے ۔بعض مضامین شائع شدہ مواد کی مدد سے مرتب کیے گئے۔ مرتب شدہ مواد کی صحت کو یقینی بنانے کے لیے اسے تحقیق و تنقید کی چھلنی سے گزارا گیا۔ مواد کی تصحیح و تصدیق کے بعد اسے حتمی شکل دی گئی۔ ہر مضمون کے آخر میں بنیادی ماخذات کو درج کیا گیا۔ پوری کتاب کی تکمیل کے بعد تحریک کی بزرگ خواتین سے اسے پڑھنے کی گزارش کی گئی تاکہ کسی اصلاح کی ضرورت ہو تو کی جا سکے۔ کتاب کے فنّی معیار کی بلندی کے لیے اس میدان کے تجربہ کار افراد سے کتاب کی اشاعت سے قبل رائے لے کر اس کو بہتر بنایا گیا۔ رسالہ بتول میں اشتہار کے ذریعہ کتاب کے مواد کے مزید حصول کی کوشش کی گئی۔ کمیٹی کے اراکین نے بار بار ان مضامین کو پڑھا اور باہمی گفتگو کے بعد ان مضامین کی نوک پلک سنواری۔ اس تمام جدو جہد کے بعد اس کتاب کو حتمی شکل دی گئی اور اب اسے آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مزید کچھ اکابر بہنوں کے نام بھی ہمیں کتاب کی تیاری کے دوران موصول ہوتے رہے لیکن کتاب کی ضخامت کے پیشِ نظر مزید مضامین شامل کرنا ممکن نہ تھا۔ ان شاء اللہ ان پر مضامین آئندہ شائع کیے جائیں گے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے وقت یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا. (النساء: ۲۸)۔ ''انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے''۔ کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں فرد کی محض خوبیوں کا ذکر ہے کیونکہ اس کتاب کا بنیادی مقصد دعوت حق کے عملی تقاضوں کی رہنمائی دینا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ تمام افراد کسی کمی و کمزوری سے مبرّا تھے۔ بحیثیت انسان ہم سب میں کوئی کمی یا کمزوری موجود ہوتی ہے لیکن ان افراد کی خوبیاں ان کی خامیوں پر بھاری تھیں جن کی جگمگاہٹ ان کی کمزوریوں کی پردہ داری کے لیے کافی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہیں کہ رب کائنات ان بہنوں کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور ان کی کمزوریوں سے درگزر فرمائے اور انہیں بہترین درجات سے نوازے آمین۔ یہ امر پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ جس طرح باغ میں موجود ہر پھول اپنی خوشبو اور رنگ میں دوسرے سے جدا ہوتا ہے اسی طرح ہر انسان بھی اپنی صفات میں دوسرے سے ممیّز حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب میں آپ کو شخصیتوں کا یہ تنوّع بھی نظر آئے گا۔ ہر فرد کے حالات، وسائل اور امکانات

جدا جدا تھے جس کے مطابق اس نے اسی دائرے کے اندر اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق جدو جہد کا حق ادا کیا۔

ہم نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ مذکورہ شخصیات کی زندگی کے وہ تمام پہلو سامنے لائے جا سکیں جن سے عملی رہنمائی ہو سکے۔ اس ضمن میں تفصیلی مواد فراہم کرنے والوں کے نام ماخذات میں درج کیے گئے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سے افراد سے معلومات کے حصول کے لیے رابطہ کیا گیا اور جو معلومات ان سے حاصل ہو سکیں انہیں مضمون میں سمو دیا گیا۔ اگر کسی مضمون میں تشنگی ہے تو اس کی وجہ مزید معلومات کے لیے ذرائع کی عدم دستیابی رہی۔ کتاب کے قارئین اگر ان ہستیوں کے متعلق مزید مواد فراہم کر سکیں تو ہم اس مواد کو کتاب کے اگلے ایڈیشن میں شاملِ اشاعت کرنے کی کوشش کریں گے۔

ان تمام افراد کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ضرور ملتا ہے کہ اللہ سے تعلق کی مضبوطی نے انہیں صاحب عزیمت بنایا۔ تعلق باللہ کا حاصل یہ ہے کہ انسان کا دل آتشِ عشق سے سلگتا رہتا ہے۔ اسے کسی دوسرے کے اکسانے کی ضرورت نہیں پڑتی، وہ آپ ہی آپ سراپا تحریک ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس نگارخانے میں کیا ہے جس سے دامن بھر لوں بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ یہاں کس چیز کی کمی ہے جسے میں پورا کر دوں؟ ایمان پر عمل کے لیے عمر کی قید ہے نہ مقام کی، تعلیم کی نہ دولت کی نہ سہولت کی۔ یہ تو دل میں پھوٹنے والا وہ جذبہ ہے جو سنگلاخ زمینوں میں سے بھی اپنی نمود کی راہ نکال لیتا ہے۔ اور جو اللہ سے قریب ہو جائے وہ اس کے بندوں سے بھی قریب ہو جاتا ہے۔ ایمان کی خوشبو مومن کو سراپا الفت بنا دیتی ہے۔ محبت کی شیرینی دلوں کو جوڑنے والی شے ہے جس کے بغیر داعی دعوت کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

اس کتاب کی تکمیل پر سب سے پہلے ہم اللہ رب العالمین کے شکر گزار ہیں جس نے مقصد زندگی کا شعور عطا کیا اور ایک ایسی تحریک سے وابستہ کیا جو اس کی رضا کے لیے اس کی راہ کی جدو جہد میں مصروف ہے۔ جس نے سوچنا، سمجھنا، قلم پکڑنا اور لکھنا سکھایا اور ہمیں اس کام کے قابل بنایا۔ اس کے بعد ہم اپنی قیّمہ ڈاکٹر رخسانہ جبیں صاحبہ کی مشکور ہیں جنہوں نے اس کام میں ہر طرح کی معاونت فرمائی اور اپنے مشوروں سے رہنمائی فرماتی رہیں۔ ان تمام افراد کے

شکر گزار ہیں جن سے اس کتاب کے مواد کو جمع کرنے کے لیے مدد لی گئی اور جنہوں نے انتہائی خوشدلی سے اپنا تعاون فراہم کیا۔ ان افراد کے بھی شکر گزار ہیں جو اس کتاب کی اشاعت کے بارے میں پوچھتے رہے جس کے باعث ہم اپنے اس کام میں مستعد رہ سکے۔

ہم نائب امیر جماعت اسلامی حافظ محمد ادریس صاحب کے بھی بہت مشکور ہیں، جنہوں نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا اور اس کتاب کے معیار میں اضافے کے لیے اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا۔

ہم نگراں تصنیف و تالیف کمیٹی محترمہ عافیہ سرور صاحبہ کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اس کتاب کے مواد پر نظر ثانی کی اور اس کی بہتری میں مدد دی۔ ہم محترمہ صائمہ اسماء (مدیرہ بتول)، محترمہ حمیرا قریشی (سابق مدیرہ صفحہ خواتین، روزنامہ جسارت)، محترمہ افشاں نوید (کالم نگار) کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اس کتاب کے فنّی محاسن کی بہتری کے لیے مشورے دیے۔ ہم اپنی کمیٹی کے اراکین محترمہ عاصمہ غنی، محترمہ سمیحہ راحیل قاضی، محترمہ کلثوم رانجھا اور محترمہ کوثر پروین کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنے تفویض کردہ کاموں کو احسن انداز میں انجام دیا۔ ہم اپنی کمیٹی کی نگران محترمہ تسنیم معظم کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے ہر صورت میں اپنی رہنمائی اور تعاون ہمیں فراہم کیا۔ ہم سابقہ نگران کمیٹی محترمہ صبیحہ شاہد کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اس کام کی بنیاد رکھنے میں مدد فراہم کی۔ ہم محترمہ عائشہ منور صاحبہ (سابقہ قیّمہ حلقہ خواتین) اور محترمہ امت الرقیب صاحبہ (سابقہ نائب قیّمہ حلقہ خواتین) کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے اس کتاب کا مکمل مطالعہ کیا اور اس کے متن کی تصدیق کی اور اپنی آراء سے اس کی بہتری میں مدد دی۔ ہم محترم محمود عالم صدیقی صاحب کے تعاون کے بھی شکر گزار ہیں اور محترم اسامہ مراد صاحب کے تعاون کے بھی جنہوں نے اس کتاب پر حتمی نظر ثانی کی اور زبان و بیان اور متن کی صحت کی بہتری میں ہماری مدد فرمائی۔ راقمہ حروف اپنے شوہر محترم اور بچّوں کی بھی بہت مشکور ہے جن کے وقت میں سے بہت سارا وقت اس کام کے لیے لیا اور جنہوں نے اس میں بھرپور تعاون کیا۔

یہ کام مکمل نہیں ہوسکتا تھا جب تک راقمہ حروف کو معاون بہنوں عالیہ شمیم صاحبہ، مہر افشاں

صاحبہ اور فریحہ مبارک صاحبہ کا ہمہ وقتی تعاون حاصل نہ ہوتا۔ ان کی بھرپور محنت اور لگن کے ساتھ اس کام میں مصروف رہنے کے سبب اس کتاب کی تکمیل ممکن ہوسکی۔

اس کتاب کے قارئین سے درخواست ہے کہ چونکہ اس کتاب کا مقصد دعوت حق کے تقاضوں سے آشنائی اور ان پر عمل کی لگن پیدا کرنا ہے لہٰذا یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب یہ پیغام آگے ہی آگے بڑھتا جائے اور دیئے سے دیئے جلتے جائیں۔ یہ کام تب ہی ممکن ہے جب قاری محض خود اس کتاب کو پڑھ کر نہ رہ جائیں بلکہ اسے آگے بڑھانے کی بھی کوشش کریں اور دوسری درخواست یہ کہ اگر اس کتاب نے آپ کے ایمان میں اضافہ کیا ہے، جذبوں کو بڑھایا ہے اور نیکیوں کی نئی راہیں سجھائی ہیں تو اپنی دعاؤں میں اس ٹیم کو ضرور یاد کر لیجیے گا جس نے یہ کتاب آپ تک پہنچانے کی جدوجہد کی۔

اپنی آراء سے 'المحصنات منصورہ ملتان روڈ لاہور کے پتے پر یا nazimajiw@gmail.com پر ضرور نوازیے گا، تاکہ آپ کی آراء سے آئندہ اس کام کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔

یہ ہے خدا کی مشیّت کہ ہر زمانے میں
جہاں میں جادۂ حق کو بہم رہے کچھ لوگ
زوالِ جرأت و کردار کے زمانے میں
پیامِ شاہ اُممؐ کا بھرم رہے کچھ لوگ

والسلام

روبینہ فرید
نگران تدوینِ تاریخ جماعت کمیٹی
حلقہ خواتین جماعت اسلامی پاکستان

3456

& *

y

&

حمیدہ بیگم

۱۹۱۵ء تا ۱۹۷۳ء

)

ہر چیز خدا کا عطیہ ہے!

ذرا سوچیے کہ اگر شکل، عقل، مال اور خاندان کا انتخاب اور اختیار انسان کے بس میں ہوتا تو کون ہوتا جو خوبصورت بننے کے بجائے بدصورت بننا پسند کرتا ہے؟ عقل مند اور دوراندیش بننے کے بجائے کم عقل اور کوتاہ اندیش بننے کو ترجیح دیتا؟ صاحبِ مال اور صاحبِ حیثیت بننے کی بجائے مفلس و قلاش بننا گوارا کرتا؟ ظاہر ہے یہ سب باتیں انسان کے اپنے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں، جس کو جو نعمت بھی ملی ہے محض خدا کا فضل ہے۔ پھر ان قدرتی امتیازات اور تقسیمِ خداوندی کی بنا پر انسانوں کا ایک دوسرے پر فخر و غرور کیسا اور اپنے سے کم تر لوگوں سے نفرت وحقارت کیسی؟ مال و دولت، صحت، علم اور عقل کی طرح نیکی اور اخلاق بھی خدا کی دین ہے، جسے چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کم۔ اگر مال اور جمال کی بنا پر فخر و غرور ناپسندیدہ ہے اور اگر علم اور عقل کی بنا پر تکبّر مذموم ہے تو اپنے اخلاق اور نیکی کی بنا پر دوسروں سے نفرت اور حقارت اس سے بھی بڑھ کر مذموم اور قابلِ نفرت ہے۔ آیئے ہم سب اپنے اپنے خاندان اور محلّے میں اصلی نیکی کو رواج دیں۔ جو اپنے سے جتنا کم تر نظر آئے اس کے ساتھ اتنی ہی زیادہ محبت اور ہمدردی ہو اور اس کی اتنی ہی زیادہ بے لوث خدمت کی جائے۔

(حمیدہ بیگم کی ایک یادگار تحریر)

یہ شادی کا گھر تھا۔ گھر میں دلہن آنے کی خبر پا کر سب عزیز رشتہ دار اور اہل محلّہ دلہن سے ملنے آ رہے تھے۔ دلہن خود بڑے تپاک اور محبت سے ہر ایک سے مل رہی تھی ۔ جب کئی خواتین جمع ہوگئیں تو دلہن نے ایک عجیب فرمائش کی ۔'' قرآن مجید تو ہوگا، ذرا لے آیئے۔ وقت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اللہ کی کتاب پڑھی جائے۔'' ایک خاتون قرآن لے آئیں اور دلہن نے درس دینا شروع کر دیا۔ مردانہ کمرے میں درس کی آواز پہنچی تو دولہا مسکرائے اور بولے ''لو بھئی انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا''۔ دولہا صاحب اندر آئے تو انہوں نے دلہن کو پہلی مرتبہ اس طرح دیکھا کہ ایک باوقار خاتون ایک بڑے سے دوپٹے میں لپٹی ہوئی ماتھے تک پلّو لپیٹے قرآن کا درس دے رہی تھیں اور ان کے چہرے پر ایک طمانیت اور نور چھایا ہوا تھا اور آنکھوں سے اپنے مقصد کی لگن روشنی بن کر پھوٹ رہی تھی۔

ابتدائی تعارف:

یہ دلہن جماعت اسلامی حلقہ خواتین کی پہلی قیّمہ ''آپا حمیدہ بیگم'' تھیں جو سرتاپا مجسّم تحریک تھیں۔ وہ ان نایاب لوگوں میں سے تھیں جو مخالف ماحول اور غالب نظامِ زندگی کے پُرزور دھارے کے خلاف ایک اعلیٰ نصب العین قبول کر کے زمانے کا رخ تبدیل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور زندگی کی آخری سانس تک اپنے نصب العین کو نبھاتے رہتے ہیں۔ آپا حمیدہ بیگم کی پیدائش ۱۹۱۵ء میں گوجرانوالہ میں ہوئی۔ جنجوعہ راجپوت گھرانے سے تعلّق تھا۔ پیدائش کے کچھ عرصے بعد والدہ نے خواب میں دیکھا کہ کسی صاحب نے آ کر بچّی کا پیٹ چاک کر دیا اور اس کا قیمہ بنا کر عوام میں تقسیم کر دیا۔ ماں نے متفکر ہو کر کسی بزرگ سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے اطمینان دلایا اور کہا کہ ''یہ بچّی علمِ دین میں مہارت حاصل کرے گی اور لوگوں کو اس سے بہرہ مند کرے گی''۔ اس بشارت اور بیٹی کی اطاعت گزاری اور نیکیوں کے باعث والدین کو ان سے شدید لگاؤ تھا۔

جماعت سے وابستگی:

آپا حمیدہ بیگم کو تعلیم سے دلی وابستگی تھی۔ اس زمانے میں انہوں نے بی اے۔ بی ٹی کی سند

امتیاز کے ساتھ حاصل کی اور اپنے شہر کے ہائی اسکول میں معلّمہ کے فرائض سرانجام دینے لگیں۔ انگلش معلّمہ کی حیثیت سے پڑھاتیں۔ رضاکارانہ طور پر دینیات بھی پڑھاتیں اور طالبات کی اصلاح کی کوشش بھی کرتیں۔ ابتدائی عمر سے سادگی پر کاربند تھیں۔ اسکول میں سادگی کے فروغ کے لیے طالبات و اساتذہ میں یونیفارم کو رواج دیا۔ بچپن میں ان کو گلے کی ٹی بی ہوگئی تھی جس کے باعث طبیعت میں نازک مزاجی پیدا ہوگئی تھی۔ والدین نے انہیں ہر طرح کے کاموں سے دور رکھا اور وہ تدریس کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ دینی علوم بھی علماء کرام سے حاصل کرتی رہیں۔ اسی عرصے میں انہیں ''ترجمان القرآن'' کے مطالعے کا موقع ملا جو ان کے دینی خیالات کی گہرائی کا باعث بنا۔ ترجمان القرآن کی مدد سے دیگر تحریکی لٹریچر بھی حاصل کیا اور بھائی کے پاس خانیوال جا کر مکمل یکسوئی سے تمام لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ نے ان کے سامنے فریضہ اقامت دین اور اسلامی اجتماعیت کی اہمیت کو بالکل عیاں کر دیا۔ اس وقت کے جذبات و احساسات کو وہ خود اس طرح بیان کرتی ہیں کہ ''رکنیت اختیار کرنے سے پہلے میں ایک ماہ تک ہر رات جاگ کر یہ سوچتی رہتی کہ میرے شریکِ جماعت ہونے سے جماعت کو کیا فائدہ ہوگا؟ اپنی معذوریاں، کمزوریاں سامنے آ کر پیچھے دھکیلتیں، دل نے کہا کہ 'جماعت کا بھلا ہو یا نہ ہو، تم خود تو روزِ قیامت سرخرو ہوسکو گی'۔ یہ سوچ کر میں نے رکنیت کی درخواست دے دی۔''

قیّمہ حلقہ خواتین کی ذمہ داری:

اب تک محض چند خواتین ہی رکنِ جماعت بنیں تھیں اور ان کا رابطہ براہِ راست مردانہ نظم سے رہتا تھا جس کی تحریری ہدایات کے مطابق وہ اپنے کام انجام دیتی تھیں۔ جب آپا حمیدہ بیگم کی درخواست رکنیت امیر جماعت سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ تک پہنچی تو آپ نے ان کی درخواست سے ان کے جوہر قابل کا اندازہ لگا لیا اور قیادت کے قابل پہلی خاتون کے دستیاب ہوتے ہی ان کی رکنیت کی درخواست منظور کرتے ہوئے خواتین کے نظام کو مردوں سے الگ کر کے انہیں حلقہ خواتین کی پہلی قیّمہ مقرر کر دیا۔ یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ کہاں تو آپ رکنیت کی درخواست دینے میں اس کی ذمّہ داریوں سے لرزاں و ترساں تھیں اور کہاں رکنیت کے ساتھ ساتھ آپ کو خواتین کی قیادت کی ذمّہ داری بھی سپرد کر دی گئی۔ یقیناً آپ کے لیے کٹھن مرحلہ رہا ہوگا جسے

آپ نے اطاعتِ نظم اور اللہ کے بھروسے پر قبول کیا اور اس کے تقاضوں کو نبھانے کے لیے سوچ بچار میں لگ گئیں۔ ابھی پاکستان نہیں بنا تھا، حالات کشیدہ تھے، دور دراز فاصلوں پر جماعت کے افراد پہاڑی پر چراغ کی مانند جھلملاتے تھے۔ ان ہی کے گھروں کی چند خواتین بھی اس قافلے میں شریک ہو چکی تھیں لیکن وہ سب آپس میں ایک دوسرے سے ناآشنا تھیں۔

حلقہ خواتین کی تنظیم سازی:

آپا حمیدہ بیگم نے سب سے پہلے ان چند خواتین کو منظّم کرنے کی منصوبہ بندی کی اور تحریر کو اس کا ذریعہ بنایا۔ ابھی تعلقات استوار ہو ہی رہے تھے کہ قیامِ پاکستان کا مرحلہ درپیش ہوا۔ جماعت اسلامی ہند اور پاکستان الگ الگ ہو گئے اور پاکستان منتقل ہونے والی خواتین سے آپ نے دوبارہ رابطے بحال کیے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے مقام پر درسِ قرآن و حدیث، تقسیم لٹریچر اور خدمتِ خلق کے ذریعے جماعت اسلامی کی دعوت کو پھیلانا شروع کیا ''محبت فاتح عالم'' کا نسخہ لیے جب آپ خواتین سے اللہ اور اس کے دین کی بات کرتیں تو وہ ان کے دل تک رسائی پا لیتیں۔ لوگوں کے دل وا ہوتے تو ان کے گھروں کے دروازے بھی کھلنے لگتے۔ یوں درسِ قرآن کا سلسلہ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے گھر تک پھیلتا جاتا۔ دعوت سے آشنائی اختیار کرنے والی خواتین کو آپس میں جوڑنے کے لیے آپا حمیدہ بیگم وقتاً فوقتاً انھیں اپنے گھر میں جمع کرتیں اور ان سب کے ساتھ مل کر سوچا کرتیں کہ اب دین کی دعوت کو کس طرح آگے بڑھایا جائے؟ اس طرح ایک ایک کر کے انھوں نے انسانی معاشرے میں سے حق کی طلب اور اسے پھیلانے کی آرزو رکھنے والے ہیرے اکٹھے کیے اور انھیں مقصد کی لگن میں یکسو کر دیا۔ دور دراز کی خواتین جب ایک دفعہ آپ سے مل کر واپس اپنے شہروں میں چلی جاتیں تو آپ ان سے مضبوط تحریری تعلّق باندھے رکھتیں۔ تفصیلی خطوط کا تبادلہ ہوتا جس میں گھر والوں سے لے کر آس پڑوس اور اس سے باہر کی دنیا سب کا تذکرہ ہوتا اور سب میں دین کو پھیلانے کی تدابیر سوچی جاتیں۔ چار سال کی مستقل محنت کے بعد حلقہ خواتین منظّم شکل اختیار کر گیا اور جب خواتین کا اجتماع ۱۹۴۸ء میں منعقد ہوا تو قیّمہ حلقہ خواتین کے لیے باقاعدہ استصواب کرایا گیا۔ تمام خواتین نے آپا حمیدہ بیگم ہی کو اس ذمّہ داری کے لیے چنا اور آپ اس

کے بعد ۱۹۷۳ء میں انتقال کے وقت تک اس فریضے کو انجام دیتی رہیں۔

جب تک صحت ٹھیک رہی خوب بھاگ دوڑ کی، ہر روز ملاقاتوں کے لیے جاتیں، شہروں کے دورے بھی ہوتے، ہمراہ کوئی کارکن، بھانجا یا بھتیجا ہوتا۔ تنہا کبھی شہر میں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ جاتیں۔ گھر میں کوئی نہ ہوتا تو کام کرنے والی مائیوں میں سے کسی کو ساتھ لے لیتیں۔ ہر صورت واپسی سورج ڈوبنے سے پہلے کرتیں۔ کہتیں کہ ''ہماری خیر اسی میں ہے کہ ہر کام کرتے وقت خدا کی پسند کو ملحوظ رکھیں''۔ اپنے پاس چند کتابیں ضرور رکھتیں۔ ملاقات کے بعد مؤثر انداز میں کتب بینی پر اکسا کر کتاب پڑھنے کے لیے دیتیں۔ ۱۹۵۴ء تک انھوں نے حلقہ خواتین کی ۵۳ سے زائد شاخیں قائم کر دیں۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں کراچی کا پچیس روزہ دورہ کیا پھر ۱۹۵۷ء کے اوائل میں گجرات، راولپنڈی، فیصل آباد اور گوجرانوالہ کا دورہ کیا اور کام کو آگے بڑھانے اور جمانے کی کوششیں کیں۔

انھوں نے تحریک کی دعوت کو اپنے اندر پوری طرح جذب کیا تھا، تبلیغ کے تقاضوں کو خوب سمجھتی تھیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ نو باتوں والی حدیث کو نمونہ بنا کر دعوت دین کا آغاز کرنا چاہیے۔ ایک مطبوعہ پیغام میں اُنھوں نے بہنوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''اس وقت ہر حلقے میں کام کچھ اس انداز میں ہونا چاہیے کہ ملک کے ہر طبقے میں دعوت پہنچ جائے۔ ہماری بات چیت کا موضوع اللہ، رسول ﷺ اور جنت و دوزخ ہونا چاہیے، ذکر آخرت جس قدر زیادہ ہوگا، کام اُتنا ہی ان شاء اللہ زیادہ مؤثر ہوگا۔ ہماری کارکن بہنیں جہاں بھی قیام پذیر ہیں، اُن کو کم از کم دس دس گھر آگے پیچھے دائیں بائیں کی خواتین سے نہ صرف شخصاً واقف ہونا چاہیے بلکہ اُن کے دکھ سکھ میں شریک رہنا چاہیے، اس لیے نہیں کہ کل کو ہمیں چند ووٹ مل جائیں بلکہ اس لیے کہ ہمسائیوں کے بہت زیادہ حقوق ہیں اور اُن کی ادائیگی کے لیے پہلا قدم اُن سے تعارف ہے''۔

وہ چاہتی تھیں کہ عورتیں اپنے گھروں کو ایسی درسگاہوں میں بدل دیں جن میں اسلامی سانچوں میں ڈھلے ہوئے انسان تیار ہو سکیں۔ انہوں نے ہفتہ وار اجتماعات کا نظام قائم کیا۔ زکوٰۃ فنڈ قائم کیا، جس سے مستحق خواتین کی مدد کی جاتی تھی۔ درسِ قرآن کے لیے جن مقامات کا تعین کیا جاتا وہاں باقاعدگی کے ساتھ جاتیں۔ موسم خواہ کتنا ہی شدید ہو اور طبیعت خواہ کتنی ہی خراب ہو، باقاعدگی

سے جا کر درس دیا کرتیں۔ حاضرین کی تعداد کو کبھی اہمیت نہ دیتیں۔ ایک دو عورتوں کی موجودگی میں بھی اسی جذبے سے درس دیا کرتیں۔ کوئی نہ آتا تو گھر والوں کو بٹھا کر درس دیتیں۔ کارکن کے ساتھ ملاقاتوں کے لیے جانا ہوتا تو اس کے گھر پہنچ کر گھر کے کاموں برتن مانجھنے، سبزی بنانے، بچّوں کو تیار کرنے میں ان کی مدد کراتیں تاکہ کارکن سکون سے وقت نکال کر چل سکے۔ جس گھر میں جاتیں، اس گھر کی ہر خاتون سے ملاقات کرتیں۔ ان کی دوستی ساس، بہو، نند، بھاوج، ماں، بیٹی ہر ایک سے ہوتی۔ ہر فرد کو اس کی قدر و قیمت کا احساس دلاتیں اور محبت کے والہانہ اظہار سے اپنی دوستی کے بندھن میں باندھ لیتیں۔ مشن کی تکمیل کے لیے ہر ذریعہ کو اپناتیں۔

ان کی کارکردگی رپورٹ کو ۱۹۴۷ء میں قیّم جماعت اسلامی میاں طفیل محمد صاحب نے جماعت اسلامی ہند کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے سامعین کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا جس کے مطابق وہ سارا ماہ بیمار رہنے کے باعث کم ہی کام کر سکیں۔ ان کاموں میں پڑوسن خواتین کو قرآن پڑھانا، ان کے لڑکے کو انگلش کی ٹیوشن پڑھانا، ان کے گھر کے مردوں کے لیے دینی کتب بھجوانا، دو ہندو پڑوسنوں کے بچّوں کی پڑھائی میں مدد کرنا، والدہ کو تفہیم القرآن سنانا، مسجد میں کتب بھجوا کر امام مسجد سے اس میں سے خطبہ دینے کی درخواست بھجوانا، اپنی ایک استانی دوست کو کتب پڑھوانا، ایک اور خاتون کو کتاب ''پردہ'' مشکل الفاظ کے معنی تحریر کر کے بھجوانا شامل ہیں۔ خلوص سے کیے گئے کاموں کا اثر یہ ہوا کہ دین سے دور گھرانے درست تصورِ دین کے ساتھ نماز اور روزوں کی پابندی کرنے لگے اور دیگر کتب بھی مطالعہ کے لیے طلب کرنے لگے۔

مردم شناسی:

بلا کی مردم شناس تھیں۔ سامنے والے کے حالات، مزاج اور قابلیت کا جائزہ لے کر اس کے مطابق اسے کام کا میدان سونپتیں اور ساتھ ساتھ پوری رہنمائی دیتیں۔ نیر بانو صاحبہ گواہی دیتی ہیں کہ ان کی نگاہ بڑی تیز اور جوہر شناس تھی۔ جس میں انہیں لکھنے کا سلیقہ دکھائی دیا، اسے لکھنے کی طرف مائل کیا، جس میں پڑھنے کا شوق پایا، اسے پڑھنے کی طرف لگا دیا، جس میں تقریر کی خوبی محسوس کی، اس کی اس صلاحیت کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ یہ ساری تگ و دو اس لیے کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے کارکن تیار ہوں۔ وہ ماہر کاریگر کی طرح خام مال کو خوبصورت

اور کارآمد سانچوں میں ڈھالنے کے لیے دن رات ایک کر رہی تھیں۔ یہی بات بیگم مولانا مودودی نے کہی کہ وہ اس قدر دلنشین انداز میں ترغیب دیتی تھیں کہ انکار کی گنجائش نہ رہتی۔ میں نے ان کے اصرار کرنے اور اکسانے پر بولنا شروع کیا، میری ٹوٹی پھوٹی تقریر کی بڑی تعریف اور ہمت افزائی کی یہاں تک کہ جھجک جاتی رہی، اعتماد پیدا ہو گیا اور میں آسانی سے بولنے لگی۔

رسالہ ''بتول'' کا اجرا

ابتدا ہی میں ایک ایسے رسالے کی ضرورت محسوس ہوئی جسے خواتین تک اپنا پیغام پہنچانے اور ان میں فکری تبدیلی پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جا سکے لیکن سوال سرمائے کا تھا کہ وہ کہاں سے آئے گا۔ اس وقت آپا حمیدہ بیگم نے بڑے جذبے سے کہا ''اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کر دیا جائے، سرمائے کا انتظام وہ خود کرے گا جس کی خاطر ہم یہ کام شروع کرنے لگے ہیں البتہ کام کی ابتدا کرتے ہوئے سوچ لیجیے کہ کسی کو نام و نمود کی خواہش نہ ہو، ہر تحریر صرف رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر چھپے گی''۔ لہٰذا پہلے ''عفّت'' اور پھر ''بتول'' کے نام سے رسالہ جاری کیا گیا جو الحمدُ للہ چمن بتول کے نام سے ابھی تک جاری ہے۔ بعد میں کسی نے پرچے کی اشاعت میں اضافہ اور اخراجات پورے کرنے کے لیے مشورہ دیا کہ کسی مشہور ادیبہ کے افسانے اس میں شامل کر دیے جائیں، اس پر انہوں نے ناراضی سے کہا ''ہم اس وقت خسارے میں ہوں گی جب خرچ پورا کرنے کی خاطر معیاری اخلاق سے کمتر مواد پیش کریں گی۔ میں ایسی کوئی چیز اپنی زندگی میں نہ آنے دوں گی، اگرچہ ایک بھی پرچہ نہ فروخت ہو۔ یاد رکھیے، جس روز مادّی فائدہ اخلاقی فائدے سے آگے آیا، پرچے میں خیر و برکت ختم ہو جائے گی، ان کا کہنا تھا کہ ''خدا کی رضا اور حدود کو مدنظر رکھو، اسی میں بھلائی ہے، تم اخلاقی چیزیں پیش کرو، لوگ خود بخود دلچسپی محسوس کریں گے''۔

وہ خود ایک صاحبِ طرز ادیبہ تھیں، اسلوبِ نگارش سادہ، برجستہ، منفرد، شگفتہ اور دلنشیں تھا، انھوں نے معاشرے کی اصلاح میں مددگار ایسے پہلوؤں پر توجّہ دلائی جو عموماً نظروں سے اوجھل رہتے ہیں، ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے سادہ جملے اتنے دلنشین ہوتے کہ آنکھوں کے راستے سیدھے دل میں اتر جاتے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں ''اصل میں سارا سلیقہ ہم تھوڑی دیر کے لیے غیروں کو دکھاتے ہیں، اپنے گھر میں دکھانے کی عادت ہو جائے تو ہماری

آدھی سے زیادہ مشکلات حل ہو جائیں‘‘۔ایک اور جگہ لکھا ’’حقوق ادا کرنے کے سلسلے میں یہ کوئی شرط نہیں کہ جس کے حقوق ادا کرنا ہمارے ذمّہ ہوں، وہ لازماً نیک اور محبت کرنے والا ہو، یہ تو قرض کی مانند ہے جس کے لیے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جس کا قرض دینا ہے وہ نیک ہے یا بد، بلکہ یہ سوچا جاتا ہے کہ جتنی جلد ہو اس کا قرض اتار دیا جائے۔ ماں باپ، ساس سسر، بیٹا بہو، بیٹی، داماد کے ذمّے ایک قرض ہے جو ضرور ادا ہونا چاہیئے‘‘۔ادارہ ’’بتول‘‘ سے از حد لگاؤ تھا۔ وہ ادارہ کی منیجر بھی تھیں، مدیرہ بھی، کلرک بھی، اکاؤنٹنٹ بھی۔ سارا دن چار چار کام کرتیں اور ساتھ ساتھ یہ تسلّی بھی دیتی جاتیں کہ مجھے تو کام نے بالکل تندرست کر دیا ہے۔کام جتنا زیادہ ہے اتنا ہی میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتی ہوں‘‘۔اس میں لکھنے والیوں کی انتہائی حوصلہ افزائی بھی کرتیں اور قدر دانی بھی لیکن ساتھ ہی ساتھ ان پر یہ بھی واضح کرتیں کہ ’’مجھے ’عفّت‘ بے حد عزیز ہے اور چاہتی ہوں کہ یہ عمدہ سے عمدہ شعر و ادب پیش کرے۔ لیکن مجھے اس سے زیادہ بہت زیادہ اس میں لکھنے والیاں، ان کی زندگی، ان کی دنیا، اور ان کی عقبیٰ عزیز ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ ’عفّت‘ کی خاطر کارکنوں کی زندگی میں کوئی بے اعتدالی آئے۔اس وقت مجھے حلقہ خواتین کی طرف سے دو جہاد بڑے اہم دکھائی دیتے ہیں، ایک تو گھریلو زندگی اختیار کرنے پر رضامند ہو جانا، دوسرے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے پوری طرح تیار ہو جانا۔ علمی و ادبی کام اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن بنیادی نہیں۔ بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ ہمارا اصل مالک ہم سے کیا چاہتا ہے کہ ہم کیسی زندگی گزاریں؟‘‘

پُرامیدی:

ہر حال میں پُرامید رہتیں۔۱۹۷۰ء کے الیکشن میں جماعت اسلامی کی ناکامی پر تمام کارکنان رنجیدہ تھے۔آپ نے سب کو امید دلاتے ہوئے کہا کہ ’’ہماری ہر کوشش کا اجر اللہ تعالیٰ ضرور دیں گے۔آئندہ الیکشن میں ہم اور زیادہ کام کریں گے ان شاءاللہ کامیاب ہوں گے‘‘۔سقوطِ ڈھاکا کے بعد شکستہ دلوں میں امید کا جادو جگا کر زندہ رہنے کی لگن پیدا کی۔’’ہمارا اصل مقصد قرآنی تعلیمات کو فروغ دینا ہے جب تک زندہ رہیں گے، اپنا کام جاری رکھیں گے‘‘۔

انتخابات میں شکست کھانے کے بعد اگلے ہی روز نئے پرانے کارکنان کے ہاں ہمت

بڑھانے اور نئے ڈالے ہوئے بیجوں کی آبیاری کے لیے چل دیتیں۔

عائلی زندگی:

یہ اللہ کی مشیّت تھی کہ اس نے ایک ایسی تحریک کے لیے جسے آگے چل کر پاکستانی خواتین کی سب سے بڑی جماعت بننا تھا اور جس کے وابستگان کو پوری دنیا میں اس مشن کو پھیلانا تھا، ایک ایسی خاتون کا انتخاب کیا جو ذاتی صحت اور مادّی اسباب و وسائل دونوں سے تہی داماں تھی۔شاید بعد میں آنے والی اس تحریک میں شامل ہونے والی خواتین کو یہ نمونہ فراہم کرنا مطلوب تھا کہ مقصد دل میں اتر جائے تو ہر حال اور ہر کیفیت میں قدم آگے بڑھائے جا سکتے ہیں اور پیغامِ حق پھیلایا جا سکتا ہے۔بچپن میں ٹی بی ہونے کے باعث حمیدہ آپا کمزور صحت کی حامل تھیں، اسی وجہ سے شادی کر کے گھریلو ذمّہ داری اٹھانے سے بھی گریزاں تھیں لیکن جب جماعت اسلامی میں شامل ہونے کے بعد لوگوں نے ان کے سامنے نکاح کے سنّت ہونے کو واضح کیا اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی تو اتباعِ سنّت کے جذبے سے آپ نکاح کے لیے راضی ہو گئیں۔سیالکوٹ کے رکنِ جماعت قاضی حمیداللہ صاحب سے آپ کی شادی قرار پائی۔ قاضی صاحب کی دوسری شادی تھی اور ان کا ایک چودہ سالہ بیٹا بھی تھا۔شادی کے کچھ ہی دن بعد قاضی صاحب بیمار ہو گئے اور بیماری طول پکڑتی گئی یہاں تک کہ نومبر ۱۹۵۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔اس طرح شادی کے محض دو سال بعد آپ بیوہ ہو گئیں اور واپس والدین کے گھر آ گئیں۔

معمولاتِ روز و شب:

روزانہ کا معمول تھا کہ تہجد کے بعد نمازِ فجر سے فارغ ہو کر قرآن پاک کی تلاوت کرتیں پھر چار نفل ادا کرتیں، دو نفل پچھلے دن کے بخیریت گزر جانے پر اور دو نفل آج بہتر دن گزرنے کی نیت سے۔ پھر ناشتے کے بعد تحریری کام ہوتا جس میں ایک طرف رسالہ ’’بتول‘‘ کے لیے اداریہ، آئینہ، راہِ منزل تحریر کیا جاتا، پروف پڑھ کر تصحیح کی جاتی، دوسری طرف کارکنوں اور عزیزوں کے خطوط کے جوابات دیے جاتے، سرکلر لکھے جاتے، دس بجے تک تحریری کاموں سے فارغ ہوتیں اور ترجمہ قرآن کی کلاس کا آغاز ہوتا۔ جو بارہ بجے تک ختم ہوتی، پھر آنے والی خواتین سے ملاقاتیں، ایک بجے تازہ وضو کرتیں، کھانا اور نماز ظہر کے بعد اتباعِ سنّت میں لیٹ جاتیں، تین بجے کے

قریب پھر دوسری کلاس شروع کر دیتیں یا اگر اجتماع کا دن ہوتا تو اجتماع میں چلی جاتیں۔ ملاقاتوں کے لیے اسکولوں، کالجوں اور پڑوس محلّہ کی پڑھی لکھی خواتین تک جا پہنچتیں۔

سیرت وکردار:

مادّی لحاظ سے آپ کا تمام مال واسباب تین چار سوتی جوڑوں، دو تین چادروں اور چند تولیوں پر مشتمل تھا جنھیں آپ کی وصیت کے مطابق بیت المال میں دے دیا گیا لیکن روحانی لحاظ سے آپ بے حد مالا مال تھیں۔ آپ کے پاس محبت تھی، حیا تھی، للّٰہیت اور بے غرضی تھی، خود اعتمادی تھی، انسان دوستی تھی، خوئے دلنوازی تھی، استقامت تھی، سخاوت تھی، اور ساتھ ہی ساتھ اخلاص، توکّل، عزم، حوصلہ، وقار، صبر، شکر اور خوفِ خدا وفکرِ آخرت نے ان کی شخصیت میں انتہا درجے کی دلآویزی پیدا کر دی تھی۔ جواُن سے ایک بار مل لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ حلقہ خواتین کی پہلی قیّمہ ہونے کے ناطے انہیں اس تحریک کی بنیادیں رکھنے کا عمل سرانجام دینا ہے، اس لیے انہوں نے قریب آنے والی ہر خاتون کو محبت کی چاشنی سے اپنے ساتھ جوڑ لیا اور قرآن وحدیث کا پیغام اس کے دل میں اتار کے گویا بنیاد میں ایک اینٹ کا اضافہ کر دیا۔ ان کی گفتگو، ان کی جستجو، ان کی خلوت، ان کی جلوت، ان کی تمام بزم آرائیاں صرف اس لیے تھیں کہ ان کے آقا کا دین غالب آجائے، باطل مٹ جائے، سرکارِ دوعالمؐ کا ذکر ہر زبان پر جاری ہو جائے، مسلمان قعرِ مزلّت سے نکل کر دنیا میں اللہ کے عطا کردہ منصب کے شایانِ شان ہو جائیں۔ یہ جذبہ ان کے کمزور سے مادّی وجود میں طاقتور روح پھونک دیتا تھا۔ دوسرا فرد خود کتنا ہی سرد کیوں نہ ہو، ان کی محبت کی گرمی اس میں بھی سرائیت کر جاتی تھی اور وہ ہر دل میں ایک چنگاری سلگا دیتی تھیں۔

حدود اللہ کی انتہائی حفاظت کرنے والی تھیں۔ دل کے شدید مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود انہوں نے سردی گرمی میں موٹا لباس استعمال کیا۔ شدید گرمی کے سفر میں بھی منہ سے نقاب نہیں الٹا۔ ہاتھوں میں کھلائے ہوئے بچّے جب بڑے ہوئے تو ان سے بھی مکمل پردہ کیا۔

انہوں نے نہ کبھی بری زبان استعمال کی، نہ کسی کو برائی سے یاد کیا، نہ کسی کا مذاق اُڑایا۔ نہ کسی کی نقل اتاری۔ کہتی تھیں کہ ''ہمیں چاہیے کہ لوگوں کی بھلائیوں کا ذکر کرتے رہیں اور برائیاں

نظر انداز کرتے رہیں'' کبھی اگر کسی کو ڈانٹ دیتیں تو فوراً ہی احساس ہونے پر اس سے معافی مانگ لیتیں، خواہ بچّہ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر کسی کے متعلق ناراضی کا خدشہ ہوتا تو بہت ہی پیار اور خوشامد کے ساتھ اسے مناتیں اس کی ناراضی دور کرنے کے لیے نفل نمازوں کی منّت مانگ لیتیں۔

انتہائی سادگی سے زندگی گزاری۔ لباس وخوراک سادہ ہوتی تھی ایک وقت میں تین یا چار جوڑوں سے زیادہ کپڑے نہیں رکھتی تھیں، وہ بھی سوتی اور معمولی ہوتے۔ صفائی کا بہت اہتمام کرتیں۔ انتہا درجے کی سخی تھیں۔ ہمیشہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتی تھیں۔ کبھی سائل کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیا۔ چپکے چپکے لوگوں کے قرضے اتارتیں۔ تحائف سے ان کی مدد کرتیں۔ مختلف قسم کی نذریں روز مانتیں جس کے پیسے روزانہ بیت المال میں ڈالے جاتے۔ ایک مرتبہ بیماری کی حالت میں ایک کارکن بہت تلاش کر کے ان کے لیے کینو لے کر آئیں۔ دیکھ کر کہا ''بہت دن سے دل چاہ رہا تھا کینو کھانے کا۔ اچھا ہوا آپ لے آئیں''۔ پھر اسے چھیل کر قاشیں تمام شرکا میں تقسیم کرنے لگیں۔ کارکن نے کہا۔ ہمیں تو اس کی خاص ضرورت نہیں یہ تو خاص آپ کے لیے ہے۔ تو کہا ''خاص چیز ہی دینے کا تو فائدہ ہے''۔

محبت فاتح عالم:

کوئی آپ سے ملنے آتا تو بے حد خوش ہوتیں۔ ایسے جملے بولتیں کہ آنے والا خوش ہو جاتا۔ کہتیں ''میں آپ کو بے حد یاد کر رہی تھی خدا کا شکر ہے کہ آج آپ نے میری یہ آرزو پوری کر دی''۔ بڑے اصرار کے ساتھ کھلاتی پلاتیں۔ اپنی ہر چیز اچار مرّبے، پھل یہاں تک کہ وٹامن کی گولیاں بھی بانٹ کر کھاتیں، ہر خاتون یہ سمجھتیں کہ مجھے ہی سب سے زیادہ چاہتی ہیں۔ کارکن کی الجھنیں اور پریشانیاں دور کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں ہر ایک سے فرداً فرداً ان کے گھر کی عافیت، بچّے بچّے کا حال پوچھتیں کارکن کی ہر بات یاد رکھتیں۔ خوشی میں مبارک باد، غم میں حرفِ تسلّی دینے والوں میں سب سے آگے ہوتیں۔ کارکن اپنی الجھنیں پریشانیاں بیان کرنے میں زیادہ وقت لینے پر کبھی شرمندہ ہوتے تو انہیں تسلّی دیتیں کہ کوئی بات نہیں ''میرا سارا وقت آپ ہی کے لیے ہے''۔ دور رہنے والوں کو بھی مفصّل حالات تحریر کرنے کی ہدایت تھی۔ کسی کارکن نے صرف تحریکی کاموں سے متعلق خط لکھ کر بھیج دیا تو اس پر ناراض ہوئیں۔ ''یہ کیا؟ صرف

قانونی خط؟ میں اس خط کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ مجھے گھر کے ایک ایک بچّے کا حال لکھیں''۔

صبر واستقامت:

ضرورت سے زائد بات نہیں کرتی تھیں، ملنے ملانے کے بعد آنے والوں کو کسی کتاب کے سنانے پر لگا دیتیں۔ خطبات، تنقیحات، تفہیم القرآن ساتھ ہی رکھتیں۔ ملنے کے بعد لیٹ جاتیں اور آنے والی بہن سے کہتیں۔ ''اس کتاب سے کچھ پڑھ کر سناؤ۔ ذرا دل کو طاقت ملے''۔ اپنی بیماری سے متعلق کبھی کسی کو بات نہ کرنے دیتیں۔ کوئی پوچھتا آپا جی کیا حال ہے؟ مسکرا کر کہتیں ''اللہ کا شکر ہے۔ میں تو اتنی صحت مند ہوگئی ہوں کہ پہلے کبھی ایسی نہ تھی یہ جو دوائی اب کہ ڈاکٹروں نے تجویز کی ہے اس نے بڑی جلدی شفا دے دی۔ میں بڑی طاقت محسوس کرتی ہوں''۔ حالانکہ دیکھنے والے دیکھتے کہ رنگ زرد ہے، بات کرتے ہوئے سانس پھولنے لگتی ہے۔ کروٹ بڑی مشکل سے لے پا رہی ہیں لیکن طویل بیماری کو آپ نے صبر وتحمّل سے گزارا۔ نہ کبھی کسی نے جھنجلاہٹ دیکھی نہ کوئی شکوہ۔ ہر حال میں زبان سے الحمدُ لِلّٰہ ہی نکلا۔ عزم وجذبے میں کبھی بال برابر فرق نہ آیا۔ ہر دورے کے بعد پہلے سے زیادہ کام کرتیں کہ پتا نہیں مہلتِ عمل کتنی باقی رہ گئی ہو۔ کوئی زیادہ آپ کی بیماری کا تذکرہ کرتا تو کہتیں ''الحمدُ لِلّٰہ میں ٹھیک ہوں۔ ہزاروں سے بہتر ہوں۔ محتاج نہیں ہوں۔ چل پھر سکتی ہوں اٹھ بیٹھ سکتی ہوں، آنکھیں اور زبان ٹھیک ہیں، دماغ درست حالت میں ہے اور بھی کتنی نعمتیں ہیں کس کس کا ذکر کروں۔ میرے پاس تو الفاظ ہی نہیں ہیں۔ جو ملا ہے اس کا حق ہی ادا نہیں کر سکتی تو جو کمی رہ گئی ہے، اس کا رونا رونے سے کیا ہوگا''۔ حالانکہ آپ کی کیفیت اس بیماری کے باعث یہ ہوگئی تھی کہ بقول آپ کے ''کہ میں روز رات کو مرتی ہوں اور صبح کو زندہ ہو جاتی ہوں''۔ اس جنگ میں نماز، تسبیح، دعائیں اور درود شریف ان کا ہتھیار رہتے۔ وضو کرنے میں انتہائی مشقّت پیش آتی تھی لیکن ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کرتی تھیں۔ انسانوں کی قدر دان تھیں۔ بھائی بھاوجوں اور خاندان کی بہنوں کی تعریفیں کرتے زبان نہ تھکتی تھی، ''میرے اوپر سب عزیز جان چھڑکتے ہیں اللہ نے میرے لیے کیسی آسانیاں پیدا کر دی ہیں''۔ محض دو سال وہ شادی شدہ رہیں لیکن سسرال والوں کو بھی محبت سے اسیر کر لیا۔ ان کے سوتیلے بیٹے کو لوگوں نے سوتیلی ماؤں کے متعلّق غلط خیالات کا شکار کر دیا تھا۔

اُس نے ضد باندھ لی ہر بات میں ان کی نفی کرتا۔ لیکن اس کی چھوٹی سی خوبی کو بھی بہت بڑھا کر بیان کرتیں اسلم بڑا 'ذہین اور سمجھ دار لڑکا ہے، بڑا نیک اور تابعدار ہے'۔ یہاں تک کہ وہ بھی ان کا گرویدہ ہوگیا۔ بعد میں بھی اس سے رابطہ برقرار رکھا۔ پوتے پوتیوں سے حسنِ سلوک جاری رہا۔ ملازمین کے ساتھ بھی بہت حسنِ سلوک کرتیں۔ وقتاً فوقتاً پیسے دیتی رہتیں۔ ان کے بچّوں کے کپڑے بنواتیں۔ کھانا تیّار ہو جاتا تو کمزوری کے باوجود خود چولھے کے پاس آتیں۔ ہنڈیا میں سے بہترین سالن نکال کر ملازمہ اور اس کے بچّوں کو دیتیں پھر خود کھاتیں۔

شوقِ مطالعہ:

تحریکی کام کے لیے مطالعہ کو شرطِ اوّل قرار دیتیں۔ کہتی تھیں کہ تحریک میں شمولیت سے پہلے میں نے سارے لٹریچر کو اس طرح پڑھا تھا ''گویا اس کا بہت بڑا امتحان دینا ہے''۔ ایک دفعہ کچھ کارکن آپ سے ملاقات میں کہنے لگے کہ ہمارے دل میں اپنے مقصد کے لیے حقیقی لگن اور جذبہ موجود نہیں۔ فرمایا اس کو پیدا کرنے کا ذریعہ یہی ہے کہ دین کا پورا مطالعہ کیا جائے کیونکہ جب تک اسلام کا حسن ہم پر آشکارا نہ ہو اس کی خاطر کام کرنے کا عشق کیسے پیدا ہوتا ہے؟ مطالعہ ہمارے کام میں پیٹرول کی حیثیت رکھتا ہے اور بغیر پیٹرول کے گاڑی چلانے کی کوشش کا انجام کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پورے جماعتی لٹریچر کا اس طرح مطالعہ کریں جیسے روزکھاتی یاسوتی ہیں۔ کوئی ایسا شخص کس طرح فوج کا کپتان ہوسکتا ہے جس نے باقاعدہ فوجی ٹریننگ دو یا تین سال سے زیادہ نہ لی ہو۔

توکل علی اللہ:

توکّل علی اللہ انتہا درجہ کا تھا۔ توسیع دعوت کے لیے جب بھی کوئی منصوبہ بنایا جاتا اور کارکنان اخراجات کے لیے متفکّر ہوتے تو فرماتیں ''کام کو آسان کرنا اور راہیں پیدا کرنا، مال و اسباب عطا کرنا اس کا کام ہے۔ ہمارا کام صرف ارادہ کرنا تدبیر سوچنا ہے۔ باقی کام اس کا اپنا ہے، وہ خود پورا کر لے گا، ہمیں کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ پورا کرا بھی دیتا۔

خدا خوفی:

ان کے عظمتِ کردار کی بنیاد ان کی خدا خوفی میں پوشیدہ تھی۔ فکرِ آخرت اور خوفِ خدا کا مجسّمہ تھیں۔ درس کے دوران جب احوالِ آخرت کی آیات تلاوت ہوتیں تو ان کے چہرے کی

خشیت دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے کردیتی، ہروقت گناہوں کے خیال سے لرزتی رہتیں۔ ہرایک سے اپنے حق میں دعا کرنے کو کہتیں۔ایک مرتبہ بیگم مودودی نے ان سے دریافت کیا کہ'' آپ مولانا کے مسجد والے درس میں کیوں تشریف نہیں لاتیں؟'' اس پر حمیدہ آپا نے عاجزی سے کہا کہ'' آپا جان، میں وہاں نہیں آسکتی''۔انہوں نے دریافت کیا کہ آپ کو کوئی ایسی بیماری تو نہیں کہ آپ کا مسجد میں آنا منع ہو تو فرمایا کہ''میں اپنے آپ کو اللہ کے گھر میں داخل ہونے کے قابل نہیں سمجھتی''۔اور آنسو ٹپک پڑے۔ جب ۱۹۶۵ء کی جنگ جاری تھی تو کارکنان کو اس وقت کرنے کے کام بتانے کے بعد خوشی سے کہنے لگیں'' مجھے خوشی تو اس بات کی ہے کہ حساب کتاب نہیں ہوگا''۔یعنی اگر جہاد کے لیے مصروف رہتے ہوئے موت آ گئی تو شہادت نصیب ہوگی اور حساب کتاب نہیں رہے گا۔خود کو بہت گناہ گار سمجھتیں۔آپا جی زبیدہ بلوچ سے آخری بات یہی کہی کہ'' آپا جی۔میں کس طرح اپنی کوتاہیوں کی تلافی کروں؟''

شوقِ عبادت:

ان کی ڈائری سے علم ہوا کہ فرض نمازوں، تہجّد اور اشراق کے علاوہ روزانہ چودہ نفل نذر کے بھی روز پڑھا کرتی تھیں۔اس میں تیرہ سال پہلے دل کا دورہ پڑنے کے بعد صحتیابی کے شکرانہ کے نوافل، مولانا مودودی کے کامیاب آپریشن کے نوافل اور دیگر اعزا و اقربا کی صحت و عافیت سے متعلق نوافل شامل تھے۔عمر کے آخر میں جب طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی اور کچھ عرصہ وہ یہ نفل نہ پڑھ سکیں تو صحتیابی کے بعد ان گزرے ہوئے دنوں کے بھی نوافل ادا کیے۔

خرابیٔ صحت:

والدین ضعیف تھے، والدہ فالج کا شکار تھیں۔تین سال ان کی خدمت کی۔والدین کے انتقال کے بعد شادی شدہ بھائیوں اور بھابیوں کے ساتھ زندگی گزاری۔دسمبر ۱۹۵۸ء میں انہیں دل کا پہلا دورہ پڑا۔۱۹۶۲ء میں دل کا آپریشن ہوا جس کے باعث سینے میں ایسا زخم ہوگیا جس سے موت کے وقت تک خون اور پیپ نکلتی رہتی تھی۔دل کی بیماری کے بعد ۱۹۶۰ء سے پیٹ میں پانی جمع ہونا شروع ہوگیا۔جب زیادہ پانی جمع ہوجاتا تو اسے نکلوانا پڑتا۔اسی بیماری کے باعث آپ تین چار منٹ سے زیادہ بیٹھ نہیں سکتی تھیں اور دو تین منٹ بیٹھنے کے بعد لیٹ جاتی تھیں۔آپ کا زندگی میں چوبیس

مرتبہ آپریشن کر کے پانی نکالا گیا۔

آخر عمر میں پیٹ میں جلدی جلدی پانی بھرنے لگا۔۱۹۷۳ء میں ابتدا سے آخر تک پانچ مرتبہ پیٹ سے پانی نکالا گیا۔کمر سے پاؤں تک ورم آ گیا۔پنڈلیاں پتھر کی مانند ہوگئی تھیں۔ رات رات بھر وضو کرتیں اور نفلیں پڑھتیں۔لیٹا نہ جاتا تھا۔آگے تکیہ رکھ کر اس سے آگے گردن بڑھا کر سر کو پلنگ سے نیچے لٹکائے رہتیں جس سے چہرہ اور آنکھیں سوج جاتیں۔اس حالت میں بھی''بتول'' پڑھوا کر سنتیں۔اگست کے شمارے کا''حرفِ اوّل'' بھی خود لکھا۔

اور شمع گل ہوگئی:

بیماری کا ذکر کرنے والوں سے ناراض ہوتیں۔کہتیں کہ''اس فضول گوئی سے کیا حاصل؟ وہی وقت قرآن کی تلاوت میں کیوں نہ گزارا جائے''۔خواہش تھی کہ جمعہ کے دن میری وفات ہو۔جمعرات کے دن درسِ قرآن بھی خود دیا۔اللہ تعالیٰ نے جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب میں اپنے پاس بلا لیا۔ستمبر ۱۹۷۳ء بمطابق ۱۴ شعبان آپ کا انتقال ہوا۔۴ شعبان کو ان کی ڈائری میں رمضان کی یہ پلاننگ تحریری طور پر موجود تھی۔(۱)'عبادت' اور 'روزہ' کے پمفلٹس زیادہ سے زیادہ تعداد میں پھیلانا۔(۲)درسِ قرآن زیادہ سے زیادہ مقامات پر رکھنا۔ (۳)اپنے بچّوں اور اہلِ خانہ پر دینی تعلیم کے سلسلے میں بہت توجّہ دینا۔سوائے رب ذوالجلال کی ذات کے ہر شے فانی ہے۔آپا حمیدہ بیگم بھی اس دنیائے فانی سے دوسری ہمیشہ رہنے والی دنیا کی طرف کوچ کر گئیں لیکن اپنی زندگی سے آنے والوں کو نصب العین سے عشق، عزم و حوصلہ اور استقامت کا سبق دے گئیں۔ان کی رحلت کے بعد کسی نے انہیں سونے کے تخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔کسی کو انہوں نے بتایا کہ''اللہ نے نیک بندوں سے جو وعدے کیے ہیں وہ سب اس نے پورے کر دیے''۔کسی سے کہا کہ''یہاں ہزار بلبوں سے بھی زیادہ روشنی ہے''۔بے شک وہ ایسی زندگی گزار کر گئیں تھیں جو رب کی مرضی سے ہم آہنگ تھی۔

اللھم اغفر لھا وارحمھا واد خلھا فی جنّت الفردوس

ماخذات

۱۔ آپا حمیدہ بیگم۔۔۔از: فروغ احمد ۲۔ اوصاف حمیدہ۔۔۔از۔۔ڈاکٹر عبدالغنی فاروق
۳۔ بتول۔۔۔حمیدہ بیگم نمبر، فروری، مارچ ۱۹۷۴ء

اُمِ زبیر

۱۹۱۸ء تا ۱۹۹۸ء

نومبر ۱۹۶۳ء میں کل پاکستان اجتماع منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا، اس وقت کی حکومت نے سرتوڑ کوشش کی کہ یہ اجتماع منعقد نہ ہو سکے مگر جماعت نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اجتماع ہر حالت میں منعقد کرنا ہے۔ خواتین کی قیام گاہ میں تین سو خواتین کے قیام کا انتظام تھا۔ خواتین کیمپ کی انچارج راقمہ کو بنایا گیا۔ گیارہ بجے صبح سے خواتین کی آمد شروع ہوگئی۔ رات ہوتے ہوتے پانچ سو خواتین پہنچ چکی تھیں۔ دیہاتوں سے تانگوں اور بسوں کا سفر کر کے قافلے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ رات کے دو بج گئے۔ صبح نو بجے میں نے بھائی صاحب کو کہلا بھیجا کہ ناشتہ بھیج دیں، لیکن باہر تو ایک ہنگامہ بپا تھا، ناشتہ کہاں سے آتا؟ بھائی صاحب نے کیمپ کا چکر لگایا تو میں نے کہا، واہ بھائی صاحب، آپ کا انتظام؟ ہم ابھی تک چائے کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا، ''تم ناشتے چائے کا کہہ رہی ہو، باہر گولیاں چل رہی ہیں، تم گھبرانا نہیں اور نہ ابھی کسی کو بتانا''۔ باہر سے اندر کیمپ میں جوتے اور بوتلیں آ کر پڑیں جو خواتین نے اٹھا کر باہر پھینک دیں کہ نہ جانے کون شرارت کر رہا ہے؟ دو طنابیں کاٹ دی گئیں۔ اپنے کارکن دوڑ کر آئے، خواتین کا پورا کیمپ گھیرے میں لے لیا گیا، ہم نے کسی کو نہیں بتایا کہ باہر ہنگامہ ہو رہا ہے لیکن شہر سے جلسے کے لیے آنے والی جوق در جوق خواتین نے آتے ہی بتایا کہ ''باہر گولیاں چل رہی ہیں، مکتبے سے کتابیں اٹھا اٹھا کر پھینکی جا رہی ہیں، تفہیم القرآن کی جلدیں پھاڑ دی گئی ہیں، پولیس کے ٹرک کھڑے ہیں''۔ یہ ساری باتیں عورتوں نے سُن لیں، لیکن خوف و ہراس کسی کے چہرے پر نہیں تھا جو خواتین جلسہ گاہ میں بیٹھی تھیں وہیں بیٹھی رہیں''۔

''تحریکِ اسلامی میں شعبۂ خواتین'' (حصہ اول) از: اُمِ زبیر

۱۹۷۷ء کی ''نظامِ مصطفیٰ تحریک'' ملک بھر میں عروج پر تھی۔ ہر جگہ جلسے اور جلوس منعقد ہو رہے تھے۔ جماعت اسلامی ہر سرگرمی میں پیش پیش تھی۔ جہاں اس میں شامل مرد و جواں ہر قربانی کا عزم لیے نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کے لیے محوِ جہاد تھے، وہیں اس کی خواتین کارکنان بھی اس جدّ و جہد میں ان کے ہمراہ تھیں۔ حلقہ خواتین کی قیادت اس وقت امّ زبیر صاحبہ کے کاندھوں پر تھی۔ انہوں نے اسلام آباد تا کراچی خواتین میں جدّ وجہد کی ایک تازہ روح پھونک دی تھی۔ حضرت خدیجہؓ، حضرت سمیہؓ، حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابیات کے اُسوہ کو اس طرح ذہن نشین کرا دیا تھا کہ ہر کارکن خاتون شریعت کے نفاذ کے لیے ملک میں موجود آمر حکمرانوں سے جنگ کے لیے تیار تھی۔ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی اپنے جلسے منعقد کر رہی تھیں اور جہاں جہاں قیادت طے کرتی وہاں خواتین کے جلوس بھی نکالے جا رہے تھے۔ خواتین قیادت پہلی صف میں کھڑے ہو کر آنسو گیس اور سامنے تنی رائفلوں کا سامنا کرتی۔ لاٹھی چارج ہوتا تو زخموں کے باوجود حوصلوں کو مزید مہمیز ملتی۔ ایسے ہی ماحول میں امّ زبیر اسلام آباد کا دورہ کرنے کے بعد کراچی واپس پہنچیں تو اپنے استقبال کے لیے پولیس کو موجود پایا۔ انھیں ان کی ساتھی بلقیس صوفی صاحبہ سمیت حراست میں لے لیا گیا اور یوں نبی ﷺ کی محبت میں سرشار اس مجاہدہ کو حراست کی آزمائش بھی سہنی پڑی۔ چند دن زیرِ تفتیش رکھ کر رہا کر دیا گیا لیکن نہ تو ولولوں میں کمی آئی نہ رفتار تھمی بلکہ اسی تیزی کے ساتھ سفر جاری رہا اس پارہ صفت خاتون مجاہدہ کی زیرِ قیادت خواتین کا قافلہ آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ آپ کا تعلّق جماعت اسلامی خواتین کے اس ہراول دستے سے تھا جس نے اپنا خونِ جگر دے کر سنگلاخ زمینوں میں رستہ بنا دیا تھا۔

ابتدائی تعارف:

بچپن ہی سے اُم زبیر نے اپنے گھرانے میں اسلام کے رنگ کو غالب دیکھا۔ پانچویں تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور پھر تیرہ سال سے کچھ ہی اوپر تھیں کہ ماموں کے گھر بیاہ کر چلی گئیں۔ طبیعت میں شوخی و تیزی تھی۔ مطالعہ کا شوق تھا۔ ''تہذیبِ نسواں'' اور دیگر رسائل

کوشش کر کے حاصل کرتیں۔ آہستہ آہستہ مطالعہ کا ذوق بڑھتا گیا۔ کلام اقبال بھی پڑھنا شروع کیا اور اپنے شوہر سے دسویں تک کی انگریزی زبان بھی پڑھی۔ پھر میاں صاحب نے ہی انھیں ''خطبات'' مطالعہ کے لیے دی جس نے ان کی فکر کو ایک واضح سمت دی۔ مقصدِ زندگی سمجھ میں آیا تو سب سے پہلے اپنے خاندان والوں تک اس کو پہنچانے کی کوشش شروع کر دی۔ کتابیں پڑھ کر سناتی جاتیں اور فرائض کا شعور دیا جاتا۔ پھر دل نے اس سے زیادہ کا تقاضا کیا تو اپنے گھر واقع شیرانوالہ گیٹ میں جماعت اسلامی سے خواتین کو متعارف کرانے کے لیے ایک اجتماع رکھ لیا۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں بدھ کے دن اپنی رشتہ دار بہنوں اور ان خواتین کو جن کے شوہر یا باپ جماعت کے کارکن تھے مدعو کیا گیا۔ خطبات کے ایک مضمون کو پڑھ کر خواتین کے ساتھ تبادلہ خیال کیا گیا اور پھر سب کی رائے سے اس سلسلہ کو ہفتہ وار جاری رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ اس طرح آپ کی کاوشوں کی بدولت لاہور میں حلقہ خواتین کا پہلا حلقہ قائم ہو گیا۔

تحریکی سفر کا آغاز:

کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ قیامِ پاکستان کا مرحلہ عمل میں آیا۔ حالات کے مدّ و جزر اعتدال پر آئے تو فروری ۱۹۴۸ء میں حلقہ خواتین کا پہلا اجتماع عام مولانا مودودیؒ کے گھر پر ہوا جس میں مولانا نے خواتین کو اپنی الگ حیثیت سے منظّم کرنے اور اپنے درمیان سے قیّمہ مقرر کرنے کی ہدایت کی۔ اس اجتماع کے ایک ہفتہ بعد ہی امّ زبیر صاحبہ نے اپنی درخواست رکنیت قیّم جماعت کے نام ان الفاظ میں ارسال کر دی کہ ''اگرچہ کہ کام بہت مشکل ہے مگر چونکہ جماعت اسلامی کا نصب العین اسلامی نظام کو قائم کرنا ہے۔ اس لیے خدا کی تائید و نصرت کے بھروسے اور اس کی عطا کردہ استعداد کے ساتھ صرف اور صرف اپنے اللہ کو راضی کرنے کی خاطر جماعت میں شامل ہونا چاہتی ہوں''۔ دوسرے ہی ہفتے مرکز جماعت سے رکنیت کی منظوری کی اطلاع آئی اور ہدایت کی گئی کہ ''آپ اپنے قریبی اجتماع کارکنان میں حلف شہادت پڑھ کر باقاعدہ داخل ہو جائیں اور جماعت کی رکن کی حیثیت سے ساری ذمہ داری اٹھا لیں۔ اس خط کے تیسرے دن اجتماع میں رکنیت کا حلف اٹھا لیا اور اسی لمحہ اپنے ہر غم کو اس آفاقی غم میں سمو دیا کہ

اللہ کی زمین پر اللہ کا حکم نافذ کرنا ہے، اللہ کے بندوں کو اللہ کے پیغام کی طرف بلانا ہے اور ہر صورت باطل پر غالب کرنا ہے۔

جس ماحول اور حالات میں آپ نے کام کا آغاز کیا، وہ آسان نہ تھا۔ قوم پاکستان کے قیام کو ہی منزلِ مراد سمجھ کر انفرادی مسائل میں گم تھی۔ ایک محدود دائرے میں مذہبیت اپنا کر دنیاوی معاملات میں اپنی مرضی سے زندگی بسر کر کے دین اور دنیا، دونوں کو ساتھ چلانے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ عورتیں اپنے ہر عمل کا ذمّہ دار مردوں کو سمجھ کر محض گھر اور گھر داری کو مقصد زندگی قرار دیتی تھیں۔ تبلیغ دین اور اقامت دین کی اصطلاحات اجنبی سمجھی جاتی تھیں۔ حکمرانوں کی ریشہ دوانیاں، سوچنے والے اذہان پر سیفٹی ایکٹ کے پہرے، صوبائی اور گروہی تعصّبات، بڑھتی ہوئی بے پردگی اور بے حیائی اور معاشرے کو اسلامی تشخص کے بجائے سیکولر سمت لے جانے کے منصوبے۔ یہ وہ ماحول تھا جہاں سے ام زبیر نے ہمّت وحوصلہ، چاہتوں اور ولولہ سے اس کام کا آغاز کیا تو پھر کہیں رکنے کا نام نہ لیا۔ جب ایک دفعہ کمر کس لی تو پھر ان کی کمر بستگی کو بڑھتی ہوئی عمر بھی کم نہ کر سکی۔ سیدھی، چست، ہشاش بشاش اور پرعزم۔

شب و روز دین کے لیے وقف:

۱۹۴۵ء سے ۱۹۹۸ء پچاس سال سے زائد آپ کے شب و روز اسی نصب العین کے گرد گھومتے رہے۔ آپ نے عہد رکنیت کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا تھا کہ پھر مقصد اور زندگی یک جان ہو گئی تھی۔ پھر اس کے بعد ان کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا ملنا ملانا، محبت نفرت، دنوں کی تپش اور شبوں کا گداز، سب کا سب اسلامی انقلاب کی چاہ میں ڈھل گیا تھا۔ وہ چند میں سے ایک تھیں مگر سیکڑوں پر بھاری تھیں۔ ان کے جسم میں لہو نہیں پارہ دوڑتا تھا۔ ایک ایک لمحے سے مقصد کی شرابِ طہور کشید کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ''وقت کم ہے اور میرے لیے کام بہت زیادہ''۔ لہٰذا وقت کی رفتار سے چلیں گے تو منزل ملے گی۔ وقت ان کے سامنے خادم کی طرح ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور وہ اس سے دل بھر کر کام لیتی تھیں اور جو کام لوگ ہفتوں اور مہینوں میں کرتے تھے وہ گھنٹوں اور دنوں میں مکمل کر لیتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کام تو کرنا ہے اور ہمیں ہی کرنا ہے، کوئی اور تو آ کر کرنے سے رہا۔ جیسے ہی خیال آئے کام فوراً کر ڈالو تو سب کچھ ہو جاتا

ہے، سوچنے بیٹھ جائیں تو پھر نہیں ہوتا۔ خود اپنے لیے بھی یہی طریقہ اپنایا۔ جلدی منصوبہ بندی کرنا اور کام ختم کر کے ہی دم لینا۔ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے تو برقعہ پہنا اور باہر نکل گئیں۔ بچّے کہتے: ٹھہریں ہم آپ کے لیے سواری لے آئیں تو کہتیں'' تمہارا انتظار تو میرے کام کو بہت دیر کر دے گا''۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۴ء تک حمیدہ بیگم صاحبہ کے ساتھ پنجاب کے شہروں میں کام کو پھیلانے کے بعد آپ ۱۹۵۴ء میں کراچی آ گئیں۔ شوہر ہمسفر اور دم ساز تھے۔ آپ کا تعلق ایک متوسّط گھرانے سے تھا، جہاں گھر داری کے تمام امور نمٹانے کے ساتھ ساتھ ہی اقامت دین کا معرکہ سر کرنا تھا۔ ان دونوں امتحانات میں پورا اترنے کے لیے آپ نے روحانی طاقت کو جسمانی طاقت میں اس طرح سمویا کہ تیز رفتاری آپ کی پہچان بن گئی۔ ایک وقت میں دو دو تین تین کام ایک ساتھ کرتیں، ہاتھ کاموں میں، ذہن سوچنے میں اور زبان ذکر میں مصروف۔ ایک چولھے پہ ہانڈی بھون رہی ہیں، ایک پر روٹی پکا رہی ہیں۔ ساتھ ہی کپڑے دھل رہے ہیں۔ کچن میں قلم اور کاغذ بھی رکھے ہیں۔ جہاں کوئی اچھا جملہ ذہن میں آیا لکھ ڈالا۔ کوئی بہن ملنے آ گئیں تو اسے ساتھ ہی کچن میں لے گئیں۔ اب اس کے ساتھ کام کے منصوبے بن رہے ہیں۔ کوئی کام بگڑتے نہیں دیکھا۔ ہر کام بہترین ہوتا تھا۔ رکنا، تھمنا، سستانا یا کاہلی کرنا ناممکن تھا۔ سیمابی صفات تھیں۔ لپکنے، پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ گھر کے تمام کاموں کے ساتھ افسانہ نگاری، درس و تدریس، دعوتی ملاقاتیں، بچّوں کی پرورش، رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی بغیر کسی شکوے شکایات اور پیشانی پر بل ڈالے کرتی تھیں۔ ان کا معمول تھا کہ نمازِ فجر کے بعد سب کو ناشتہ کرا کے کھانے کی تیاری شروع کر دیتیں۔ ساتھ ساتھ کپڑے دھل رہے ہوتے، سوکھے کپڑے تہہ کر کے تکیے کے نیچے رکھتیں تاکہ استری کی ضرورت نہ رہے۔ کام ختم ہوا تو پڑوس میں ملاقاتوں کے لیے چلی گئیں، کتابیں دیں، گھر آ کر فون کیے، مضامین لکھنے بیٹھ گئیں۔ بیچ بیچ میں حفظ قرآن، نوافل، مطالعہ لٹریچر جاری رہتا۔ تازہ اخبارات و رسائل کا مطالعہ بھی ضرور ہوتا اور جس خبر کے لحاظ سے ضرورت ہوتی بروقت حکومتی سطح تک اپنا نقطۂ نظر پہنچاتیں۔ ہر وقت باوضو رہتیں اور ذرا سا وقت ملتے ہی دو نفل ادا کر لیتیں۔ خاندان کی

بڑی بیٹی اور بہو ہونے کے ناطے سارے تعلقات اور فرائض نبھائے۔

ہر ایک کی خوشی وغمی میں سب سے پہلے شریک ہونے والوں میں سے تھیں۔ اپنی بچّیوں کی شادی کے سارے کام خود کیے۔ ایک دن کسی بہن کو بتایا کہ آج میں نے کئی سوٹ سیئے ہیں۔ خریداری سے لے کر سلائی اور گوٹہ کناری سے لے کر بنائی تک ہر کام خود کیا۔ اون اور سلائیاں ہر وقت ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ کسی نشست میں بیٹھی ہیں اور ساتھ ساتھ بُنائی بھی جاری ہے۔ ایک نشست میں ایک ٹوپا بن لیتیں یا سوئیٹر کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا۔ جب کبھی طبیعت خراب ہوتی اور ڈاکٹر آرام کا کہتے تو کہتیں ''مجھے آرام کا مت کہا کریں۔ مجھ سے لیٹا نہیں جاتا''۔

پُرجوش قیادت:

۱۹۷۳ء میں محترمہ حمیدہ بیگم کے انتقال کے بعد آپ کو قیّمہ مقرر کیا گیا۔ آپا حمیدہ بیگم کا دور دعوت کا دور تھا۔ دعوت پھیلائی جاتی اور جس مقام پر چند ہم خیال بہنیں کام کے لیے تیار ہو جاتیں، ان میں سے کسی ایک کو ناظمہ بنا کر کام اس کے سپرد کر دیا جاتا۔ خطوط اور سرکلرز کے ذریعہ تحریری رابطہ رکھا جاتا اور حسب حال ہدایات دی جاتیں۔ امّ زبیر صاحبہ نے دعوتی پھیلاؤ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ خواتین کو مجتمع کر کے تربیت کرنے اور بہتر قیادت تیار کرنے کی بھی کوشش شروع کی۔ خواتین ارکان و کارکنان کے مرکزی اجتماعات لاہور میں رکھے گئے جہاں ایک طرف نصب العین اور اس کے تقاضوں کو سمجھایا جاتا تو دوسری طرف مقصد کے حصول کی خاطر حکمتِ عملی پر بحث کی جاتی اور کام کے طریقوں کو مفصل طریقے سے سمجھایا جاتا ان کو اللہ نے صلاحیت دی تھی کہ جہاں وہ کام کو وسعت کے ساتھ دیکھتیں اور اس کی منصوبہ بندی کرتیں، وہیں ایک ایک باریکی پر بھی نظر رکھتیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہر کام کا تحریری ریکارڈ بھی مرتب کرتی جاتیں۔ اب تک پنجاب و سندھ میں حلقہ خواتین کا کام شروع ہو چکا تھا۔ ان کے دور میں بلوچستان میں بھی کام کی ابتدا کی گئی۔ کام سیکھنے کے لیے صوبوں کے کئی کئی روزہ دورے کیے جاتے اور ہر کام میں شریک رہ کر نئے افراد کو کام سکھایا جاتا۔

قلمی جہاد:

اب تک تحریکی بہنوں کی قلمی کاوشیں صرف ادب کے میدان میں زیادہ نمایاں تھیں۔ ان کے دور میں نشر و اشاعت کے کام کو بھی منظّم کیا گیا اور ذرائع ابلاغ میں حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر پھیلانے کی کوشش اور ابلاغ کے ذرائع کی غلط امور پر گرفت کی جاتی۔ منتخب موضوعات پر مراسلات و مضامین لکھے جاتے اور قومی اخبارات و رسائل کو بھجوائے جاتے۔ ساتھ ہی ساتھ ادبی محاذ کو بھی مضبوط کرنے کی کوشش جاری رہیں۔ حریم ادب کا کنونشن آپ ہی کے دور میں کراچی میں منعقد ہوا جس میں پڑھے جانے والے مقالات کو مجلّہ ''نوریہ'' کی شکل میں شائع بھی کیا گیا۔

جسم و جان کی ہر قوت و صلاحیت کو نصب العین کی خاطر وقف کرنے کے عزم نے انھیں قلم پکڑنے پر آمادہ کیا۔ خلوص کے ساتھ کیے گئے، اس کام کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت ڈالی کہ پھر مضامین، افسانے، تبصرے، تنقید، مقالے، انشائیہ، مزاح اور شاعری ساری ہی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ جیسے ہی کوئی خیال ذہن میں آیا باتیں کرتے کرتے دو تین صفحات ساتھ ساتھ لکھ ڈالے۔ ''دیکھو نا۔ اب یہ خاکہ محفوظ ہو گیا ہے۔ جب وقت ملے گا اسے پھیلا لوں گی''۔ قائد تحریک اسلامی مولانا مودودیؒ کی یہ ہدایت ہمیشہ پیش نظر رہی کہ ''ہماری ان خواتین کو جنہیں اللہ نے لکھنے کی صلاحیت عطا کی ہے لازماً ان لوگوں کا توڑ کرنا پڑے گا جو شعر و ادب کے راستے عورتوں میں بداخلاقی پھیلا رہے ہیں، اللہ اور رسولؐ پر اعتقاد اور آخرت پر یقین متزلزل کر رہے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اگر اسی طاقت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ پر اعتقاد اور عقیدہ آخرت کو پیش نہ کریں تو یہ نئی نسل جو فحاشی میں مبتلا ہو رہی ہے اسے کیسے سنبھالا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ کام بہت احتیاط کا طالب ہے اور یہاں آنے والوں کو خود پھسلنے سے بچنے کی پوری احتیاط کرنی ہوگی''۔

بگاڑ کے اس دروازے کو بند کرنے کے لیے خوب لکھا۔ یہاں تک کے آپ کے تحریر کردہ افسانے 'دامِ فریب'، 'حیاتِ نو'، 'الاؤ و پھوار' اور 'پیمانے' کی شکل میں چھپ کر آ گئے۔ انسانی نفسیات کی گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے قلم کو آلودگی کے ہر شائبہ سے بچایا۔ وہ مرد و عورت کے

اختلاف کو ناحنِ تدبیر سے سلجھا کر معاشرہ کو اتفاق ومحبت سے ہمکنار کرنے کی خواہاں تھیں۔ لہٰذا نہ صرف مسائل کی نشاندہی کی بلکہ ان کا حل بھی پیش کیا۔ ان کے افسانوں میں سادگی اور مقصدیت کا ایسا امتزاج ہے جو دلوں کو چھو لیتا ہے۔

جب معاشرے میں نعت گوئی کو مبالغے کی آخری حدوں سے آلودہ ہوتے دیکھا تو عقیدت کو صحیح سمت دینے کے لیے میلا دالنبی کے مجموعہ کو مرتّب کیا، جس میں سیرت النبیؐ کی مستند روایات اور معیاری نعتوں کو شائع کیا گیا۔ دھنک کے نام سے مقالات وافسانوں کے مجموعے مرتّب کیے۔ ''تحریک اسلامی میں شعبہ خواتین'' کے عنوان سے حلقہ خواتین کی ابتدائی تاریخ تحریر کی۔ بچوں کے لیے بھی دینیات (اوّل ودوم جماعتوں کے لیے) اور اذھار الجنۃ کے نام سے منتخب احادیث مع تشریح مرتب کیں۔

نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری کی بھی کوشش کی، گویا ہر پرچہ میں بہترین نمبر لینے کی خواہاں ہوں۔ قلمی کاوشوں کی اتنی وسعت اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ایک پانچویں جماعت پاس خاتون جب عزمِ مصمم کر لے تو ربِّ رحیم اس کی کاوشوں میں کیسی برکت پیدا کر دیتا ہے۔ اپنی زندگی کے حسبِ حال اس شعر کو اکثر دہرایا کرتیں کہ:

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

عزم وہمت:

ہر وہ کام جس کی تاکید آپ کارکنان کو کرتیں سب سے پہلے خود اس کام پر عمل کرتیں۔ دعوت، تربیت، تنظیم، مقالات، تحریر، تقریر، غرض ہر محاذ پر مصروفِ جہاد رہیں۔ وہ رخصت کی نہیں عزیمت کی قائل تھیں۔ ایک مرتبہ کراچی میں خواتین کا ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جس میں آپ کو بھی تقریر کرنی تھی۔ آپ تیز بخار میں مبتلا تھیں لیکن اجتماع میں جانے کے لیے بے قرار تھیں۔ بستر پر بخار سے بے حال لیٹیں اپنی بیٹی سے یہ اصرار کیے جا رہی تھیں کہ مجھے وہاں لے چلو، اس میں تقریر کی ذمہ داری میرے سُپرد کی گئی ہے، میں اس ذمہ داری سے غیر حاضر نہیں رہنا چاہتی۔ بیٹی حیران تھی کہ امی ابھی اسپتال سے چند دن پہلے ٹانگ کا آپریشن کروا کے

آئی ہیں، دانتوں میں تکلیف کے باعث سارے دانت بھی نکالے جا چکے ہیں، تیز بُخار میں مبتلا ہیں، وہاں جا کر کریں گی کیا؟ یہ سوال اُن کے سامنے رکھا تو اُنھوں نے توانا عزم کے ساتھ کہا ''حاضری تو ہو جائے گی، شامل تو ہو جاؤں گی۔ بس مجھے وہاں لے چلو'' اور پھر نہ صرف وہ جلسے میں شریک ہوئیں بلکہ اسٹیج پر پہنچ گئیں اور مائک بھی تھام لیا۔ اپنے عزم کو شرکا تک منتقل کرنے کے لیے آواز کا سہارا لینا چاہا تو پہلے تو دانت نہ ہونے کے باعث محض پھپ پھپ کی آواز ہی نکل سکی لیکن پھر عزم جیت گیا، معذوری ہار گئی اور عزیمت کی شہسوار نے رب کا پیغام رب کی بندیوں کو سُنا ڈالا۔ بعد میں خُوش ہو کر اپنی بیٹی سے کہا کہ ''میرے رب نے تو وعدہ کیا ہے کہ میں اپنے بندے کا ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں، آج اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا کہ میرا رب میرا دانت بھی بن گیا اور مجھ سے تقریر بھی کروالی''۔

اسی طرح ایک مرتبہ طبیعت بہت خراب تھی۔ لاہور میں شوریٰ کا اجلاس ہونا تھا۔ گھر والے اس خبر کو پوشیدہ رکھنا چاہ رہے تھے، لیکن علم میں آتے ہی انھوں نے اجلاس میں جانے کی تیاری شروع کر دی۔ جہاز میں انہیں لاہور لے جایا گیا۔ وہیل چیئر کے ذریعہ جہاز میں بٹھایا اور اتارا گیا جب منصورہ لے جانے کے لیے ٹیکسی لی تو ساتھ ہی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کا ایک طالب علم بھی ساتھ بیٹھا۔ ان کی خراب حالت دیکھ کر اس نے پوچھا۔ آنٹی آپ کو کیا تکلیف ہے؟ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ آنسوؤں کے ساتھ بولیں۔ ہم تو دنیا سے جا رہے ہیں۔ یہ وطن تمہارے حوالے ہے۔ تم اس کے لیے کیا کرو گے؟ مجھے تسلّی دو کہ تم اس کا کتنا خیال رکھو گے؟ لڑکے نے کہا آنٹی آپ پریشان نہ ہوں، تو پھر کہا نہیں میں تسلّی چاہتی ہوں۔ مجھے بتاؤ تم کیا کرو گے؟ پھر بیگ سے نکال کر اسے پمفلٹ دیے۔ پہلے اسے چھوڑا۔ خوب دعائیں دیں اور پھر خود منزل پر اتریں۔

یہ دعوت ہی ان کی زندگی کی اولین ترجیح تھی جس کے لیے وہ کسی عذر کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ ایک مرتبہ کسی جگہ انہیں لیکچر دینے جانا تھا۔ ٹانگ میں فریکچر ہوا تھا۔ جب اس جگہ پہنچیں تو سیڑھیاں تھیں۔ ساتھ والوں نے کہا۔ آپ کیسے چڑھیں گی، معذرت کر لیں۔ کہنے لگیں کوشش کرتی ہوں پھر اپنی مضبوط قوت ارادی، عزم وہمّت اور مقصد سے سچّی لگن کے سہارے

وہ اوپر چڑھ گئیں۔ طویل لیکچر اور سوال و جواب کے بعد وہ نیچے اتر آئیں۔ کینسر کے علاج کے دوران کیموتھراپی کی وجہ سے طبیعت بہت خراب ہوتی۔ بھتیجوں کے ساتھ جاتیں انھوں نے گھر میں ذکر کیا کہ پھپھو کی حالت بہت خراب ہے۔ جب بھاوج ملنے آئیں تو دیکھا کہ وہ بیماری بھلا کر مشین پر بیٹھی ہیں اور گھر کے پردے سی رہی ہیں۔

مقصد کی لگن:

یہ لگن ان کے ریشہ ریشہ میں پیوست تھی۔ ایوب خان کے دور کے الیکشن کے وقت انھیں چٹاگانگ جانا تھا کہ اچانک ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ ڈاکٹر نے بستر سے قدم اتارنا بھی منع کر دیا۔ اس وقت تک صرف ایک بیٹی کی شادی ہوئی تھی۔ دو بیٹیاں جوان موجود تھیں۔ لوگ آ کر دعا کرتے تھے کہ اللہ آپ کو بچیوں کے فرائض نبھانے کے لیے زندگی دے تو ان سے کہتی کہ یہ دعا کرو کہ اللہ مجھے صحت کے سہارے اتنی زندگی دے کہ الیکشن میں میری ذمہ داری جس مقام پر لگی ہے اس کو میں پروگرام کے مطابق جا کر پورا کر آؤں پھر بے شک اللہ مجھے اپنے پاس بلا لے۔ بچیوں کی قطعاً فکر نہیں جس نے انہیں پیدا کیا ہے، وہی ان کا نگہبان ہے۔ مقصد کی یہی لگن انھیں ہر حال میں دعوت پہنچانے کے خیال سے متحرک رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ کلینک گئیں تو انتظار گاہ میں بیٹھنا پڑا۔ نمبر آنے کے انتظار میں انھوں نے بیگ سے اون اور سلائیاں نکال کر بننا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ دائیں بائیں بیٹھی خواتین سے بات چیت شروع ہوگئی۔ بات چیت آگے بڑھی تو بیگ سے پمفلٹ نکال کر انھیں دیے۔ قرآن پڑھنے کی تلقین کی۔ ڈاکٹر سے مل لیں تو پھر اسے بھی کتابیں دیں۔ ''نور'' اور ''بتول'' دیے۔ ڈاکٹر صاحب کا پتا لے لیا کہ آپ کو ''نور'' اور ''بتول'' جاری کروادوں گی۔ ان کی نظر ہمیشہ اپنے فرائض پر رہتی۔ کراچی سے لاہور جاتیں۔ لمحوں میں ناشتہ اور ضروریات سے فارغ ہو کر رشتہ داروں سے ملنے چلی جاتیں۔ کوئی کہتا کہ انھیں آپ سے آ کر ملنا چاہیے۔ آپ کی طبیعت خراب ہے تو کہتیں ''لواب میں ان کے انتظار میں بیٹھی رہوں۔ ہم کوئی فقیر ہیں کہ یوں ہاتھ پھیلا پھیلا کہ اپنا حق مانگیں۔ آپ فرائض پر نظر رکھیں۔ آپ کو دینے والی ذات اوپر ہے، صرف اسی سے مانگیں۔ ہاں دوسرا کوئی ادنیٰ سا بھی خیال کر لیتا تو انتہائی شکر گزار ہوتیں اور قدر دانی کے جذبات کا اظہار کرتیں۔

وقت ان کے نزدیک سب سے قیمتی متاع تھا۔ جس کا ضیاع ناقابل برداشت تھا۔ بار بار سب کو اس نعمت کی قدر کی طرف ابھارتی تھیں۔ کاش تم لوگوں کو احساس ہو جائے کہ ایک ایک لمحہ انسانی تاریخ پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے۔ اللہ نے دماغ کس لیے دیا ہے؟ تم لوگ سوچتے کیوں نہیں؟ کام کے لیے راستے کیوں نہیں نکالتے؟ اللہ کے حضور جوابدہی کا احساس انھیں ہر وقت بے چین رکھتا۔ ہر مشکل، ہر مسئلہ پر ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ'' بلند آواز سے پڑھتیں۔

محبت و غم خواری

مقصد کا عشق انھیں محض اکیلا چلنے کے بجائے دوسروں کو ساتھ ملا کر چلانے پر مجبور کرتا تھا۔ ہر ایک سے جلد دوستی کر لیتی تھیں۔ اس کے گھر اور گھر والوں کے بارے میں تفصیل سے آگہی حاصل کرتیں۔ مناسب مشورے دیتیں۔ حوصلہ افزائی کرتیں اور کام پر لگا دیتیں۔ جس کو جو کام بتاتیں ساتھ ہی اس کے لیے بہت دعائیں کرتیں۔ ان کے ہاں جوش سے زیادہ ہوش تھا۔ دردمندی سے بات کرتیں اور دوسروں کی دل شکستگی سے ڈرتی تھیں۔

سعیدہ احسن لاہور سے کراچی منتقل ہوئیں تو تنہائی سے دلگرفتہ ہو کر انھیں مختصر سے خط کے ساتھ اپنا پتا لکھ بھیجا۔ اگلے ہی دن وہ ان سے ملنے پہنچ گئیں اور کہا کہ تمہارے خط میں اتنی اداسی تھی کہ میں نے سوچا آج ہی مل آؤں۔ گھر میں بہت کام تھے مگر میں چپکے سے نکل آئی۔ چھوٹے بچوں والی کارکن خواتین کی حتی الامکان مدد کرتیں۔ کبھی بچوں کے کپڑے سی کر دے دیے، کبھی سوئیٹر بن دیے۔ ہر ایک سے اس کی تعلیم، سمجھ اور قابلیت کے مطابق کام لیتیں۔ اس طرح پیار سے بات کہتیں کہ کسی بات کو ٹالنے کا یا اس پر عمل نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

آزمائشوں میں استقامت:

آزمائش اللہ کی سنّت ہے اور اس کے ہر روپ سے ان کا واسطہ پڑا۔ ہر غم کا مقابلہ صبر کی ڈھال سے کیا اور غم کو بھی دعوت الی الحق کا ذریعہ بنا لیا۔ اُن کا بیٹا زبیر سترہ سال کی عمر میں اپینڈکس پھٹنے سے اچانک ہی انتقال کر گیا۔ لوگ تعزیت کے لیے آئے تو دیکھا قرآن تھامے مقصدِ حیات سمجھا رہی ہیں۔ کسی نے کہہ بھی دیا کہ ''سوتیلی ماں ہوگی، سگی ماں تو اتنا صبر نہیں کر سکتی''۔ کچھ عرصے بعد ایک داماد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد جوان نواسے کا

ا یکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ پھر اس کی ماں اور آپ کی بڑی بیٹی طاہرہ کینسر کا شکار ہو گئی۔ زخموں سے چُور، اسپتال میں صبر کی تصویر بنی رہیں۔ دل خون کے آنسو یقیناً روتا ہو گا لیکن دیکھنے والے جب کہتے کہ ''طاہرہ کے زخم دیکھے نہیں جاتے''۔ تو آپ ذاتی غم سے بلند ہو کر انھیں اقامتِ دین کے غم کی طرف راغب کرتے ہوئے کہتیں ''اسلام بھی زخموں سے چُور چُور ہے آپ میں سے کوئی ہے جسے اسلام کی چیخیں سنائی دیتی ہوں؟'' جب بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ لوگ آتے تعزیت کرتے، اپنے غم کا اظہار کرتے تو دلسوزی سے ان سے کہتیں ''آج اسلام بھی گھروں سے رخصت ہو رہا ہے، خاندان سے اٹھ رہا ہے، اس کے غم کا اظہار آپ نے نہیں کیا۔ کتنی خوشی ہوا گر آپ اس غم کا اظہار کریں''۔ پھر عزیز بیٹی کے بعد دوسری بیٹی کی بچی آمنہ جس سے انتہائی لگاؤ تھا، وہ انتقال کر گئی۔ ''ان اللہ مع الصابرین'' کا ورد کرتی ہوئی ہر صدمے میں رب کی رضا میں اپنی رضا کو گم کر دیتیں اور دعوت کے تقاضوں کی ادائیگی میں منہمک ہو جاتیں۔

نسلِ نو کی تربیت:

خواتین میں کام کے ساتھ ساتھ آنے والی نسل پر محنت کرنے کی قائل تھیں۔ ۱۹۷۰ء میں کراچی میں جمعیت طالبات کے قیام کے لیے پروگرام ترتیب دیا اور ان کے کام کو جمانے اور پھیلانے میں بھرپور تعاون کیا۔ بچّوں سے ان کی نفسیات کے مطابق بات کرتیں۔ ان کے مشاغل میں ان کا ساتھ دیتیں۔ انھیں اپنے بچپن کے حالات، قصّے کہانیاں سناتیں، زندگی کو بحیثیت مسلمان گزارنے کے طریقے سمجھاتیں۔ پاکستان کی تاریخ اور اس کے لیے دی گئی بے مثال قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتیں ''تم لوگ اس کے امین ہو، پاکستان سے محبت کرو۔ پاکستان کو تم نے کچھ دینا ہے۔ اس کا سپاہی بننا ہے''۔ بچوں کے ذوق کے مطابق انھیں تحائف دیتیں۔ کسی بچے کی اچھی رائٹنگ دیکھی اسے خوشخطی کی کتاب دے دی۔ کسی کا ڈرائنگ کا شوق دیکھا تو اسے اس کی ورک بک دے دی۔ ان کے درمیان بیت بازی اور دیگر مقابلے کرواتیں۔ نصیحت کرتیں کہ ''وقت گزارنے کی نہیں، استعمال کرنے کی چیز ہے۔ اس وقت میں دین کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرو۔ بس اہمیت دو کہ یہ کام کرنا ہے، سستی کو دور کرلو تو کام ہو

جاتا ہے''۔ بچّوں کی ماؤں کو بھی تاکید کرتیں کہ ایک ماں کو دو نہیں، آٹھ آٹھ آنکھیں اور دو نہیں آٹھ آٹھ کان رکھنے چاہئیں''۔ خود اپنے بچوں کی بہترین راز دار بھی تھیں مگر ساتھ ہی چوکس نگراں بھی۔

بیٹیاں بتاتی ہیں کہ امّی نے ناظرہ قرآن ختم کرانے کے ساتھ ہی لفظی ترجمہ شروع کرا دیا۔ گھر کا کام کرتیں تو ہم سے تفہیم القرآن سنتی جاتیں۔ گھر میں اجتماع ہوتا تو اس کے انتظامات میں ہمیں شریک رکھتیں۔ اجتماع میں ہم سے تلاوت کراتیں یا کبھی کوئی نظم پڑھوالی۔ پھر خوب خوب حوصلہ افزائی کرتیں۔ پڑوس میں ہمارے ذریعے اجتماع کی اطلاع کرواتیں۔ معمولی کھانوں میں بھی پڑوس کا حصّہ نکالتیں اور ہم سے بھجواتیں۔ ہماری سہیلیوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرتیں۔ ان کی ماؤں سے مل کر انھیں بھی مشورہ دیتیں۔ اساتذہ سے ملتیں۔ اسکول میں حلقہ درس بنانے کی کوشش کرتیں۔ حلقہ ادب بھی قائم کیا۔ ہر بات میں رہنمائی دی اور دین کے لیے کچھ نہ کچھ کیے جانے پر اصرار جاری رکھا۔

نسلِ نو کی بہترین تربیت کے لیے آپ تعلیم کو انتہائی ضروری سمجھتیں تھیں۔ اور اسلامی انقلاب کے لیے ابتدائی زمانے سے ہی بچّوں کے ذہنوں کو ایسا نظام تعلیم دینے کی خواہشمند تھیں جو ان کو اس انقلاب کے لیے تیار کر سکے۔ اسی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے زبیر پبلک اسکول کے قیام کا فیصلہ کیا اور پھر حلقہ خواتین کے بھرپور تعاون کے ساتھ اس کی تعمیر و تشکیل کے لیے کمر بستہ ہو گئیں۔ حکومت سے پلاٹ منظور کرانے سے لے کر تعمیری مراحل طے کرنا، فرنیچر لانا، نصاب اور نظام کو تشکیل دینا سب میں ایک سرگرم کردار انجام دیا۔ اس اسکول سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ جب بیماری کے باعث طبیعت مضمحل ہوتی تو اسکول چلی جاتیں اور وہاں جا کر ان کے اندر توانائی بیدار ہو جاتی۔ دعاؤں میں بڑا حصّہ اس اسکول کی بہتر ترقی کے لیے وقف ہوتا۔

خاندان میں دعوت:

خاندان کو بھی دعوت کا ایک اہم محاذ سمجھ کر صلہ رحمی کی بہترین کوششیں کیں۔ ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ اس سے آپ کا تعلق سب سے زیادہ ہے۔ خاندان کا کوئی بزرگ، جوان یا بچہ ایسا

نہیں ہوگا جس کی زندگی کارآمد بنانے کی انہوں نے پروا نہ کی ہو،تحریک نہ دی ہو۔ ہرفرد کو احساس دلایا کہ تمہارے اندر یہ اور یہ صلاحیت ہے،تم بہت کچھ کر سکتے ہو،تم لکھ سکتے ہو،تم بول سکتے ہو، چاہتی تھیں کہ کوئی فارغ نہ بیٹھا رہے۔کوئی اپنی بیماری کا ذکر کرتا تو حل دیتیں کہ اس کا علاج یہ ہے کہ تم قرآن پڑھنا شروع کردو۔خاندان میں ہر ماہ کسی ایک رشتہ دار کے گھر جمع ہوکر درس قرآن کراتیں۔ سب کو پڑھنے لکھنے کے لیے کتابیں دی جاتیں۔''نور'' اور ''بتول'' دیے جاتے ساتھ ساتھ دیگر تحائف کا سلسلہ بھی جاری رہتا خصوصاً خاندان کے تمام بچوں بڑوں کے جسم پران کے ہاتھ کے بنے سوئیٹر ہوتے۔ جب دونوں آنکھوں کا آپریشن ہوا تو بھتیجی کے پاس آئیں۔اس کے گھر میں قرآن کی کلاس تھی۔کہا،تم کلاس میں بیٹھواور فون میرے پاس رکھ دو۔ بجائے آرام کرنے کے دو ڈھائی گھنٹے فون پر رابطہ اور منصوبہ بندی کا کام جاری رکھا۔قول کے ساتھ ساتھ عمل سے بہادری، ہمت، صبر اور استقامت کا سبق دیا۔ اپنی نواسی اور دیگر اہل خانہ اور خاندان کو سمجھایا کہ''اللہ نے اسلام کو روشن دین بنایا ہے، نبیؐ تو سورج کی مانند تھے،اپنی روشنی سے مسلمانوں کی شکل میں دیے جلا کر گئے۔اب ہمیں اپنی ذات کے چراغ سے کئی چراغ جلانے ہیں۔اپنے آپ کو خدا کا وفادار بناؤ تا کہ روشنی کے چراغ جلتے رہیں''۔

سفرآخرت:

ان کو ایک کے بعد ایک بیماری کا سامنا رہا۔دل کی مستقل تکلیف، پتے کا درد دونوں آنکھوں کا آپریشن، ٹانگ ٹوٹنے پر راڈ ڈالا جانا اور اس کے تکلیف دینے پر دوبارہ آپریشن کروانا کھانسی اور پھر کینسر۔ایک کے بعد ایک آپریشن سے سامنا کرنا پڑتا لیکن کمزور جسم میں طاقتور روح موجود تھی جو ہر بیماری کے بعد کھڑی ہوجاتی اور ایمان کی روشنی سے غافل دلوں میں زندگی دوڑانے کی کوشش کرتی۔سارے مسائل کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنا کام اسی لگن،تڑپ اور حرکت کے ساتھ جاری رکھا۔کینسر کے باعث دومرتبہ آپریشن کرانے اسپتال میں داخل ہوئیں تو ڈاکٹرز نے بھی اعتراف کیا کہ آپ بہت باہمّت اور باحوصلہ ہیں۔اسٹاف سے بھی مستقل یہ ہی کہتیں کہ''آپ لوگ اسلام اور پاکستان کے لیے کچھ کریں''۔

کاموں کے ہجوم میں لمحہ بھر کی مہلت پا کر جائے نماز پر کھڑی ہوجاتیں۔ دعائیں بہت مانگتیں۔آخری لمحات میں ساری عمر کے کیے ہوئے کاموں کے باوجود انتہائی متفکر رہتیں۔لگتا ہے زندگی ایسے ہی گزر گئی۔لگتا ہے جیسے کچھ کیا ہی نہیں۔خالی ہاتھ ہوں۔امید کا دامن آخر وقت میں بھی تھامے رکھا۔اپنی ادھوری تحریریں مکمل کرنے کی فکر تھی۔آپ کی تقریر میں زورِخطابت نہ تھا لیکن اخلاص اور سادگی سے کہے گئے الفاظ اور پھران کا کردار بات کو مؤثر بنادیتا تھا۔

آخرعمر میں آپ کے جماعت اسلامی سے پالیسی پر کچھ اختلافات ہوگئے جن کے باعث آپ نے ہم خیال بہنوں کے ساتھ مل کر اپنی ایک الگ جماعت تحریکِ اسلامی کے نام سے قائم کی۔جولائی ۱۹۹۸ء سے آپ کی صحت آہستہ آہستہ خراب سے خراب تر ہوتی گئی اور ۱۵ دسمبر ۱۹۹۸ء کو اللہ کے راستے کی یہ مجاہدہ اللہ کو پیاری ہوگئی۔ربِّ اغفر و ارحم وَ انتَ خیر الرّاحمین.

ماخذات

۱۔ ناصرہ الیاس صاحبہ۔نگراں حرم فورم جماعت اسلامی
۲۔ آسیہ خالد صاحبہ۔بیٹی
۳۔ تحریکِ اسلامی میں شعبہ خواتین۔حصّہ اوّل۔مرتبہ اُمّ زبیر
۴۔ بتول۔اُمّ زبیر نمبر۔جنوری ۲۰۰۰ء

&

نیر بانو

۱۹۱۷ء تا ۲۰۰۹ء

)

''تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ میں تجھ سے ایک دو باتیں کرنا چاہوں گی۔ زندگی بھر کے اپنے تجربوں کی باتیں۔ جدائی تو سر پہ آ گئی اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ اپنی زندگی کا کیا پتا، آج ہے کل نہ ہو۔ تیری عمر بالکل ذرا سی ہے مگر کان میں پڑی بات رائیگاں نہیں جایا کرتی۔ آج بچپن کے لحاظ سے اثر ہوگا، کل بڑے پن میں بڑے مطلب بھی نکال سکے گی۔ عقل کے بیج بھی دل کی زمین میں محفوظ پڑے رہتے ہیں۔ موسم آنے پر اپنے آپ کونپلیں پھوٹ آیا کریں ہیں''۔

ماں جی ذرا رکیں تو عاشی آنکھیں کھول کے انہیں غور سے دیکھنے لگی، جیسے بات سننے اور سمجھنے کو تیار ہو۔ بات صرف کان ہی سے نہیں سنی جاتی، آنکھیں بھی کھل کر گفتگو میں شریک ہوا کرتی ہیں۔

''دیکھ بیٹا! اپنے بڑوں کی عزت اور نیک نامی کو آنے والے چھوٹے ہی سنبھالا کرتے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں پتا آگے کیا ہونے والا ہے؟ لڑکیوں کو بڑی کھل دے رہے ہیں، میری چاندا اپنا بہت دھیان رکھیو۔ ہر ایسی بات اور ایسے کام سے بچنا چاہیے جس کے کرنے سے بے عزتی اور شرمندگی ہو''۔

''چراغوں کا دھواں'' از: نیر بانو

اگست ۱۹۴۱ء کا زمانہ ہے۔ بھوپال کے ایک قصبے گوھر گنج میں اپنی خالہ کے بڑے صحن کے مکان کے ایک کمرے میں ایک ۲۳ سالہ لڑکی اپنی تین ماہ کی بچی کو گود میں لیے کتاب ''پردہ'' پڑھنے میں منہمک ہے۔ بچی روتی ہے تو اسے دودھ پلا دیا جاتا ہے، لیکن مطالعے میں وقفہ نہیں آتا۔ وہ کتاب ختم ہوتی ہے تو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی دوسری کتاب ہاتھ میں لے لی جاتی ہے۔ گھر میں جتنا تحریکی لٹریچر تھا وہ چند دنوں میں سب پڑھ لیا جاتا ہے اور وہ لڑکی اپنی یہ کیفیت محسوس کرتی ہے جیسے دل و دماغ کا سارا میل کچیل دھل دھلا گیا۔ جیسے آج ہی وہ پیدا ہوئی ہو اور آج ہی پہلا سانس لیا ہو۔ یہ مولانا کی تحریروں کا مقناطیسی اثر تھا جس نے اس لڑکی کے اندر چھپے جذبوں کو آشکارا اور متحرک کر دیا۔ اس جماعت کی دعوت پر لبیک کہنے کا عزم اس طرح غالب ہوا کہ فجر کی نماز کے وقت نہا دھو کر نماز پڑھی اور کلام الٰہی کو سامنے رکھ کر جماعت کی رکنیت کا عہد کر لیا گویا اللہ کو گواہ بنا کر خود کو رکن جماعت بنالیا اور پھر نظم جماعت کو اس سے مطلع کر کے پوری عمر اس عہد کو نبھانے میں لگا دی۔ کسی فرد کا انتظار کیے بغیر از خود فرض کی پکار پر لبیک کہہ کر رکنیت کا اقرار کرنے والی یہ لڑکی نیر بانو تھی جسے بعد میں جماعت اسلامی حلقہ خواتین کی قیّمہ قرار دیا گیا۔

ابتدائی تعارف:

آپ ۸/اگست ۱۹۱۷ء کو بھارتی ریاست مالیر کوٹلہ میں پیدا ہوئیں۔ اپنے والدین کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ آپ کی والدہ مستقل بیمار رہتی تھیں جس کے باعث آپ دس سال کی عمر سے ہی گھر داری اور چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری سنبھالنے لگیں۔ آپ نے ادیب عالم میں گولڈ میڈل لینے کے بعد طبیہ کالج دہلی سے حکمت کی سند حاصل کی۔ آپ کے ماموں زاہد حسین دہلی میں ہائی کمشنر اور قیام پاکستان کے بعد اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے پہلے گورنر جنرل تھے اور آپ کی خالہ زاہدہ حسین جماعت کے ابتدائی ارکان میں سے تھیں۔ خرم مراد صاحب انہی کے بیٹے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں آپ کی شادی سید سخاوت علی صاحب سے ہوئی جو پولیس میں ملازم تھے۔ ۱۹۴۱ء میں آپ اپنی خالہ سے ملنے بھوپال گئیں اور وہاں تحریکی لٹریچر

سے متعارف ہو کر خود بھی اس تحریک میں شامل ہو گئیں۔ اس وقت خواتین کا نظم قائم نہیں ہوا تھا۔ آپ نے مرکزی نظم کی ہدایات کے مطابق مطالعہ اور دعوت کے کام کو جاری رکھا۔ آپا حمیدہ بیگم کے قیّمہ حلقہ خواتین بن جانے کے بعد ان سے تحریری رابطے کا آغاز ہوا۔ آپ اس وقت انبالہ میں تھیں۔ جلد ہی وہاں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ آپ کا خاندان دہلی اور پھر یہاں سے ہجرت کر کے کراچی منتقل ہو گیا۔ چند دن گزرے اور پھر آپ اپنے والد کے ساتھ کوئٹہ چلی گئیں۔ میاں صاحب کی پوسٹنگ سیالکوٹ میں ہوئی۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں آپ بچوں کے ساتھ سیالکوٹ چلی گئیں اور پھر عمر وہیں گزاری۔

اللہ تعالیٰ کی مشیّت نے آپ کی تربیت اور رفاقت کے لیے آپا حمیدہ بیگم کو بھی سیالکوٹ پہنچا دیا۔ ان کے بھائی مولوی مظفری صاحب اس وقت پولیس میں تھانے دار مولوی کے عہدے پر فائز تھے۔ جب دونوں حضرات ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تو پتا چلا کہ ایک کی بیگم اور دوسرے کی بہن جماعت میں ہیں۔ یوں دونوں ہم خیال اور ہمسفر بہنوں کا آپس میں ملاپ ہوا۔ اور پھر مل کر اجتماعیت کی دعوت آگے بڑھانے کا سلسلہ چل نکلا۔ ابتدا میں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت مشکل سے ملتی تھی۔ آپا حمیدہ بیگم نے ان کو اس عرصے میں قلمی جہاد پر تیار کیا اور وہ یکسوئی سے اس محاذ پر جم گئیں۔ آہستہ آہستہ دیگر تحریکی مصروفیات میں بھی اپنا حصہ ڈالا، یہاں تک کہ حلقہ خواتین کی تیسری قیّمہ مقرر ہوئیں اور ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۷ء تک دو سیشن اس ذمہ داری کو نبھایا۔ اللہ تعالیٰ نے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا۔ بیٹی سلمیٰ یاسمین نجمی اور بہو سمیعہ سالم بھی کہنہ مشق ادیبہ ہیں۔ آخر عمر میں یادداشت کمزور ہوتی گئی اور وہ ماضی بعید کے علاوہ سب کو بالکل بھول گئیں۔ لیکن قرآن اس حال میں بھی اچھی طرح یاد رہا اور پڑھنے والوں کی غلطیوں کی اصلاح کر دیتی تھیں۔ ۴ دسمبر ۲۰۰۹ء کو تقریباً ۹۲ سال کی عمر گزار کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئیں۔

شخصی اوصاف:

اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق دنیا میں جس بندے سے جو کام لینا چاہتا ہے اس کے اوصاف اسے عطا کر کے دنیا میں بھیجتا ہے۔ انسان دنیا میں محنت اور تربیت سے ان اوصاف کو

چکا تا اوران کا پھل پا تا ہے۔ دس سال کی عمر سے نیر بانو صاحبہ پر گھر اور گھر والوں کی نگرانی و دیکھ بھال کی جو ذمہ داری پڑی اس نے ان کے اندر احساس ذمہ داری، تفکر، تدبر، معاملہ فہمی اور محنت کے اوصاف کو اجاگر کر دیا۔ سلیقہ وسگھڑاپا گویا گھٹی میں پڑا تھا۔ علم وادب کا گہرا رجحان تھا۔ ادیب عالم اور حکمت کی تعلیم کے ساتھ اردو اور فارسی ادب کو بھی گہرائی سے پڑھا ساتھ ہی ساتھ گھر میں رہتے ہوئے انگلش زبان سیکھی اور اس میں اتنی استعداد بڑھائی کہ انگلش کلاسیکی ادب پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہوگئیں۔ گہرے مطالعہ کے بعد جب آپ تحریر کے میدان میں آئیں تو یہاں ان کے گہرے مشاہدے اور انسانی نفسیات سے آگہی نے ان سے بہترین تحریریں لکھوائیں۔

آپا نیر بانو نظر شناس تھیں۔ چہرہ دیکھ کر اندر کا حال سمجھ جاتی تھیں۔ لوگوں کے مزاج کو سمجھ کر اس کے مطابق اُن سے معاملہ کرتی تھیں۔ دھن کی پکی تھیں، کوئی عذر اِن کو ہدف سے غافل نہ کرسکتا تھا۔ مضبوط اعصاب کی مالک تھیں۔ زندگی اور تحریک کے نشیب وفراز کو تحمل سے برداشت کیا اور اپنے سفر کو جاری رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ عورت پن کی خوبیاں بھی کمال کی تھیں۔ کھانا ایسا پکاتیں کہ لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ اچار، چٹنیاں، مرّبے سب گھر میں بنتے۔ مولی گاجر تک ایسے کاٹتیں کہ سب ٹکڑے برابر ہوتے۔ سلائی اتنی نفیس کہ ہرٹانکا ہموار اور سیدھا ہوتا۔ لحاف بنانا، اس میں ڈورے ڈالنا، چارپائیاں بنانا، نواڑی پلنگ تیار کرنا سب کام خود کرتیں۔ کیاریوں اور گملوں میں پھول اگاتیں۔ ان کی گوڈی کرتیں۔ مرغیاں بھی پال رکھی تھیں۔ کشیدہ کاری، سوئیٹر بننے اور کروشیا میں مہارت حاصل تھی۔ ذہن ایسا پایا تھا کہ جوڑ یزائن ایک بار دیکھ لیتیں خود ہی اسے تیار کر دیتیں۔ اپنے پاس آنے والی بہنوں کو بھی یہ ہنر سکھاتی رہتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ ''یہ ہنر اور سلیقہ عورت کا زیور ہے، گھر اس کی سلطنت ہے جس کی وہ بے تاج ملکہ ہے اور اسی گھر کو سلیقہ سے چلانا اس کی ذمہ داری ہے''۔

ان کے کردار میں پختگی اور استقلال تھا جو قبول کیا اس پر ڈٹ گئیں۔ جو کہا وہ کر کے دکھایا۔ انہوں نے دو مرتبہ رشتہ داروں کا بائیکاٹ سہا۔ قیام پاکستان سے قبل اوائل عمر میں جب انھوں نے اپنے کچھ اعزاء کے زیر اثر آزاد خیالی اختیار کی تو دیگر رشتہ داروں نے ان کا سماجی

مقاطعہ کیا اور دوسری بار جب اسلام وتحریک کی سمجھ آنے کے بعد آپ نے پردہ اختیار کیا تو اس وقت کچھ میکے وسسرال والے آزاد روی اختیار کر رہے تھے، انہوں نے اس روش پہ سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن وہ اس پر جمی رہیں۔

سادگی اور قناعت آپ کی زندگی کا جزو تھے۔ اِن کی شادی محکمہ پولیس کے ملازم کے ساتھ ہوئی، لیکن شروع میں ہی واضح کر دیا کہ مجھے حرام کا ایک پیسہ بھی گوارا نہ ہوگا۔ دال روٹی پر گزارا کیا لیکن ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کیا۔ حلال پر قانع رہنے کے لیے انھوں نے اپنی خواہشات و ضروریات کو محدود کر لیا تھا۔ ہر خرچ کے لیے ایک الگ تھیلی بنا رکھی تھی اور تنخواہ ملتے ہی بجٹ منصوبے کے مطابق ہر تھیلی میں پیسے رکھ دیتیں اور ہر حال میں اپنے اخراجات اسی میں پورے کرتیں۔ ان کی زندگی نظم وضبط، پابندی وقت، اصول پسندی اور نفاست پر مبنی تھی۔ دور سے دیکھنے والوں کو آپ پُرجلال نظر آتیں اور قریب آنے والوں کو ان کا جمال اسیر بنالیتا۔

حکمت وتوازن:

اُن کے شوہر پولیس کی سرکاری ملازمت کے باعث سیاسی تنظیم سے وابستگی نہ رکھنے کے پابند تھے۔ اسی لیے وہ آپ کو بھی اجتماعات میں جانے سے منع کرتے تھے۔ جبکہ آپ رکنیت کے تقاضوں کے پیش نظر اجتماعیت سے مضبوط رشتہ قائم رکھنے اور اسے نبھانے کی زبردست خواہش رکھتی تھیں۔ اسی خواہش کے تحت جب اللہ نے بیٹے کی دولت سے نوازا تو شوہر نے اس موقع پر استفسار کیا کہ ''اس خوشی کے موقع پر کیا تحفہ لوگی؟'' تو داعیانہ تڑپ کے ساتھ آپ نے کہا ''بس مجھے اجتماع میں جانے کی اجازت دے دیں''، اور یوں حکمت کے ساتھ اس بند دروازے کو کھولنے میں کامیاب ہوگئیں۔

اپنے اوقات کو مختلف کاموں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ کھانا پکانا، گھر کی دیکھ بھال، مطالعہ قرآن وحدیث، مطالعہ اخبارات ورسائل ولٹریچر، سلائی بنائی، لکھائی، آرام، بچوں کے ساتھ گپ شپ اور دیگر تمام کاموں کے اوقات مقرر تھے۔ گھڑی دیکھ کر ایک گھنٹے کے لیے باورچی خانے میں جاتیں، کھانا پکا کر ہر چیز ساتھ ساتھ سمیٹتی جاتیں۔ کھانے اور ناشتے کے لیے اوقات مقرر کیے ہوئے تھے جن کی پابندی کی جاتی اور اس وقت حاضر نہ ہونے والوں سے ناراض ہوتیں اور بعد

میں اپنا بندوبست خود کرنے کو کہتیں۔ خطوط لکھنے ہیں یا سلائی کرنی ہے یا دھوپ میں بیٹھ کر اخبار پڑھنا ہے۔ یہ تمام دن بھر کے کام وہ صبح ہی لکھ لیا کرتیں پھر پورا دن اس کے مطابق گزاتیں۔ اسی طرح جماعتی کاموں کا بھی خاکہ بنالیا کرتیں۔

گھر اور خاندان:

اللہ تعالیٰ نے چار بچوں سے نوازا اور اکثر کہا کرتی تھیں کہ ''میری دنیا یہ چار بچے ہیں اور یہی آخرت کا سرمایہ ہیں'' اسی سوچ کے تحت بچوں کی تربیت پہ کڑی نظر رکھی۔ پولیس کی ملازمت کے باعث شوہر کے مختلف شہروں میں تبادلے ہوتے رہتے تھے، لیکن آپ سیالکوٹ میں ہی مقیم رہیں اور بچوں کی نگرانی و تربیت کے فرائض اکثر تنہا ہی انجام دیے۔ عورت کے ساتھ بچوں کے ذکر کو وہ لازمی جزو سمجھتی تھیں۔ اگر کوئی تحریکی بہن خط میں صرف اپنا حال اور جماعتی کام کی تفصیل لکھ کر بھیج دیتی تو ناراض ہوتیں اور کہتیں کہ ''یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آج کی عورت جدیدیت کے زیر اثر اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ وہ گھر کے جھمیلوں یا بچوں کا ذکر زبان پر لائے اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ مغرب کے بروکن ہومز بننے میں ابتدا میں یہی سوچ کارفرما تھی''۔

بچوں کا ہر کام خود کیا۔ بادام کے چھلکے جلا کر منجن بنانے سے لے کر ان کے کپڑے سینے تک ہر کام خود کرتیں۔ بیٹی سلمیٰ یاسمین نجمی لکھتی ہیں کہ ''وہ بڑی اچھی مگر سخت گیر ماں تھیں۔ اصولوں پر سودے بازی نہیں ہوسکتی تھی۔ جو وہ کہیں گی وہ پڑھنا ہوگا جس سے منع کریں گی باز رہنا ہوگا۔ ہمارے تحفظ کے لیے انہوں نے مختلف قوانین عائد کیے ہوئے تھے جن کی پاسداری ضروری تھی۔ کمال یہ تھا کہ وہ دل کا حال پڑھ لیتی تھیں اور ان کے سامنے ہم کوئی بہانہ نہ بنا پاتے تھے۔ کہانیاں لکھنا تو بعد کی بات ہے کہانیاں سنانا انہوں نے بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔ ہم بچے جب تک ان سے کہانی نہ سن لیتے سوتے نہیں تھے۔''

چھوٹی بیٹی انجم لکھتی ہیں کہ ''امی ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ اور روک ٹوک نہیں کرتی تھیں کوئی غلط بات دیکھتیں تو مناسب موقع دیکھ کر سمجھاتی تھیں۔ صبح ناشتہ کے لیے بچوں کا فجر کی نماز پڑھنا شرط تھی۔ امی نے ہمیں دینی تعلیم دی نمازیں پختہ کرائیں۔ رات میں کہانی اور حفیظ

جالندھری کی نظمیں سناتیں۔ بڑے ہوئے تو اقبال، اسماعیل میرٹھی اور حالی کی مسدس سنائی۔ ہر ہفتہ ہمارے ہاں درس ہوتا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ مل کر قرآنی سورتیں یاد کرتیں۔ انہوں نے یہ بات ہمارے ذہنوں میں اتار دی تھی کہ ''عزت سے زیادہ قیمتی اور کوئی شے نہیں۔ تم انتہائی قیمتی اور انمول ہو۔'' مجھے تقریریں لکھ کر دیتی تھیں جن سے میں نے بے شمار انعامات جیتے۔ مجھے انجکشن لگانا سکھایا، ہماری زبان کا بہت خیال رکھتی تھیں کہ کوئی غلط لفظ یا بات منہ پر نہ آئے۔ ذہن بنانے میں ہمیشہ مصلحت اور مصالحت سے کام لیتی تھیں تاکہ ہم کہیں چوری چھپے غلط کام نہ کرنے لگیں یا ضد نہ پکڑ لیں۔ انہوں نے ہمارے اندر اپنے قول و فعل سے نیکی کے بیج بو دیے تھے۔ ان کے درس دل کی دنیا کو زیروزبر کر دیتے تھے۔ آپ کا دل اتنا وسیع تھا کہ جب بھی کسی پر مشکل آئی آپ اس کی مدد کے لیے موجود ہوتیں۔ بچے کی پیدائش کا معاملہ ہو یا فوتگی کا سب جگہ حاضر ہوتیں۔ بے شمار لوگوں کے وظیفے باندھ رکھے تھے۔ بچوں، بڑوں سب کو ساری زندگی قرآن کا پیغام سنایا، ہم بچوں کو انہوں نے ہمیشہ صبر، شکر اور برداشت کی تلقین کی اور دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بنانے کی فکر کی''۔

آپ کی بہو سمیعہ بتاتی ہیں کہ ''شادی کے وقت میں پڑھ رہی تھی۔ شادی کے بعد بھی میں اسی طرح کالج جاتی رہی۔ گھر کے کام کاج، باہمی تعلقات، دینی معاملات سب میں آپ نے میری رہنمائی کی۔ میری ہنڈیا اکثر میری غفلت کے باعث جل جاتی لیکن وہ کچھ نہ کہتیں۔ جب میں درس دینے لگی تو انہوں نے کہا۔ آج سے تمہاری ہنڈیا جلنا سب معاف۔ تم نے درس اتنا اچھا دیا ہے۔ میں کالج جاتی تو بیٹا ان کے حوالے کر جاتی۔ تین چار سال کی عمر سے اسے نماز کے لیے اپنے ساتھ کھڑا کر لیتیں۔ میرے چار بچوں کو انہوں نے ہی قرآن پڑھایا۔ وہ پاکستان کی سب سے بارعب خواتین میں سے ایک تھیں، لیکن بچوں کے لیے بہت نرم تھیں۔ غلطی پر ڈانٹتی نہیں تھیں بلکہ ہر چیز کے لیے نصیحت افروز کہانی سناتی تھیں۔ انہوں نے بڑی فراخدلی، وسعت نظری اور تحمل کے ساتھ بہوؤں کے ساتھ زندگی گزاری۔ انصاف پسند تھیں۔ بیٹوں کے مقابلے میں بہوؤں کا ساتھ دیتیں۔ مجھ سے کہتیں روٹی بازار سے منگوالو، باقی کام نوکرانیوں سے کروالو تم دین کا کام کرو تم جو کام کرسکتی ہو وہ نوکرانیاں نہیں کرسکتیں۔''

بھابھی بیگم انور حامد بتاتی ہیں کہ ''باجی بہت محبت کرنے والی اور خیال رکھنے والی تھیں۔ ان کے عمل سے پتا چلتا تھا کہ انہیں ہمارا خیال ہے۔ وہ خاندانی معاملات درست رکھنے میں ہماری رہنمائی کرتیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ اگر کوئی فوت ہو جائے تو اس کے لواحقین کو غسل اور کفن کے آداب اور طریقے تک نہیں پتا ہوتے اور وہ اسے پیشہ ور لوگوں کے سپرد کر دیتے ہیں آپ غسل میت پر آسان سا مضمون لکھیں تا کہ ہم اسے چھپوا کر تقسیم کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے اس موضوع پر کتابچہ لکھا اور ہم نے اسے خوب تقسیم کیا۔

بیٹے سالم نے آپ کے بارے میں لکھا کہ ''امی کی ساری زندگی انتہائی صاف ستھری، نظم و ضبط، اور سلیقہ شعاری و کفایت شعاری کے ساتھ گزری۔ قرض لینا انہیں سخت ناگوار تھا۔ تھوڑی تنخواہ ہونے کے باوجود بچت بھی کرتیں اور اکثر محلے کی خواتین ان سے ادھار لے جاتیں۔ ایک مرتبہ ہم نے سائیکل خریدنے کا مطالبہ کر دیا۔ بجٹ میں ڈھائی سو روپے کی گنجائش نہ تھی۔ اب انہوں نے سائیکل کے نام سے ایک تھیلی بنالی اور اس میں دس روپے ہر ماہ جمع ہونے لگے اور دو سال بعد سائیکل خریدی گئی۔ میں شروع سے گھر سے زیادہ باہر رہنے کا شوقین تھا۔ اس طرح ماحول کے اثرات بھی سمیٹ لیتا تھا۔ امی نے مجھے برائی سے بچانے کی خاطر اس گھر کو کرائے پر اٹھا کر شہر سے ہٹ کر کچہری کے پاس ایک گھر کرائے پر لے لیا جہاں دور دور دو چار گھر تھے یا کھیت تھے۔ یا کچہری عدالت تھی۔ مجھے پڑھنے کا قطعی شوق نہ تھا لیکن یہ امی ہی کا حوصلہ تھا کہ وہ مجھے گھسیٹ کر بی اے تک لائیں۔ امی نے میری تربیت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور ایسی بہو ڈھونڈ کر لائیں جو ان کے مشن کو آگے بڑھا سکے۔''

نواسے احمد کمال اپنی نانی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''میں نے بچپن کے پانچ سال اپنی نانی کے ساتھ گزارے وہ دور میری زندگی کا حسین ترین دور تھا۔ میں بدتمیز اور غصیلا تھا مگر انہوں نے بڑے تحمل سے مجھے سمجھایا۔ میں پانچ سال ان کے کمرے میں سویا کوئی رات ایسی نہ گزرتی جس میں کوئی کہانی کوئی نظم یا لوری شامل نہ ہو۔ تمام انبیاء کرام کی زندگی کی کہانیاں ایسے سناتیں کہ ہم بچے اس دور میں پہنچ جاتے قرآن میں جتنے قصے ہیں وہ سب کہانیوں کے انداز میں بیان کرتیں۔ مجھے روز قرآن پڑھاتیں، بغیر دیکھے سنتیں اور غلطی پر فوراً ٹوک دیتیں۔ وہ دن رات

اسلام کی خدمت کرتیں لیکن ساتھ میں گھر کے کام بھی خود کرتیں پانچ سال میرے کپڑے اپنے ہاتھ سے دھوئے ہر سردیوں میں مجھے اپنے ہاتھ کا بنا ہوا سوئیٹر پہناتی تھیں۔ طبیعت میں خوش مزاجی بہت تھی۔ گھر والے کھانے کے لیے بیٹھتے تو شعر و شاعری کی فضا گرم ہو جاتی۔ حالات حاضرہ پہ گفتگو ہوتی۔ ہنسی مذاق بھی ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ بڑا ہو کر میں امریکا پڑھنے چلا گیا۔ وہاں پیش آنے والے مسائل انہیں لکھ کر بھیجتا۔ وہ خط میں ان کے جواب لکھ کر بھیجتیں اور ساتھ میں ہر بار کوئی نئی نصیحت، اور اتفاق کہیں یا ان کا مشاہدہ کہ نصیحت عین میرے حالات کے مطابق ہوتی۔ اس کے بعد میں انگلینڈ گیا تو خطوط میں یورپ سے متعلق نصیحت آنا شروع ہو گئی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یورپ اور امریکا کی تہذیب اور معاشرت کا فرق انہیں کس طرح پتا چلا۔ ہمیشہ کہتیں کہ ''کہیں بھی رہو، پر یہ کبھی نہ بھولنا کہ تم ایک مسلمان ہو۔ تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عزت رکھنی ہے پھر اپنے ماں باپ کی۔ یہ کبھی نہ بھولنا کہ تم نے اگر کوئی غلط کام کر لیا تو کوئی دیکھے نہ دیکھے اللہ تو دیکھ رہا ہے اور یہ خلش تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی''۔

اپنے تمام ہی رشتے داروں سے حسن سلوک اختیار کیا کئی رشتہ دار دو دو ماہ اور بعض تو سال بھی رہ جاتے قلیل تنخواہ کے باوجود ماتھے پر بل نہ آتا بس شور با اور پتلا ہو جاتا۔ بعض رشتہ داروں کی بدسلوکیوں پر بچے چیں بہ چیں ہوتے تو فوراً روک دیتیں کہ یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے، میں خود اسے دیکھ لوں گی۔ وہ تمہارے بڑے ہیں تمہیں ہر حال میں ان کے حقوق ادا کرنے اور ان کا ادب ملحوظ رکھنا ہے۔

آغازِ سفر:

تحریکی سفر کا عملی آغاز صحیح معنوں میں ۱۹۴۸ء میں ہوا جب قدرت نے آپا حمیدہ بیگم اور آپ کو سیالکوٹ میں یکجا کر دیا۔ اس زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے آپ خود لکھتی ہیں کہ ''اس وقت ہم زیادہ تر پیدل ہی آتے جاتے تھے اور اتنا ہی پروگرام بناتے تھے جس کا پیدل گزارا ہو سکے۔ جواں عمری کا زمانہ تھا پیدل بھی خاصا چل لیتے تھے۔ سستا زمانہ تھا۔ ایک روپیہ میں دور جانا اور واپسی کا سفر ہو جاتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ فالتو روپیہ پاس نہیں ہوتا تھا کبھی کبھار ضروری اخراجات میں کتر بیونت کر کے نکالنا پڑتا تھا''۔

قلمی مجاہدہ:

آپا حمیدہ بیگم کی جوہر شناس نگاہوں نے کچھ عرصہ میں ہی ان کے اندر چھپے قلمکار کو دریافت کرلیا اور یکسوئی سے اس تحریکی محاذ پر جم جانے کا حکم دیا۔ شروع شروع میں مختلف مشہور جرائد کو پڑھ کر ان سب میں آنے والی اچھی تحریروں کی توصیف و حوصلہ افزائی اور نامناسب تحریروں پر تنقید کو ہدف بنایا گیا۔ نیر بانو صاحبہ کی بلند نظری نے ملک کے معروف ترین ادیب منٹو کی تحریروں کو ہدف بنایا جن کے کھلے کھلے افسانے معاشرتی اقدار و روایات کے لیے سمِ قاتل ثابت ہو رہے تھے۔ ایسی تنقید منٹو پر پہلے بھلا کس نے کی ہوگی لہٰذا اس کا خوب خوب برا منایا گیا اور اپنی کتاب ''گنجے فرشتے'' میں اس کا ذکر بھی کیا۔ ابتدائی کچھ عرصے کے بعد آپ نے اپنی نثر نگاری کی ابتدا کی اور قلمکاروں کے ہراول دستے کا نمایاں حصہ بن گئیں۔ بے شمار افسانے، ناول، مضامین اور خطوط تحریر کیے۔ اسلامی اقدار و روایات کے فروغ، ازدواجی زندگی کی رہنمائی، نسلِ نو کی تربیت اور فضول اصول و رواج سے خواتین کو نجات دلانے کے لیے انہوں نے نثر کی ہر صنف کو کامیابی سے استعمال کیا۔ آپ کی سادہ اور رواں تحریر حسین الفاظ و محاورات اور موزوں اشعار کے استعمال سے دل میں اترتی چلی جاتی۔ رسالہ بتول کا ایک گوشہ ہمیشہ آپ کی تحریر سے مزّین رہتا اور ساتھ ہی موصولہ تحریروں پر کچھ اس انداز میں تبصرہ بھی کرتیں کہ لکھنے والی کی سوچ اور ہنر دونوں کی اصلاح ہوتی جاتی۔ اس طرح آپ مسِ خام کو کندن بنانے کی مشقت میں لگی رہتیں۔

انھوں نے ایک پوری نسل کی ادبی رہنمائی کی۔ ملکی سطح پر صالح و پاکیزہ ادب کے فروغ کے لیے آپ ہی کے زمانے میں ''حریم ادیب'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم کیں اور اس کے تحت لکھنے والوں کی ایک کھیپ تیار کی۔ نوآموز قلمکاروں کو مستقل محنت و محبت سے پختہ کار ادیبہ کے مقام تک پہنچایا گیا۔ نئے قلمکاروں کے لیے وہ رہنمائی دیتی تھیں کہ ''لکھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کا مطالعہ باقاعدہ اور وسیع ہو۔ مستند اہلِ قلم ادیبوں کی تصانیف پڑھنا ضروری ہے۔ لکھنے کی صلاحیت ہو اور مشق کی جائے تو چند مہینوں میں قلم منجھ سکتا ہے۔ زبان دانی گرامر، محاورے پر خاص نظر رکھیے، خیالات تو دل میں

امنڈتے ہی ہیں، سارا فن تو ان کے اظہار میں ہے جسے بات بنانا کہتے ہیں۔ بس یہ بات بنانا ہی ذرا مشکل ہوتا ہے۔''

انھوں نے خواتین کے اس دینی، علمی و ادبی کارواں کو آگے بڑھانے کے لیے جس جان ماری، فداکاری اور حکمت سے کام لیا وہ ہماری ادبی تحریکی تاریخ کا روشن ورق ہے۔ آپ نے انتہائی نامساعد حالات میں جس ادبی سفر کی ابتدا کی تھی وہ ایک مؤثر تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔

آپ جس میں بھی قلمی صلاحیت پاتیں اسے یہ بات سمجھایا کرتیں کہ ''آپ کو اللہ تعالیٰ نے اظہارِ بیان کی صلاحیت دی ہے۔ اگر آپ اس کی طرف توجہ نہ کریں گی تو یہ ناشکری ہے۔ اپنی اس ذہنی جاگیر میں سے اللہ کے نام کی سوغات نکالیں۔'' ساتھ ہی ساتھ یہ رہنمائی بھی دیتی تھیں کہ ''روانی طبع کو محدود اور مسدود نہیں ہونا چاہیے۔ مختلف مقامات پر اپنے جوہر بکھیرنے چاہئیں اس سے اپنا بھی اندازہ ہوتا ہے اور جواہر کی آب و تاب اور قدر و قیمت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ فن میں پختگی بہرحال مشق سے ہی آتی ہے اور مشق کے معنی ہیں لکھنا''۔

خود انہوں نے بہت کچھ لکھا جو بھی لکھا ایک مقصد کے تحت لکھا۔ لکھ لکھ کر آخر عمر میں ان کی انگلیاں اسی رخ پر ٹیڑھی ہوگئی تھیں کئی مرتبہ ہاتھ دیکھ کر کہتیں ''ان ہاتھوں نے بہت کچھ لکھا۔ اللہ کی محبت میں خلق خدا کی اصلاح کے لیے اللہ قبول فرمائے''۔ افسانے و مضامین لکھے معاشرتی و فقہی سوالات کے جواب دیے، بے شمار خط لکھے۔ ان کی ہر تحریر آبگینہ تھی۔ الفاظ ہیرے موتی کی طرح منتخب ہوتے۔ ان کا وسیع مطالعہ، انسانی نفسیات سے آگہی اور گہرا مشاہدہ ہی وہ عوامل ہیں جنہوں نے ان سے زندہ رہنے والی کہانیاں لکھوائیں۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۹۷ء تک اپنی ڈائری بھی لکھتی رہیں پھر یادداشت متاثر ہونے کے باعث یہ عمل رک گیا۔ ڈائری بتاتی ہے کہ مضمون مکمل ہونے پر شکرانے کے طور پر صدقہ دیتیں۔ اس میدان میں آپ کی مستعدی کا عالم یہ تھا کہ ۵ جولائی ۱۹۸۹ء کو خواتین اور فتنہ مساوات پر یہ مضمون صبح کو پوسٹ کیا ہے اور سہ پہر ساڑھے چار بجے ''خواتین میں ادب'' کے نئے عنوان پر مضمون کا آغاز کر دیا۔

اوصافِ قیادت:

۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۸۰ء تک تیس سال آپ نے شب و روز قلمی جہاد کا محاذ سنبھالے

رکھا۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قافلہ حق کی عملی رہنمائی کے لیے چن لیا۔آپا حمیدہ بیگم اور آپا ام زبیر کے بعد اب حلقہ خواتین کی قیمّہ کی ذمہ داری ارکان خواتین نے آپ کے کاندھوں پر رکھ دی۔ یہ ۱۹۸۱ء کا سال تھا جب آپ کو تحریک کی تیسری رہنما بننے کا شرف حاصل ہوا۔آپ کی شخصیت کے جو اوصاف اب تک قریبی ماحول کو منوّر کیے ہوئے تھے، اس ذمہ داری کے ذریعہ تحریک کو منظّم و مضبوط کرنے کا ذریعہ بن گئے آپ نے اپنا حسنِ انتظام سلیقہ اور تندہی نظم جماعت کو سنوارنے اور نکھارنے میں لگا دیا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو جوہری جیسی نظر دی تھی۔آپ نے تحریک کی مضبوطی کے لیے فرد کی صلاحیت کے مطابق اسے ذمہ داریاں تفویض کیں۔ایک ملاقات میں ہی وہ فرد کے اندر جھانکنے اور اس کی افتادِ طبع کا اندازہ لگانے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔خود کہتی تھیں کہ اگر ''ڈرائیور کی سیٹ پر مسافر کو بٹھا دیا جائے تو کیا وہ گاڑی چلالے گا؟''

ان کا کام ایک ماہر انجینئر کی طرح ہر پرزے کو اس کی صحیح جگہ فٹ کر کے تحریک کی مشینری کو چلانا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا پرزہ آپ کی نظر میں انتہائی اہم تھا۔انہوں نے کارکنان کے اندر اس تحریکی شعور کو بیدار کیا کہ تحریک کا کارکن ہونا ایسا ہی ہے جیسے شعوری مسلمان ہونا ہمیں زندگی کے روزمرہ کاموں میں بھی تبلیغ دین کرتے رہنا چاہیے۔

تقسیم کار کے ساتھ ساتھ آپ نے کارکنان کی تربیت پر انتہائی توجہ دی۔حلقہ خواتین کی سطح پر شعبہ تربیت سب سے پہلے آپ ہی کے دور میں قائم کیا گیا۔اول روز سے کارکنان کے مطالعہ کے لیے نصاب مقرر تھا جو سہ ماہی تھا۔آپ خود بڑی محنت سے اس کا مواد مرّتب کرتیں اور اپنے خط کے ساتھ اس نصاب کو جاری کرتیں۔ذیلی نظم سے مستقل رابطے استوار کیے۔اس ضمن میں تحریر کو اپنا شعار بنایا۔فون کے مقابلہ میں انھیں قلم کا استعمال زیادہ مرغوب تھا۔کہتی تھیں کہ فون کی بات ہوائی ہوتی ہے، ہوا میں اڑ جاتی ہے۔قلم کی بات باقی رہتی ہے۔خطوط اور سرکلرز کے ذریعہ کل پاکستان حلقوں کو مرکز سے جوڑے رکھتیں۔ ہر اہم موقع پر تفصیلی سرکلر جاری کیے جاتے ۱۲/اگست ۱۹۸۲ء میں جاری کردہ سرکلر میں لکھتی ہیں۔''دسمبر ۱۹۸۲ء میں اصلاحِ معاشرہ کی ہفت روزہ مہم چلنے والی ہے۔میں چاہتی ہوں اس مہم سے پہلے ہم سب کو ذاتی طور پر

بالکل ٹھیک ٹھاک، تیار اور درست ورکنگ آرڈر میں ہونا چاہیے۔جس طرح پرواز سے پہلے جہاز کے تمام کل پرزوں کی چیکنگ ہوتی ہے، اور اس کی ٹوٹ پھوٹ کو یونہی نہیں چھوڑ دیا جاتا، ٹھونک پیٹ کر سب نقائص اور خرابیاں درست کر دی جاتی ہیں اور جیسے لمبے سفر پر نکلنے سے پہلے گاڑیوں کی صفائی اور ٹیوننگ ہوتی ہے۔کم از کم اصلاح و تبلیغ کرنے والی بہنوں کے بارے میں کسی کے دل میں اس خیال کا شائبہ تک نہ گزرنے پائے کہ دیگراں را نصیحت خود بی بی فضیحت''۔

آپ نے تربیت گاہوں کے مستقل سلسلے کو شروع کیا۔قیمّہ کی ذمہ داری کے دوران آپ نے تین بار مرکزی اجتماعِ ارکان اور ایک بار قرآن کانفرنس منعقد کی۔تربیت گاہوں میں ان کے جوہر مزید کھلتے۔دوسری تنظیموں کے نمائندہ وفود سے ملاقاتیں بھی ہو رہی ہیں۔اگلی نشست کے لیے ہدایات بھی دی جا رہی ہیں، کھانے کا مینو بھی زیرِ غور ہے ادبی اسٹالز پر بھی نظر ہے، ڈرائیور کے قیام و طعام سے بھی غافل نہیں۔تربیت گاہوں کے دوران جب موقع ملتا، حریم ادب کی نشست بھی منعقد کر لی جاتی۔

کام کو منظّم کرنے اور رہنمائی کے لیے آپ نے ملک گیر دورے بھی کیے۔دوروں سے ہفتوں پہلے پورا پروگرام بنتا، خط و کتابت ہوتی بازار سے نقشے منگواتیں، تنظیمی دورے ہوں یا دعوتی، سرکلر کے ساتھ ہدایات بھی بھجواتیں،''کھانے پینے میں سادگی رکھی جائے، ایک سے زیادہ سالن نہ بنائے جائیں'' سڑکوں کا روٹ دیکھا جاتا۔ایک ایک منٹ کا پروگرام طے کر کے نکلا جاتا۔ نکلنے سے قبل مقامی نظم سے علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والی بچیوں اور خواتین کے نام پتے منگواتیں اور وقفہ کے دوران ادبی مجلس کا انعقاد کرتیں۔جوڑوں کے مرض کے باوجود آپ نے کراچی سے سرحد تک کے دورے کیے۔ٹانگوں میں تکلیف تھی تو پنجاب کا سارا سفر بذریعہ کار کیا۔سیالکوٹ سے گوجرانوالہ، وزیرآباد، گجرات، لالہ موسیٰ، جہلم، پنڈی اور پھر وہاں سے سرحد کا دورہ۔واپس لاہور آ کر وہاں سے اوکاڑہ، ساہیوال، چیچہ وطنی، جہانیاں، بہاولپور، رحیم یار خان، ڈیرہ غازی خان اور لیہ کا دورہ مکمل کیا۔اس ایک ماہ کے طویل دورے میں ہر جگہ تسلی سے ملاقاتیں کر کے کام سکھانے کی سعی کی گئی۔

سابقہ نگراں صفحہ خواتین روزنامہ ''جسارت'' عطیہ اقبال زیدی ان کا انٹرویو لینے گئیں تو پھر

کبھی نہ ٹوٹنے والے رشتہ میں بندھ گئیں۔ کہتی ہیں کہ ’’ مجھے ہمیشہ ان کے خطوط سے یہ احساس ہوا کہ وہ مجھے بہت زیادہ چاہتی ہیں ۔ مجھے ان جیسا کسی نے نہیں سمجھا۔‘‘ انھیں اِقامت دین کے کام میں نظریاتی محاذ پر قلمکاروں کی کھیپ تیار کرنے سے ایسی دلچسپی تھی کہ ان کے دور کی ہر لڑکی شاید یہی کہے کہ وہ سب سے زیادہ مجھ ہی سے وابستہ تھیں۔ وہ ملکی و بین الاقوامی سطح پر خواتین سے متعلقہ واقعات ونظریات کا سنجیدگی سے نوٹس لے کر مرکزی قیمّہ کی حیثیت سے توجہ طلب نکات کو نیچے تک اُتارتیں اور جہاں ضرورت ہوتی، مہم کی صورت میں مضامین، اداریے، قراردادیں اور خطوط کا اہتمام کرواتیں ۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ تھیں، انتہائی متحرک، ان کا جاندار اندازِ تحریر انسان کے اندر ایک الارم بجا دیتا۔

قانتہ رابعہ گواہی دیتی ہیں کہ نوجوان، دین دار لڑکیاں ان کے نزدیک سب سے قیمتی سرمایہ تھیں۔ لہٰذا وہ ان پر خاص توجہ رکھتی تھیں۔ ایک جملے سے وہ مخاطب کی ذہنی سطح کو جانچ لیتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ ایسی ماہر نفسیات ہیں جو چہرہ دیکھ کر مخاطب کے مسئلوں کو سلجھا سکتی ہوں ۔ میں ان سے ملنے سیالکوٹ گئی تو میرے اعزاز میں خاص پروگرام رکھا حالانکہ میرے اندر کوئی خاصیت نہ تھی پھر بھی مجھے کہتیں کہ تمہارا شکریہ کہ تم نے وقت نکالا۔ تم آئیں ۔ مجھے نہیں یاد کہ انھوں نے کبھی مجھے تحفے کے بغیر رُخصت کیا ہو۔ عید کی مبارکباد بھی ہمیشہ دیتیں، چاہے چند سطریں ہی لکھیں۔ اپنی وہ تحریریں جنہیں پڑھ کر مجھے ہنسی آتی ہے، ان تحریروں پر میں نے ان کے تعریفی کلمات وصول کیے۔ ایک حقیر ذرّے کو آفتاب خراج تحسین پیش کر سکتا ہے؟ انھوں نے یہ کام کیا اور پورے سچّے دل سے کیا۔ وہ کام لینے کا ڈھنگ جانتی تھیں، نظر شناس تھیں، بے مقصد زندگی گزارنے والوں کو تراش خراش کر خدا شناس انسان بنا دینے کے فن سے واقف تھیں ۔ یہ تڑپ انہیں مسلسل سرگرم سفر رکھتی۔

نوجوانوں پر توجہ:

جواہر کی تلاش میں نوجوان بچیوں پر ان کی خصوصی توجہ ہوتی۔ عمر کے تفاوت کے باوجود ان سے جلد ہی دوستی استوار کر لیتیں۔ ان کی ہر چھوٹی بڑی کاوش کی قدردانی کرتیں۔ کوئی چار سطروں کا خط بھی بھیج دیتا تو اسے جواب ضرور دیتیں۔ قدردانی اور حوصلہ افزائی کے ذریعہ انہیں

تحریک میں آگے بڑھاتی رہیں ۔ ایسی ہی ایک کارکن شمیم فرحت بیان کرتی ہیں ’’انھوں نے بچوں کی طرح انگلی پکڑ کر مجھے قدم بقدم چلایا۔ مجھے اجتماعات میں ساتھ لے کر جاتیں، درس قرآن، خود دیتیں، مجھے درس حدیث دینے کا کہتیں، تلفّظ کی بھی اصلاح کرتیں۔ وہ مشورے بھی دیتیں، حوصلہ افزائی بھی کرتیں اور جہاں ضرورت ہوتی وہاں مدد بھی کرتیں۔

بہن زبیدہ خاتون بتاتی ہیں کہ جیسے ہی میں جمعیت طالبات سے فارغ ہوئی مجھے آپا نیر بانو نے ملاقات کے لیے بلایا اور پہلی ملاقات کے بعد ہی کُل پاکستان دورے پر اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ میں اگرچہ جماعت میں شامل ہونا نہیں چاہتی تھی لیکن ان کے لحاظ میں دورے پر ساتھ چلنے کی حامی بھر لی۔ سیالکوٹ سے دورے کا آغاز ہوا۔ آپا جی کی ٹانگوں میں تکلیف تھی اور وہ چھڑی کے سہارے چلتی تھیں۔ پنجاب کا سارا سفر ہم نے بذریعہ کار کیا۔ ہم سیالکوٹ سے گوجرانوالہ، وزیرآباد، گجرات، لالہ موسیٰ، جہلم اور پھر پنڈی پہنچے۔ یہاں چند دن مقیم رہنے کے بعد سرحد کا دورہ کیا۔ پشاور، کوہاٹ اور ہنگو کے دورے کے بعد ہم لاہور پہنچے اور وہاں سے جنوبی پنجاب کا دورہ شروع ہوا جس میں قصور، اوکاڑہ، ساہیوال، چیچہ وطنی، ملتان، جہانیاں، بہاولپور، رحیم یار خان، ڈیرہ غازی خان اور لیّہ شامل تھے۔ ہر جگہ وہ مجھے درسِ قرآن دینے کے لیے کہتیں اور اس کے بعد خود رجسٹر اور قلم لے کر بیٹھ جاتیں اور ہر کارکن کا نام، دیگر کوائف اور تحریک کے لیے کیے جانے والے کاموں کو اس میں درج کرتیں۔ میں اگرچہ بالکُل نیا فرد تھی لیکن ان کی اس حوصلہ افزائی نے مجھے بے حد اعتماد عطا کیا۔ بعد میں انھوں نے مجھے شوریٰ کے اجلاس کی کارروائی لکھنے کی ذمہ داری بھی سونپ دی اور میں ان کی محبت کے آگے اس طرح ڈھیر ہوئی کہ تحریک میں ضم ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ۱۹۸۳ء میں رُکنیت کا حلف اُٹھا لیا۔

ان کا انداز تربیت حکیمانہ تھا۔ جہانیاں کے دورے میں وہاں کے کسی فرد نے ہم دورہ کرنے والے چار افراد کو بہت خوبصورت بیڈ شیٹس تحفے میں دیں۔ جب ہم واپس لاہور پہنچے تو آپا جان مجھ سے کہنے لگیں کہ ’’ہمارا طریقہ کار تو یہ ہے کہ ہم تحفہ میں ملنے والی چیزیں بیت المال میں جمع کروا دیتے ہیں ویسے اگر تم یہ بیڈ شیٹ لینا چاہو تو لے سکتی ہو۔‘‘ اس پر میں نے کہا کہ جب آپ لوگ نہیں رکھ رہے تو میں کیوں رکھوں آپ اسے بھی بیت المال میں جمع کروا دیں۔

میں مہینے میں ایک بار سیالکوٹ ان کے پاس جا کر رہتی اور جب واپس آنے لگتی تو وہ میرے منع کرنے کے باوجود مجھے کچھ پیسے ضرور دیتیں۔ الحمدللہ آپا جی کی محبت نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔

منتخب شوریٰ کا قیام:

اب تک حلقہ خواتین کی شوریٰ میں ارکان نامزد کیے جاتے تھے، لیکن انہوں نے پہلی مرتبہ شوریٰ کے لیے ارکانِ جماعت کے درمیان انتخاب کروایا۔ شوریٰ کے اجلاسوں کو بے حد اہمیت دیتیں اور ارکان شوریٰ کو بھرپور تیاری کے ساتھ آنے کی تاکید کرتیں۔ ہر ایک کو دل کی بات کہنے پر ابھارتیں۔ بعض مرتبہ ان کی رائے کے برخلاف آراء بھی سامنے آتیں۔ انہیں تحمل سے برداشت کرتیں۔ کوئی اہم بات لکھوانے سے پیشتر سب کی بار بار رائے لیتیں۔ پھر جچے تلے انداز میں کارروائی کے الفاظ املا کروا دیتیں۔ واپس اپنے مقام پر جا کر اس کارروائی کی نوک پلک کو درست کر کے دوبارہ تحریر کر کے جاری کیا جاتا۔

المحصنات کی تعمیر:

آپا حمیدہ بیگم کے زمانے سے ہی منصورہ میں خواتین مرکز کے قیام کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ قیمّہ بننے کے بعد ۱۹۸۲ء میں جب پہلی شوریٰ کا اجلاس منعقد کیا گیا تو یہ تجویز سامنے آئی کہ مرکز خواتین کا سنگِ بنیاد رکھا جائے۔ انہوں نے تعمیر مرکز فنڈ کی رسید بکس چھپوالیں اور فنڈ جمع کرنے کا آغاز ہوا۔ جب یہ رقم دو لاکھ روپے تک پہنچ گئی تو امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد صاحب سے مرکز خواتین کا سنگِ بنیاد رکھنے کی درخواست کی گئی، مسعود خاں صاحب ناظم مالیات کو تعمیر کا نگراں مقرر کیا گیا اور ۲۰، ۲۱ ستمبر ۱۹۸۴ء کو مرکزی شوریٰ کے اجلاس کے بعد ۲۲ ستمبر ۱۹۸۴ء کو امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد صاحب نے اپنے دست مبارک سے مرکز خواتین کا سنگ بنیاد رکھا۔ تقریباً پچاس خواتین اس موقع پر جمع تھیں جنہوں نے رو رو کر اس کی تکمیل کی دعائیں کیں اور بعد میں اپنے زیورات اور رقومات اس کی تعمیر کے لیے وقف کیں۔ آپا نیر بانو نے خود اپنی ضروریات کے مطابق اس عمارت کا نقشہ تیار کیا، یوں ان کے اندر موجود نقشہ ساز کی خوبی بھی ابھر کر سامنے آئی، جزئیات تک پر ان کی نظر ہوتی تھی۔ وہ ہدایت دیتیں کہ بزرگوں کے کمرے ابتدا میں بنائے جائیں تاکہ انہیں زیادہ چلنا نہ پڑے۔

سیڑھیوں پر ریلنگ ضرور ہو، تاکہ بچے گر نہ سکیں۔ صحن اندر کی جانب ہو، تاکہ خواتین کی آوازیں باہر نہ جائیں۔ سیالکوٹ واپس جانے کے بعد بھی وہ مستقل اس کی تعمیر کے مراحل سے واقف رہتیں اور ہر قدم پر اپنے مشوروں سے نوازتیں یہاں تک کہ تعمیر مکمل ہوئی اور ارکانِ شوریٰ کے تجویز کردہ ناموں میں سے کراچی کے اراکین کی جانب سے بھیجا گیا نام ''المحصنات'' سب کو پسند آیا اور آج یہ عمارت اپنے عظیم مقاصد کے حصول کی خاطر منصورہ میں سر اٹھائے کھڑی ہے۔

پرعزم، تیز دم:

انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے اپنا قائد ہونا ثابت کیا۔ ۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ میں بے خوف ہو کر خواتین کا جلوس لے کر باہر نکلتیں اور خود سب سے آگے کھڑی ہوتیں۔ جب تمام سیاسی جماعتوں نے مل کر ''قومی اتحاد'' تشکیل دیا تو سیالکوٹ میں متفقہ طور پر سب نے اُن کو خواتین ونگ کی صدر بنایا۔ ان کا وژن بہت وسیع تھا۔ وہ تحریک کا پھیلاؤ چاہتی تھیں۔ معاشرے کے مؤثر طبقات میں نفوذ کا منصوبہ ان کے ذہن میں تھا۔ وہ اس وقت ''این جی اوز'' کے اگلی نسلوں پر اثرات کی بات کرتی تھیں۔ جب لوگ انہیں صرف خدمتِ خلق کی تنظیمیں سمجھتے تھے۔

انتہائی مضبوط اعصاب کی مالک تھیں۔ ایک دفعہ اجلاس شوریٰ میں ان کے بھائی کی وفات کی خبر آئی۔ وہ انتہائی صبر وضبط سے شوریٰ کی کارروائی چلاتی رہیں۔ کچھ دیر بعد کہا۔ آپ لوگ تھوڑی دیر مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ سب کے باہر جانے کے بعد کمرہ بند کر لیا اور آدھے گھنٹے بعد دوبارہ کھول دیا اور اجلاس پھر سے شروع ہو گیا۔

الحبّ للہ:

اللہ کی خاطر اس تحریک میں شمولیت اختیار کرنے والی ہر بہن سے انہیں دلی لگاؤ تھا۔ محبت ان کا سب سے بڑا ہتھیار تھی۔ موقع کی مناسبت سے ایسا جملہ بولتیں کہ لوحِ دل پر چسپاں ہو جاتا۔ قانتہ رابعہ ان کے ساتھ کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ ''وہ میرے لیے ہی ماں نہیں، ہر ایک کی ماں جیسی تھیں۔ ایسی ماہرِ نفسیات تھیں جو چہرہ پڑھ کر مخاطب کے مسائل بتا سکتی تھیں۔ اپنے زمانہ کی ماہر نبض شناس ادیبہ تھیں لیکن ایک لڑکی کے معمولی خطوط کا بھی دو سطروں میں جواب ضرور دیتی تھیں۔

ایک اور تحریکی بہن ناصرہ زبیران کے بارے میں لکھتی ہیں کہ جب وہ دورے پر جہانیاں آئیں تو مجھے کم کھانا کھاتا دیکھ کر اس کی وجہ پوچھی۔ جب میں نے پیٹ کی خرابی کا مسئلہ بتایا تو پیار سے سمجھایا کہ صحت کا خیال نہ رکھنا بھی اللہ کی ناشکری ہے۔ صحت کا خیال نہ رکھو گی تو دین کا کام کیسے کرو گی؟ دن میں پانچ دفعہ نماز کے بعد ٹھنڈے دودھ کے دو تین چمچ پی لیا کرو۔ پیٹ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں حیران تھی کے اتنی بڑی شخصیت اور مجھ ایک عام سی کارکن پر اتنی شفقت کا اظہار؟ ہماری دوستی پکی ہوگئی۔ انہوں نے سمجھایا کہ ''عورت کی زندگی محنت، مشقت اور قربانیوں کی زندگی ہے۔ یہی عورت کی خوشبو اور پہچان ہے۔ اس طرح جنت کے پاسپورٹ اور ٹکٹ کی قیمت بنتی ہے''۔ باہمی تعلقات کی اہمیت سمجھاتے ہوئے کہتی تھیں کہ ''فرد کو فرد سے درس قرآن کا رابطہ نہیں بلکہ انفرادی رابطہ جوڑتا ہے''۔

۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۷ء تک قیمہ کی ذمہ داری نبھائی اور ہر لحظہ ایک فوجی کی مانند منظم انداز میں مصروف کار رہیں۔ گزرتے شب و روز قویٰ کو کمزور کر چلے تھے۔ تحریکی بہن کو خط میں تحریر کیا کہ ''دل تو چاہتا ہے کہ دن رات کام کروں۔ میرے پاس قلم ہی تو ہے یہی میرا سرمایہ ہے، مگر کیا کروں آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ سر دکھنے لگتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ تیل ایک دن ختم ہو جائے گا۔ یہ قلم آپ ہی میں سے کسی کو سنبھالنا پڑے گا''۔ نومبر ۱۹۹۸ء میں جب قمر جلیل صاحبہ کو جو آپ کی نائب تھیں، قیّمہ مقرر کیا گیا تو بہت اطمینان کا اظہار کیا۔ ذمہ داری منتخب قیمہ کو منتقل کرتے ہوئے کارکن بہنوں سے کہا کہ ''جس طرح رت بدلتی ہے کبھی گلاب مہکتا ہے، کبھی موتیا کھلتا ہے اسی طرح آج آپ کا نظم تبدیل ہو رہا ہے''۔

ذمہ داری کی منتقلی کے بعد بھی ایک مستعد سپاہی کی طرح اپنی ڈیوٹی انجام دیتی رہیں۔ ۱۱ر جون ۱۹۸۸ء کی ڈائری میں ششماہی رپورٹ درج ہے جس کے مطابق ۱۶۲ر خطوط ارسال کیے، ۲ مضامین لکھے، ۱۳ر افسانے زیرِ تحریر رہے، ۷ سوالات کے جواب لکھے، تین ہفتہ وار اجتماعات اور بارہ ماہانہ اجتماعات میں شرکت کی، ۹ طالبات کو قرآن پڑھایا۔

اختتامِ سفر:

بڑھتی عمر کے ساتھ جوڑوں کے درد کی تکلیف بڑھتی گئی۔ یادداشت بھی ساتھ چھوڑ نے

لگی۔ لیکن قرآن پوری طرح یاد تھا۔ درس کی محفل میں بیٹھتیں اور کوئی غلطی کرتا تو فوراً اصلاح کر دیتیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک جانے میں بھی کافی وقت لگتا تھا۔ واکر کا سہارا لیتیں لیکن کبھی ماتھے پر شکن نہ دیکھی نہ کبھی منہ سے تکلیف کا اظہار کیا۔ جب احوال پوچھا جاتا تو اللہ کا شکر ادا کرتیں۔

آخر وقت میں ہر وقت زبان پر رب اغفر وارحم وانت خیر الرحمین کا کلمہ رہتا۔ جو تھوڑا بہت زیور تھا، وہ تیس سال پہلے دونوں بیٹیوں اور بہوؤں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہاتھ کی بنائی ہوئی چار پائیاں، نماز کی چوکی وغیرہ خود ہی اپنی درس کی بہنوں میں بانٹ دیں۔ وراثت میں چند جوڑوں، سوئیٹر، چادر، کتابیں، ڈائریاں اور خطوط کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اپنی ذات میں ایک ادارہ کی حیثیت رکھنے والی یہ صاحب جمال و جلال بندی تقریباً ایک صدی کا سفر گزار کر ۴ دسمبر ۲۰۰۹ء کو اپنے رب سے جا ملی۔

جو ایک صدی کرتا رہا دیں کو درخشاں
لو ڈوب گیا آج وہی نیر تاباں

ان کی شخصیت ایک انوکھی شخصیت تھی جس میں تہذیبی رچاؤ تھا۔ حسن اخلاق کا سبھاؤ تھا۔ اپنے مقصد پر جماؤ تھا۔ اللہ کی معرفت اور دین الٰہی کی علمداری تھی رسول اللہؐ سے محبت اور خلقِ خدا کی خیر خواہی تھی۔ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی تیاری کی فکر تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی ساری سعی و جہد کو قبول فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

ماخذات

۱۔ صبیحہ شاہد صاحبہ۔ سابقہ معتمدہ عام حلقہ خواتین
۲۔ زبیدہ خاتون صاحبہ۔ رکن جماعت اسلامی
۳۔ ریکارڈ حلقہ خواتین جماعت اسلامی
۴۔ چراغوں کا دھواں۔ از نیر بانو
۵۔ ماہنامہ عفت۔ نیر بانو نمبر۔ ستمبر اکتوبر نومبر ۲۰۱۰ء

محمودہ بیگم (بیگم مودودی)

۱۹۱۴ء تا ۲۰۰۳ء

آپ نہایت منضبط، سلیقہ شعار اور سگھڑ خاتون تھیں۔ بہت نفاست پسند، صفائی پسند اور پاکیزہ صحت......آپ نے اپنے اوقات کو مولانا کے اوقات کے ساتھ منضبط کر لیا تھا۔ مولانا کا کام ان کی گھڑی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد جب ٹوپی رکھنے اندر آتے تو وہ ہاتھ میں چائے کا کپ لیے کھڑی ہوتی تھیں۔ لمحہ بھر کی تاخیر اس میں نہیں ہوسکتی تھی۔ کیونکہ باہر عصری مجلس شروع ہونی ہوتی تھی۔ صبح آٹھ بجے ناشتے کے بعد پان بنا کر دینا اور دن بھر کے پانوں کا کوٹہ ڈبیا میں ڈال کر دینا، وقت پر کھانا تیار کر کے رکھنا، جس کے باعث آپ اجتماع سے صحیح وقت پر اٹھ جاتیں کہ مولانا کے کھانے کو دیر نہ ہو۔

۱۱ رمئی ۱۹۵۳ء کی صبح تھی ۔ایک پُر وقار خاتون اسکول جانے والے بچّوں کا ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں کہ باہر سے بڑا بچّہ اخبار ہاتھ میں لے کر آیا اور بے چینی سے والدہ کی توجہ اس کی سرخی کی جانب دلائی ۔اخبار کی سرخی دیکھتے ہی ان خاتون کا چہرہ زرد پڑ گیا،لیکن اگلے ہی لمحہ وہ اخبار چھپا کر پھر سے ناشتہ بنانے میں مصروف ہوچکی تھیں ۔بچّوں کو ناشتہ کروا کے اسکول بھیجا۔ابھی بچّے باہر نکلے ہی تھے کہ بازار میں آواز لگاتے ہاکر کی طرف توجہ مبذول ہوگئی ۔’’حکومت نے مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنادی‘‘ اب بچّوں کی سمجھ آیا کہ والدہ کا چہرہ زرد کیوں پڑ گیا تھا۔ بیٹا تو گھر واپس آ گیا لیکن بیٹیاں اسکول پہنچ گئیں ۔جب اسکول کی مسیحی پرنسپل نے اسمبلی میں دونوں بچّیوں کو موجود دیکھا تو جوش سے تقریر کرتے ہوئے کہا’’ دیکھو ایسے ہوتے ہیں رہنما‘‘ ۔شاباش اس ماں کو ہے، جس نے ایسے دن اور ایسے موقع پر بھی اپنی بچّیوں کو صاف ستھرے کپڑے پہنا کر، کھلا پلا کر اسکول روانہ کردیا ہے۔ یہ ان کی ماں کی عظمت ہے کہ انھوں نے آج بھی بچّیوں کی تعلیم کو ضروری جانا‘‘۔
غیر معمولی حالات کا غیر معمولی عزم کے ساتھ مقابلہ کرنے والی یہ خاتون محمودہ بیگم صاحبہ تھیں جنہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی زندگی کا ہمسفر بننے کا شرف حاصل ہوا اور جنہوں نے اس شرف کو اس طرح نبھایا کہ شوہر محترم نے اعتراف کیا کہ’’ جب لوگ نعرے لگاتے ہیں مولانا مودودی ۔ زندہ باد، جماعت اسلامی زندہ باد۔تو میں دل میں نعرہ لگاتا ہوں ۔محمودہ بیگم۔ زندہ باد‘‘ حقیقت یہی ہے کہ وہی تیر نشانے پر لگتے ہیں جن کے پیچھے مضبوط ،متوازن اور تنی ہوئی کمان موجود ہو۔
محمودہ بیگم نے اپنے والد کے اس قول کو جو انہوں نے شادی سے قبل مولانا مودودی کے نام خط میں تحریر کیا تھا کہ’’ ہماری بیٹی محل میں بھی تمھارا ساتھ دے گی اور جھونپڑی میں بھی۔‘‘ اس طرح نبھایا کہ اپنی ذات کی کڑی کو مولانا اور ان کے مقصدِ عظیم کے درمیان میں لانے کے بجائے ان کی پشت پر لا کر پشتے کو مضبوط بنائے رکھا۔اٹھارہ سال کی عمر میں شادی ہوتے ہی انہوں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ ان کی شادی ایک بلند مقاصد رکھنے والے فرد کے ساتھ ہوئی ہے اور ان مقاصد کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جب آپ اسے ہر دنیاوی فکر اور جھمیلے سے بے نیاز کردیں ۔شوہر سے بھی محبت کی اور اس کے مشن سے بھی اور خود اپنی ذات کو انجمن بنا کر نو بیٹے بیٹیوں کو ماں کے ساتھ ساتھ باپ بن کر بھی پالا اور مولانا کو وہ ذہنی سکون اور آسودگی فراہم

کی جس کے باعث دنیا ان کی عظیم تخلیقات اور قیادت و رہنمائی سے فیضیاب ہوسکی۔

ابتدائی تعارف:

محمودہ بیگم کے آبا و اجداد شاہجہاں بادشاہ کے دور میں بخارا سے نقل مکانی کر کے دلّی میں آئے تھے، بادشاہ نے انھیں جامع مسجد دہلی کی امامت کے لیے یہاں آنے کی دعوت دی تھی ۔
۱۹۱۴ء میں دہلی کے ایک متّقی گھرانے میں آنکھ کھولنے والی محمودہ بیگم نے ابتدائی تعلیم کوئین میری اسکول میں حاصل کی ۔تحریکِ خلافت کے زمانے میں اور مسلمانوں کی طرح ان کے والد نے بھی انھیں اس اسکول سے نکال کر مڈل اور منشی فاضل تک گھر پر تعلیم دلائی۔ ان کے ماموں جو اورینٹل کالج کے پروفیسر تھے، انھیں فارسی پڑھانے گھر آتے تھے جس کے باعث فارسی پر خوب دسترس حاصل ہوگئی۔ بارہ برس کی عمر میں انھوں نے خواب میں دیکھا کہ انھوں نے ساحل کی ریت پر پاؤں رکھ کر اوپر سے مٹّی ڈال کر ایک گھروندا بنایا ہے اور جب پاؤں باہر کھینچ کر اس گھروندے کے اندر ہاتھ ڈالا تو ایک بڑا چمکدار ہیرا ہاتھ میں آیا۔لوگ پوچھنے لگے یہ ہیرا تو بہت قیمتی ہے تمھیں کہاں سے ملا؟ صبح خواب اپنے والدین کو سنایا تو والد ایک عالم دین سے اس کی تعبیر پوچھنے کے لیے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ اس لڑکی کی شادی ایک بڑے عالم دین سے ہوگی جس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلے گی۔مولانا کے خاندان کی ان کے خاندان سے رشتہ داری تھی۔ جب ان کی والدہ رشتہ لے کر گئیں تو اسے خوشی سے قبول کرلیا گیا۔اس وقت تک مولانا مودودی اپنے کام کا آغاز کر چکے تھے، لیکن محمودہ صاحبہ نے اب تک آپ کی کسی تحریر کا مطالعہ نہیں کیا تھا اور مولانا کے تخیّل کے برعکس ایک ماڈرن زندگی گزار رہی تھیں ۔ جس پر مولانا کی والدہ نے ان کی توجہ بھی دلائی تھی کہ لڑکی تمھارے معیار سے مختلف اور جدید طرزِ زندگی کی راہ پر ہے۔تمہارا اس کے ساتھ گزارا ہوجائے گا؟ اس پر مولانا نے کہا کہ’’ اگر میں ایک نوعمر لڑکی کے خیالات بھی تبدیل نہیں کرسکتا تو مجھے یہ کام چھوڑ دینا چاہیے۔۱۵/مارچ ۱۹۳۷ء کو دہلی میں یہ شادی انجام پائی ۔مہر کی رقم دو ہزار قرار پائی۔ بری میں ایک ساڑھی اور انگوٹھی آئی۔شادی کے بعد آپ نے گہرے علم و شعور کے ساتھ اپنے سابقہ نظریات کو خیرباد کہا۔ خود کہتی تھیں کہ’’ مولانا مودودی نے جبراً نہیں بلکہ حقیقتاً اپنی فہم و فراست اور جہاں بینی سے میرے دل میں گھر کرلیا۔‘‘ عادات و خصائل میں بچپن کی اعلیٰ معاشرت کے گہرے اثرات

موجود تھے، دینی نظریات اختیار کرنے سے سونے پر سہاگہ والی کیفیت ہوگئی۔

صبر واستقامت:

محمودہ بیگم آہستہ آہستہ اپنے شوہر کے رنگ میں رنگتی چلی گئیں اور خود اس راہ کی راہی بن گئیں۔ شادی کو کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ جماعت اسلامی نے پٹھان کوٹ کے علاقے کو دارالاسلام کا نام دے کر اپنا مرکز بنا لیا۔ یہ جموں کے پہاڑی سلسلہ کے اختتام پر پنجاب کا ایک دور دراز مقام تھا جہاں شہروں جیسی کوئی سہولت میسّر نہ تھی۔ نہ بجلی کے قمقمے تھے اور نہ پانی کے لیے نلکے لگے ہوئے تھے۔ سیدھا سادا سا گھر تھا جہاں چھوٹے بچّوں کے ساتھ گزارا کرنا تھا۔ ہمیشہ اپنے والد کے قول کو ذہن میں دہراتیں اور اس سے عزم وتقویت حاصل کرتیں اس امتحان سے بخوشی گزر گئیں۔ کچھ ہی عرصے بعد قیام پاکستان کا مرحلہ پیش آیا اور آپ کو وہاں سے لاہور منتقل ہونا پڑا۔ یہاں خیموں میں بھی رہائش رہی اور چھوٹے بڑے گھروں میں بھی تا آنکہ ایک گھر مستقل ٹھکانہ قرار پایا۔

ان دنوں جماعت اسلامی آنے والے مہاجرین کی بحالی میں مصروف کار تھی۔ سکھوں سے بازیاب کی گئی لٹی پٹی لڑکیاں کیمپوں میں پہنچا کرتی تھیں۔ ان کے جسموں کے ساتھ ساتھ ان کی روحیں بھی زخمی تھیں۔ ان کی خبر گیری کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تسلی و دلجوئی کی بھی کوشش کیا کرتیں، ساتھ ساتھ ایسی لڑکیوں کے نکاح کروانے کے لیے بھی کوشاں رہتیں۔ مہاجرین کے زخموں سے بے خبر حکومت کے کچھ لوگ پاکستان کے قائم ہوتے ہی اسے سیکولر ریاست بنانے کے لیے کوشاں تھی۔ قائداعظم کے انتقال کے بعد مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی بھرپور مخالفت نے اسے حکومت کا اوّلین ہدف بنا دیا اور جلد ہی مولانا کی گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ پہلی گرفتاری ۴/اکتوبر ۱۹۴۸ء کو سیفٹی ایکٹ کے تحت ۶ ماہ کے لیے عمل میں آئی، جس کے بعد یہ سلسلہ مختلف وقفوں سے دہرایا جاتا رہا۔ محمودہ بیگم کے لیے یہ امتحان کا دوسرا مرحلہ تھا جسے چھوٹے چھوٹے بچّوں کے ساتھ پاس کرنا تھا۔ ایسے ہر موقع پر وہ کثرت سے **یا حیّ یا قیّوم برحمتک استغیث** کا ورد جاری رکھتیں۔ ایسے مواقع پہ اوّلین ترجیح بچّوں کی تعلیم کا جاری رہنا ہوتا، جس کے لیے اپنے زیورات کا کچھ حصّہ فروخت کر کے کام چلاتیں۔ تمام ملازمین کو چھٹی دے کر گھر کا ہر کام خود کرنے لگتیں، اگرچہ کہ خود دمہ کی مریضہ تھیں۔ لیکن اس حال میں بھی خودداری کے اعلیٰ مقام پر فائز رہتیں۔ ایک مرتبہ شام کے وقت گھر میں آٹا ختم

ہوگیا اور آٹا پیسنے کی چکّی بھی بند ہوچکی تھی تو ملازمہ پڑوس سے آٹا ادھار مانگ لائی کہ جب ہمارا آٹا پس کر آجائے گا تو واپس کر دیں گے تو اس پر خفا ہوئیں کہ ہم یہ نہیں کر سکتے۔ اگر گھر پر آٹا نہیں تھا تو ہم کھچڑی پکا لیتے، روکھی سوکھی کھا لیتے مگر تمھیں ادھار مانگنے نہیں جانا چاہیے تھا۔

بہترین رفیقہ:

نہایت منضبط، سلیقہ شعار اور سگھڑ خاتون تھیں۔ بہت نفاست پسند، صفائی پسند اور پاکیزہ صفت۔ لباس ساڑھی تھا جس کے بلاؤز کی آستینیں کف والی کلائیوں تک ہوتیں، سر ہمیشہ پلّو سے ڈھکا رہتا۔ لوگ ان سے پوچھتے کہ کام کے وقت ساڑھی کو کیسے سنبھالتی ہیں؟ اور وہ ان سے پوچھتیں کہ آپ دوپٹہ کیسے سنبھالتی ہیں؟ اپنے اوقات کو مولانا کے اوقات کے ساتھ منضبط کر لیا تھا۔ مولانا کا کام ان کی گھڑی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد جب ٹوپی رکھنے اندر آتے تو وہ ہاتھ میں چائے کا کپ لیے کھڑی ہوتی تھیں۔ لمحہ بھر کی تاخیر اس میں نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ باہر عصری مجلس شروع ہونی ہوتی تھی۔ صبح آٹھ بجے ناشتے کے بعد پان بنا کر دینا اور دن بھر کے پانوں کا کوٹہ ڈبیہ میں ڈال کر دینا۔ وقت پر کھانا تیار کر کے رکھنا جس کے باعث اجتماع سے صحیح وقت پر اٹھ جاتیں کہ مولانا کے کھانے کو دیر نہ ہو۔

بچوں کی تربیت:

بچّوں کی تربیت بھی اسی انداز میں کی کہ ہر سرد وگرم حالات میں گزارا کر سکیں۔ عید، بقرعید یا شادیوں پر نئے کپڑے بنانے کا رواج نہیں ڈالا۔ بچّوں کو سمجھا دیا تھا کہ رمضان میں زکوٰۃ دینی ہوتی ہے، اس لیے عیدالفطر پر کپڑے نہیں بنائے جاسکتے۔ بقرعید پر قربانی کرنی ہوتی ہے اس لیے نئے کپڑوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑے پہن کر نماز پڑھنے چلے جاؤ۔ بچّوں کو سمجھاتی تھیں کہ اپنے مطالبات سے والد کو تنگ نہیں کیا کرو، اگر ایسا کرو گے تو وہ کتابیں نہیں لکھ سکیں گے۔ وہ ایک مصنف ومحقق ہیں، ان کو خاموشی، سکون اور اطمینان کی ضرورت ہے لہٰذا اپنے مطالبات اور فرمائشوں سے انہیں الجھایا نہ کرو۔ مولانا کی گرفتاریوں پر سکون کے ساتھ بچّوں کو لے کر بیٹھی رہتیں۔ لوگ سوال کرتے تھے کہ وہ کون سی روحانی طاقت ہے جس کے باعث یہ سب برداشت کر لیتی ہیں۔ تو جواب دیتی تھیں کہ ''اللہ کی ذات پر ایمان، توکّل

اور صبر، وہ صفات ہیں جن کی مدد سے انسان مشکل ترین حالات سے بخیر وخوبی گزر سکتا ہے‘‘۔

ایک طرف مولانا کے قدر دان اور چاہنے والے تھے تو دوسری طرف ان کے مخالفین کی تعداد بھی بہت تھی۔ ہر فرد، طبقہ اور گروہ جس کے مفادات پر مولانا کی تحریروں سے زد پڑتی تھی ان کے خلاف ہو جاتا۔ بچّے تعلیمی اداروں میں اور گھر سے باہر مخالفین کی تلخ باتیں سن کر دل شکستہ ہو جاتے تو انھیں نصیحت کرتیں کہ ’’اپنے آپ کو صبر کا پہاڑ بنالو جس سے بڑے بڑے طوفان آ کر ٹکراتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ ویسے ہی کھڑا رہتا ہے۔ خود کو سمندر بنالو جس میں بڑے بڑے دریا آ کر گرتے ہیں مگر وہ اپنے کناروں میں سمویا رہتا ہے اور کبھی اپنے کنارے توڑ کر باہر نہیں نکلتا ہے۔ اگر پڑھنا ہے تو اِن ہی حالات میں اِن ہی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھو، ورنہ جاہل رہ جاؤ گے‘‘ وہ گہری دانائی جو انہیں مولانا کی رفاقت نے عطا کی تھی اسے اپنے بچّوں میں بھی منتقل کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ سمجھایا کرتی تھیں کہ یقین کرو۔ ساری دولت، مادّی طاقت، سارا حسن و جمال اور کمال تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ باہر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ بہت سے لوگ جو یہ چیزیں باہر تلاش کرتے ہیں وہ اندر سے بڑے مفلس، بہت کمزور اور کریہہ المنظر ہوتے ہیں اسی لیے تو انھیں یہ چیزیں باہر تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ ’’خود انھوں نے کبھی مادّی اشیا کی طلب کی نہ آرائش و زیبائش کے لیے میک اَپ کا سہارا لیا۔ ان کی شخصیت کا وقار ہی ان کی آرائش وزیبائش تھا۔

کارکنان کی تربیت:

دیگر گرفتار ہونے والوں کے گھر جاتیں اور انھیں صبر وسکون کی تلقین کرتیں۔ مرکز کی خواتین رات ان کے گھر میں جمع ہو جاتیں تو انھیں قرآن سناتیں۔ اور کہتیں کہ اگر مار پیٹ، بھوک پیاس برداشت کرنے کی ہمت نہیں تھی تو اس راہ میں کیوں نکلے؟ پٹھان کوٹ کی زندگی کا تذکرہ کرتیں کہ وہاں تو سانپ، بچّھو اور گیدڑ ہوا کرتے تھے مگر وہاں بھی لوگ رہتے تھے۔ یہاں تو وہ مشکل نہیں ہے اور ہم سب اکھٹے بھی ہیں۔ خواتین کو تلقین کرتیں کہ ’’اللہ کے راز کبھی نہ کھولنا۔ کسی سے نہ کہنا کہ آج تم فاقے سے ہو ورنہ اگر کسی کے آگے شکوہ کر دیا تو تمھارا اجر ضائع ہو جائے گا۔ اللہ کا رحم اور اس کا اجر لینے کے لیے زبان بند رکھو۔ حکومت کا بھی شکوہ نہ کرو کہ جیل میں ملنے نہیں دیتے‘‘۔ حقیقت یہ ہے کہ پٹھان کوٹ کی چند سالہ سخت زندگی نے انھیں آئندہ کی ابتلا و آزمائش کے لیے تیار کر دیا تھا۔

ان کا گھر دعوت کا مرکز تھا۔ تمام دن لوگ آتے جاتے رہتے۔ خواتین آ کر بیٹھی رہتیں۔ آپ وقت ملتے ہی حاضر ہو جاتیں۔ روزانہ قرآنی کلاس، ہفتہ وار درس، ماہانہ ادبی نشست، تربیت گاہیں، ناگہانی اور فوری اجتماعات ان ہی کے گھر منعقد ہوا کرتے تھے۔ شروع سے گھر میں جمعہ کا انعقاد کیا جاتا۔ گھر کے سب سے بڑے کمرے میں دری چاندنی کا فرش بچھ جاتا۔ نماز کے بعد درس قرآن وحدیث اور پھر دعا کرائی جاتی۔ عیدین کی نمازیں بھی پڑھی جاتیں اور دعا کے بعد خواتین کو سوّیاں کھلائی جاتیں۔ آپ صبح کے اوقات میں اپنے گھر پہ بھی قرآن کی کلاس رکھتیں جس میں محلے کی خواتین شریک ہوتیں۔

قائدانہ اوصاف:

مسلم ٹاؤن اور ماڈل ٹاؤن مستقل ہفتہ وار حلقے تھے۔ ماڈل ٹاؤن تقریباً ۲۶ سال جاتی رہیں۔ بڑا منضبط پروگرام ہوتا۔ ڈیڑھ گھنٹے مسلسل درسِ قرآن اور پھر سوال جواب۔ درس اتنا معیاری ہوتا تھا کہ خواتین سوال کرتی تھیں کہ آپ کے پاس اتنا علم کیسے ہے؟ تو وہ جواب دیتیں کہ ’’میں نے زندگی ایک ایسے عالمِ دین کے ساتھ گزاری ہے جن کی ایک گھنٹہ کی بات چیت سن کر آدمی کو وہ علم حاصل ہوتا ہے جو لوگوں کو رات رات بھر کتابیں پڑھ کر بھی نہیں ملتا‘‘۔ مولانا کی ذمہ داری نبھانے کے بعد کا وقت تحریک میں لگایا۔ ۱۹۶۴ء کے سالانہ اجتماع میں جب گولیاں چلیں اور خواتین کے کیمپوں میں بھی بوتلیں پھینکی گئیں تو خواتین کو اکٹھا کر کے تسلی دی اور خواتین کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کے بعد وہاں سے نکلیں۔

۱۹۷۷ء میں الیکشن اور بعد میں احتجاجی تحریک کے دوران جلسے بھی کیے اور جلوسوں کی قیادت بھی کی، اس ضمن میں کبھی اصولوں سے سمجھوتا نہ کیا۔ ۱۹۷۷ء کی نظامِ مصطفیٰ تحریک کے جلوس میں ساری جماعتوں کی خاتون سربراہان قیادت کر رہی تھیں جیسے ہی آنسو گیس کے شیل پھینکے گئے اور لاٹھی چارج کیا گیا تو سب خواتین رہنما پیچھے کو بھاگیں لیکن وہ باقی جماعتی ذمّہ دار خواتین کے ساتھ اگلی صفوں میں رہیں اور دیگر خواتین کو بھاگنے سے روک کر بیٹھ جانے کی ہدایت کی۔ اور ہمّت و جرأت کے ساتھ اس وقت کو گزارا۔ جب پمفلٹ قادیانی مسئلہ لکھنے پر مولانا کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور خواتین آپ کے پاس آ کر رونے لگیں تو انھیں ڈانٹا اور کہا

''سزائے موت کا فیصلہ اللہ کی طرف سے تو نہیں ہوا دیکھیں اللہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو مشکلات آئیں وہ مبارک ہوتی ہیں جب راہِ حق میں چلنے کا فیصلہ کیا ہے تو یہ سب اس راستے کے نشان منزل ہیں۔ اوکھلی میں سر دیا ہے تو موصلوں سے کیا ڈرنا؟'' ملاقات کے لیے اپنی بیٹی حمیرا اور بیٹوں کو تیار کر کے بھیجا، خود گھر میں رہیں اور کہا، ہم ان شاءاللہ آخرت میں ملیں گے۔ پورے یقین کے ساتھ کہتی تھیں، ''اگر مولانا محترم کی موت اللہ نے نہیں لکھی تو انہیں کوئی موت نہیں دے سکتا اور اگر ان کی موت اسی طرح لکھی ہے تو کوئی بچا نہیں سکتا، پھر تو طبعی موت سے بہتر شہادت کی موت ہے۔ تم لوگ افسوس اور پریشانی کا اظہار نہ کرو، مجاہد ایسا نہیں کرتے''۔

عزم وحوصلہ:

ساری عمر کی رفاقت کے بعد مولانا کے آخری سفر میں بھی ان کے ہمراہ تھیں جب علاج کے لیے مولانا امریکا اپنے بیٹے کے پاس گئے اور پھر ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء میں انھیں انتقال کے بعد تدفین کے لیے پاکستان لایا گیا۔ یہ المناک خبر لے کر بیٹا جب اسپتال سے فرطِ غم سے نڈھال گھر آیا تو انھوں نے کمال ہمت وحوصلہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساری رات کے جاگے ہوئے، بھوکے پیاسے غمزدہ بیٹے کو چائے بنا کر پلائی، بسکٹ کھلائے اور اپنا غم پسِ پشت ڈال کر بیٹے کو دلاسا دیتے ہوئے کہا ''شکر کرو، تم نے اپنے باپ کو دیکھا، ان کے سامنے اتنی عمر گزاری ورنہ وہ تو ۱۹۵۳ء میں ہی پھانسی چڑھنے کو تیار ہو گئے تھے۔ اگر انہیں پھانسی دے دی گئی ہوتی تو تمھیں یہ یاد بھی نہ ہوتا کہ تمھارے ابّا کی شکل کیسی تھی، ان کی آواز کیسی تھی؟'' سب کو ہدایت کی کہ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھیں اور باتیں نہ کریں۔ مولانا کے جسد خاکی کو پہلے نیویارک پہنچایا گیا جہاں ائیرپورٹ پر بہت سے مرد وخواتین جنازے میں شرکت کے لیے جمع ہو گئے۔ کچھ پاکستانی خواتین آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگیں کہ میّت پتا نہیں ابھی پہنچی ہے یا نہیں؟ تو انھوں نے خود اطلاع دی کہ ''میّت پہنچ چکی ہے''۔ خواتین کے پوچھنے پر بتایا کہ ''میں ان کی بیوی ہوں اور ان کے ہمراہ آئی ہوں۔'' ساری خواتین نے ان سے تعزیت کی اور صبر وحوصلہ کی دولت حاصل کی۔ لاہور پہنچ کر اپنے بچّوں کو بھی صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ ''ان کے لیے نہ روؤ، یہ خاکی جسم تو کپڑوں کی مانند ہے اس لیے کہ جسم روح کا لباس ہوتا ہے۔ اب روح نے

اس کو اتار کر رکھ دیا ہے اور اس کی جگہ اللہ تعالیٰ کے نور کا لباس پہن لیا ہے۔ اب تمھارے ابّا بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں، وہ بہت آرام سے ہیں اور اپنے حقیقی قدردان کے پاس چلے گئے ہیں۔

اختتام سفر:

اس کمال حوصلے کے ساتھ اس صدمے کو برداشت کرنے کے بعد آپ کا دل اس دنیا سے اُچاٹ ہو گیا۔ بیٹی انھیں اپنے ہمراہ سعودی عرب لے گئی۔ وہاں کی فضاؤں میں آپ کی طبیعت میں بہتری آ گئی۔ قرآن کی کلاس لینی شروع کر دی۔ ۲۰۰۲ء میں معدے کا السر پھٹنے کے بعد اس کلاس کو ختم کرنا پڑا۔ سال بھر بستر پہ رہیں۔ چھ بار اسپتال لے کر جانا پڑا۔ اس آخر عمر میں لمبی نمازیں اور حفظ قرآن کی کوشش آپ کا معمول بن گئی۔ بیٹی اپنی بچّی کو امتحان کی تیاری کی تلقین کرتی تو وہ خود نمازوں میں اپنا انہماک بڑھا دیتیں۔ کہتیں۔ ''امتحان تو مجھے بھی دینا ہے اور امتحان بھی ایسا جس پر پوری اخروی زندگی کا انحصار ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر پرچے میں میرا بھی ''اے'' گریڈ آئے، ہر نماز ''اے'' گریڈ کی نماز ہو۔

کچھ عرصے بعد پاکستان واپس آ گئیں۔ صدر جنرل ضیاء الحق نے انھیں سینیٹ کی رکنیت قبول کرنے اور ڈپٹی چیئرپرسن بننے کی پیشکش کی۔ جب نثار فاطمہ صاحبہ یہ درخواست لے کر ان کے پاس آئیں تو انھیں اپنا پسندیدہ مصرعہ سنایا۔

سودا گری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے

اور کہا ''میں اپنے نیک نفس شوہر کے نام کو جنسِ بازار نہیں بنا سکتی''۔ میں تو اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ میرا اور میرے بچّوں کا انجام ان کے ساتھ کر دے۔'' اس آخر عمر میں وہ اپنے نیک نفس شوہر کو یاد کرتے ہوئے خود بھی ۴/اپریل ۲۰۰۳ء کو ان سے جا ملیں۔ وہ عربی محاورے کے مطابق ''البنات عود'' میں سے تھیں۔ ایسی خاتون جو خود تو پردے میں رہتی ہے لیکن خوشبو کی مانند اپنے سلیقہ سے ماحول کو مہکا دیتی ہے۔

ماخذات

۱۔ شجر سایہ دار۔ حمیرا مودودی صاحبہ
۲۔ ترجمان القرآن۔ مئی ۲۰۰۳ء۔ آپا جان۔ پیکر عزم وہمت۔ ثریا اسماء صاحبہ
۳۔ زہرہ وحید صاحبہ۔ رکن جماعت اسلامی

& کرم النساء (امّی جی)

۱۸۹۶ء تا ۱۹۹۱ء

(

4

امی جی کا مکان سالہا سال حلقۂ خواتین کا مرکز بھی بنا رہا۔ایک کمرے میں فائلوں کی الماری رکھ کر اسے دفتر کا نام دے دیا گیا۔یہیں ناظمہ اوران کی ٹیم جمع ہوتی، یہیں منصوبے بنتے اور نیچے اتارے جاتے، یہیں رپورٹس تیار کی جاتیں۔بعض مرتبہ صبح سے شام ہو جاتی تو بازار سے دہی اور روٹی منگوائی جاتی، الماری میں موجود شکر دہی میں ملائی جاتی اور طعام سے لطف اندوز ہوا جاتا۔امی جی بھی ہر ممکن مہمانداری کرتیں۔خود انہوں نے بہت سادہ طرزِ زندگی اختیار کیا ہوا تھا، اپنی ضروریات زندگی بے حد محدود کر لی تھیں، کہتی تھیں ”راستے میں زیادہ سامان مسافر کے لیے پریشانی کا باعث ہوتا ہے“۔

4

ہری پور ہزارہ میں قائم گرلز پرائمری اسکول میں آج انسپکٹریس آف اسکولز دورہ کرنے آ رہی تھیں۔ طالبات اپنے کمروں میں موجود تھیں جبکہ چند خواتین اسکول کی پرنسپل کو تیار کر رہی تھیں۔ دس سالہ بچی کو بڑے کپڑے اور اونچی ایڑی والے جوتے پہنائے جا رہے تھے تا کہ وہ اپنی عمر سے بڑی نظر آئے۔ لیکن بچی کی عمر نہ چھپ سکی اور جب انسپکٹریس نے پرنسپل کے روپ میں بچی کو دیکھا تو حیران رہ گئیں اور پھر قابلیت کا امتحان لے کر اسے پرائمری کا سرٹیفکیٹ دے دیا گیا۔ ساتھ ہی اسکول کی طالبات کا امتحان لے کر ان کی قابلیت کا بھی اطمینان کیا گیا۔ یہ ذہین، قابل، پراعتماد اور باحوصلہ بچی کرم النساء تھیں جنہیں شائد دنیا کی سب سے کم عمر پرنسپل بننے کا اعزاز حاصل ہوا اور آگے چل کر دنیا میں ''امی جی'' کے نام سے پہچان حاصل کی اور ایک دنیا کو اپنی تدریس سے فیضیاب کیا۔

ابتدائی زندگی:

زمین کا سینہ چیر کر نکلنے والی کونپل کو سب دیکھتے ہیں لیکن زمین کے اندر پڑے بیج کو خاک کی مختلف تہوں سے توانائی کے ذخیرے کشید کرتا ہوا کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ حقیقت یہی ہے کہ طاقتور بیج ہی سرسبز اور بلند درخت کا باعث بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں جن ہستیوں سے بڑا کام لینا ہوتا ہے، وہ ابتدائی عمر میں انہیں مشاہدات اور تجربات کی بھٹی میں تپاتا ہے تا کہ وہ کندن بن کر زمانے میں اپنی کرنیں بکھیر سکیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہمیں امی جی کی ابتدائی زندگی میں نظر آتا ہے۔ چار سال کی عمر میں یتیم ہو جانے والی بچی کو سوتیلے بھائی نے اپنی کفالت میں لیا تو معاش کے چکروں کے باعث مختلف گھروں میں رہنے بسنے کا تجربہ ہوا جس نے انہیں بہت کچھ سیکھنے اور سکھانے کے مواقع فراہم کیے۔

۱۸۹۶ء میں ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئیں۔ مغل خاندان سے تعلق نے طبیعت میں نزاکت کا وصف پیدا کیا۔ تو شجرہ نسب کی حضرت عمر فاروقؓ سے نسبت نے شخصیت میں پختگی اور رعب پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق ابتدا سے ہی عطا کر دیا۔ چار سال

کی عمر میں پھوپھی سے بغدادی قاعدہ پڑھنا شروع کیا اور ایک ہفتے میں ہی پڑھ لیا۔ ایک ماہ میں تیسویں پارے کا ربع حصہ پڑھ لیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب والد دنیا سے رخصت ہوئے اور بھائی کے ساتھ امرتسر آ گئیں۔ بغدادی قاعدے کی مدد سے اردو سیکھ لی اور اتنی سیکھ لی کہ ''بنات النعش'' اور ''مراۃ العروس'' جیسی کتب بھی پڑھ ڈالیں۔ گھر کے اوپر موجود مشن اسکول میں جانا شروع کیا اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنا بھی سیکھ لیا۔ درمیان میں کچھ حصہ لاہور رہ کر دوبارہ امرتسر آنا ہوا۔ ان کی آپا بیمار تھیں جنہیں علاج کے لیے مشن ہسپتال لے جاتے تھے۔ وہاں وہ یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئیں کہ عیسائی خواتین انتظار گاہ میں بیٹھے لوگوں کو بائبل سناتی تھیں۔ ان کے دماغ میں یہ سوچ پیدا ہوئی کہ جب یہ اتنے جذبہ سے اپنے مذہب کی تعلیم عام کر رہی ہیں تو ہم مسلمان قرآن کا پیغام کیوں نہیں پھیلا رہے؟

نوعمر استانی:

پانچویں کلاس تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کا گھرانہ ہری پور ہزارہ منتقل ہو گیا۔ یہاں انہیں رہائش کے لیے ایک ایسا مکان ملا جس کے اندر نہر بہتی تھی۔ محلے کی ساری عورتیں پانی بھرنے، کپڑے دھونے اور نہانے کے لیے آتی تھیں اور انہیں پڑھتے لکھتے دیکھتی تھیں۔ ایک عورت نے یہ دیکھ کہ اپنی بیٹی کو پڑھانے کے لیے کہا۔ ان کے حامی بھرتے ہی باقی خواتین نے بھی اپنی بیٹیاں ان کے سپرد کر دیں اور یوں پچاس ساٹھ طالبات جمع ہو گئیں۔ پھر ایک باقاعدہ اسکول بھی بنا لیا گیا اور اسے اسکول کمیٹی سے منظور بھی کرا لیا گیا۔ امی جی کا نام بطور ہیڈ مسٹریس حکومت کے کاغذات میں داخل ہو گیا۔ امتحان کے موقع پر اہلکار آتے، لڑکیوں کا امتحان لیتے اور قابلیت سے مطمئن ہو کر مٹھائی اور پانچ دس روپے انہیں انعام دے کر چلے جاتے۔ پڑھنے والی بچیاں جب گھر جا کر اپنی ماؤں کو بتاتیں کہ ''آج ہماری ٹیچر کا دودھ کا دانت ٹوٹا ہے'' تو وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے آتیں۔ اس طرح جب بڑی عمر کی عورتیں ان کے پاس آنے لگیں تو دوپہر میں وہ انہیں قرآن پاک کی تعلیم دینے لگیں۔ انہیں پڑھانے سے ایک روحانی مسرت ہوتی تھی۔ لڑکیوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ سلائی، کٹائی اور کڑھائی بھی سکھاتیں۔

جماعت سے وابستگی:

قرآن سے لگاؤ، دین سے محبت اور تعلیم دینے کا شوق انہیں جماعت اسلامی سے قریب لے آیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب بھائی کے ساتھ گوجرانوالہ میں رہائش پذیر تھیں تو کسی اسلامی کام میں حصہ لینے کی خواہش انہیں اسلامیہ گرلز ہائی اسکول لے گئی۔ جہاں انہوں نے مدرسہ کی طالبات کو اخلاقی و اصلاحی کہانیاں سنانے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ وہیں ان کی ملاقات آپا حمیدہ بیگم سے ہوئی جو ابھی دوسری جماعت کی طالبہ تھیں۔ دونوں کے درمیان انسیت اور محبت کے جذبات نے جنم لیا۔ ۱۹۲۱ء میں شادی ہوگئی۔ امی جی نے اپنی بچی کے نام پر اس اسکول میں ''رضیہ لائبریری'' قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں ایسی کتب موجود ہوں جو طالبات کی اخلاقی اصلاح کا کام دے سکیں۔ خود وہ اور آپا حمیدہ بیگم لائبریری کے لیے کتب خرید کر لائیں۔ ایک مرتبہ جب امّی جی اسکول کے سالانہ جلسہ میں گوجرانوالہ آئی ہوئی تھیں تو آپا حمیدہ بیگم نے انھیں رسالہ ''ترجمان القرآن'' دکھایا اور کہا کہ ''معلوم ہوتا ہے اس شخص نے قرآن پاک اور حدیث شریف کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، اس کے مضامین دینی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کیا ہمیں اس تحریک میں شامل ہوجانا چاہیے؟'' امّی جی پڑھنے کے لیے یہ رسالہ لے کر روانہ ہوگئیں۔ آپا حمیدہ بیگم نے رسالہ ان کے نام جاری کروادیا اور اجتماع عام میں انھیں شرکت کی دعوت دینے لگیں۔ کراچی کے کمکری گراؤنڈ میں ہونے والے جلسہ میں امّی جی نے شرکت کر کے آپا حمیدہ بیگم سے ملاقات کی اور کہا کہ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں اسی اسلامی جماعت میں ہوں جو نبی ﷺ نے تشکیل دی تھی، الحمدللہ میں نے ذاتی کتب کی لائبریری بھی گھر میں رکھی ہوئی ہے جن سے خواتین اور لڑکیاں کتب گھر لے جا کر مطالعہ کرتی ہیں، ہر پیر کو میرے گھر میں اجتماع خواتین بھی ہوتا ہے''۔ پچاس ساٹھ خواتین اور لڑکیاں ناظرہ قرآن بھی پڑھتی ہیں۔'' کام سارا جماعت کی دعوت کے مطابق کرتی تھیں لیکن باقاعدہ شامل نہ ہوئی تھیں۔ اس اجتماع کے بعد آپا حمیدہ بیگم نے ان سے باقاعدہ خط و کتابت شروع کر کے انھیں جماعت میں شامل ہونے پر راضی کر لیا یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء میں آپ نے

رکنیت کا حلف بھی اٹھالیا''۔

بائیس سال کی عمر میں شادی اپنے خالہ زاد بھائی بیرسٹر عبدالغنی سے ہوگئی جو ایک نامور وکیل تھے۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہ ایک سال لاہور رہنے کے بعد پھر کراچی منتقل ہوگئیں۔ شوہر کے انتقال کے وقت بینک میں جو سود کی رقم موجود تھی وہ نکلوا کر جلادی اور کہا ''نہ خود استعمال کرو نہ کسی کو کرنے دو''۔ بعد میں ان کی جائیداد جو تقریباً بیس پچیس ہزار روپے کے قریب تھی فروخت کر کے ان کے وارثین کو ان کا حصّہ خود جا کر پہنچانے کا اہتمام کیا، لیکن سب نے بخوشی اس رقم کو انہیں ہی واپس کر دیا کہ جس مقصد میں چاہیں استعمال کر لیں۔ اس پر ۱۹۶۵ء میں فیڈرل بی ایریا میں ایک مکان خرید کر اسے مدرسہ کی حیثیت دے دی۔ تین کمروں اور ایک صحن رکھنے والے اس مکان میں اپنے استعمال کے لیے ایک چھوٹا کمرہ اپنے پاس رکھ کر باقی تمام جگہ مدرسہ کے لیے وقف کر دی۔ ۱۹۶۶ء میں آپا حمیدہ بیگم کو خط لکھ کر کہا کہ ''اس درسگاہ کو باضابطہ مدرسہ کی شکل دے دی جائے تاکہ میرے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہ سکے''۔ اس پر آپا حمیدہ بیگم نے خوشی کا اظہار کیا اور امّی جی کی مدد کے لیے چند اور خواتین استانیوں کو رکھ دیا گیا۔

وفا شعار بیوی:

شادی کے بعد اپنے ذاتی رجحان کے خلاف ماحول کا سامنا کرنا پڑا، لیکن آپ کی ہمت، استقامت اور عزمِ بلند نے اس منزل کو بھی آسان کر دیا۔ آپ کے شوہر کو اگرچہ آپ سے دلی لگاؤ تھا۔ لیکن پکّے کمیونسٹ تھے۔ مذہب سے کوئی انس نہیں تھا۔ خدمت خلق کے لیے قرآن پڑھانے کے بجائے ڈاکٹر بننے کا مشورہ دیتے تھے۔ ان کے کہنے پر امّی جی نے ہومیو پیتھک ڈاکٹری کا کورس بھی کر لیا۔ کشیدگی سے بچنے کے لیے دونوں نے طے کر لیا کہ دونوں اپنے اپنے راستے پر چلتے رہیں اور ایک دوسرے کی مخالفت نہ کریں۔ امّی جی کسی عالمِ دین سے قرآن پاک کا علم حاصل کرنا چاہتی تھیں لیکن اجازت نہ ہونے کے سبب انھوں نے قرآن پاک کے تمام دستیاب نسخے گھر پر منگوائے اور روزانہ تمام نسخوں سے مطالعہ کرتیں اور ترجمہ و

تفسیر کا علم حاصل کرتیں۔ تین سال کی جدّ و جہد کے بعد پورے قرآن پاک کو ترجمے سے سیکھ لیا۔ شوہر جو بڑے کامیاب وکیل تھے، کسی غلط فہمی کی بنا پر کچھ لوگوں نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا، گردن تقریباً ساری کٹ گئی بس شہ رگ کٹنے سے بچ گئی، اس وجہ سے ان کی آواز ختم ہوگئی۔ اس موقع پر امّی جی نے ان کی بڑی خدمت کی۔ ان کی نوکرانی، جمعدارنی اور نرس سب کے فرائض خود انجام دیے، ان کی بے لوث اور انتھک خدمت دیکھ کر ان کے شوہر بھی نرم پڑ گئے اور پھر ان کے معاملات سے تعرض نہیں کیا، اللہ نے ان کے شوہر کو اپنا معجزہ اس طرح دکھایا کہ ان کی آواز کی رگ کٹ چکی تھی لیکن جب کسی کے کہنے سے انہوں نے قرآن پڑھنا سیکھا اور ڈیڑھ سال تک پڑھتے رہے تو اس کی برکت سے مردہ رگوں میں جان پڑ گئی اور اتنی آواز نکلنے لگی کہ قریب جا کر سنو تو بات کسی حد تک سمجھ میں آجاتی تھی۔ اس قاتلانہ حملے کے بعد ستائیس سال زندہ رہے اور پھر وفات پا گئے۔ امّی جی ان کے مرنے کے بعد مستقلاً آیت کریمہ پڑھ پڑھ کر دعا کرتی رہتی تھیں اور کہتی تھیں کہ ''اللہ تعالیٰ جب تک آپ میرے شوہر کو بخشنے کا وعدہ نہیں کریں گے، میں آپ سے درخواست کرتی رہوں گی'' ہر دعا میں اپنے شوہر کی مغفرت کی دعا کرتی تھیں یہاں تک کہ پھر کسی وقت دل میں کوئی ایسی بشارت ڈالی گئی کہ دل کو اس طرف سے کچھ تسلّی ہوئی۔

قرآن سے تعلق:

امّی جی نے ہر غم کو قرآن کی تعلیم کے ذریعہ دور کیا۔ جب لوگ تنہائی کا احساس دلاتے تو کہتیں ''اللہ کی مرضی اسی میں ہے کہ میں شوہر اور اولاد کے بکھیڑوں سے الگ رہ کر اس کے دین کی حتی المقدور خدمت کرتی رہوں۔ یہی آرزو ہے کہ باقی جتنی زندگی ہے وہ بھی اسی کے کام میں صرف ہو جائے۔ ایک لمحہ بھی کسی فضول کام میں ضائع نہ ہو''۔ ان کی ذات ذاتی غموں سے بالاتر ہو کر لوگوں کے لیے عزم و ہمت کی ایک مثال بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کے مطابق کہ تم میری مدد کرو میں تمہاری مدد کروں گا۔ لوگوں کے دلوں کو ان کے لیے کھول دیا۔ ان کا محلّہ ''امّی جی'' کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ دور دور سے خواتین یہاں قرآن

سیکھنے آنے لگیں۔ ان کے گھر کے دروازے سب کے لیے کھلے رہتے۔ گھر میں کسی مرد کے نہ ہونے کے باعث لوگ اپنی بچّیوں کو ان کے گھر رہنے کے لیے بھی بھیج دیتے۔ محلّہ والے رات کو ان کی تنہائی کے خیال سے رات میں اپنے چھوٹے لڑکوں کو ان کے ساتھ رہنے کے لیے بھیج دیتے۔ وہ دس سال سے چھوٹے بچّوں کو اپنے پاس سلا لیتیں۔

اپنی ہر شاگرد کو نصیحت کرتیں کہ ''تمھیں کم از کم پانچ افراد تک قرآن کی روشنی کو ضرور پھیلانا ہے''۔ سیکڑوں بچّیوں اور خواتین نے ان سے قرآن کی تعلیم کو حاصل کیا۔ ان کے سامنے رہنے والی فیروزہ صاحبہ نے بتایا کہ میں چھوٹے بچّوں کے باعث ان سے قرآن نہیں پڑھنے جا پاتی تھی تو بڑا تاسف کرتیں۔ ایک دن بڑی دلسوزی سے کہا کہ ''افسوس یہ ہے کہ آپ نے ہم سے قرآن نہیں پڑھا، دریا بہہ رہا ہے۔ آپ بھی ہاتھ دھو لیں۔ ابھی آئیں اور پڑھ لیں''۔ اس پر میں نے بھی پڑھنے کا آغاز کر دیا اور چند سال میں قرآن ختم کر لیا۔

فیض رسانی:

امّی جی گھر میں ہر جمعہ کو خواتین کا اور پیر کو لڑکیوں کا درس رکھواتیں ہفتہ کو چھوٹے بچوں کے لیے نوری محفل منعقد کی جاتی۔ درس کی دعوتیں دینے کے لیے خود بھی دور دور تک جاتیں۔ جمعہ کا دن بیماروں کی عیادت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ کسی کا محلّہ میں انتقال ہو جاتا تو ضرور جاتیں اور نہلانے اور کفنانے میں تعاون کرتیں۔ فیروزہ صاحبہ بتاتی ہیں کہ محلّہ میں ذرا دور کے فاصلہ پر کسی کے انتقال کی انھیں خبر ملی تو انھوں نے ہم سے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ میں نے کہا کہ ''میں تو انھیں جانتی بھی نہیں''۔ تو اس پر ناراض ہوئیں اور کہنے لگیں کہ ''کیا آپ کو مرنا نہیں ہے؟ کیا آپ کو نہلانے اور کفنانے کی ضرورت نہیں پڑے گی؟'' کسی بچّے کا انتقال ہو جاتا تو اس کی ماں کو بہت تسلّی دیتیں اور کہتیں ''آپ نے تو اپنے لیے جنت کا سامان مہیا کر لیا ہے''۔ آنے والی خواتین کو ساتھ بٹھا کر لٹریچر پڑھاتیں۔ دو تین ہفتے ان کے ساتھ مل کر پڑھتیں پھر اس کی وضاحت کرتیں۔ لوگ ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے اور اپنی چیزیں بطور امانت آپ کے پاس رکھواتے۔ لوگوں کی فلاح و بہبود اور مسائل کے حل کے لیے بھی ہر ممکن

کوشش کرتیں۔ایک بنگالی لڑکی کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔انہوں نے اس کی شادی کا پورا انتظام کیا۔بچّوں کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ ان کو اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنے کی تلقین بھی کرتیں اور عادات واطوار کی درستی پر نظر بھی رکھتیں۔ایک مرتبہ ایک خاتون اپنے سسرال والوں کے ظلم وستم اور بدزبانی کی شکایت کرنے لگیں۔کافی دیر بولنے کے بعد وہ چلی گئیں۔ ایک چھوٹا بچّہ جو قرآن پڑھنے آیا تھا انھیں دیکھتا رہا اور ان کے جانے کے بعد بولا۔''امّی جی آپ کہتی ہیں برائی کا جواب نہ دو ان کو بھی بتا دیتیں کہ خاموش رہا کریں'' سیکڑوں بچّے نیکی کا یہ درس پا کر بڑے ہوئے اور اپنے اپنے محاذ پر قوم اور ملک کی اہم خدمات کی انجام دہی کے قابل بنے۔

مرکز حلقہ خواتین:

امّی جی کا یہی مکان سالہا سال حلقہ خواتین کا مرکز بھی بنا رہا۔ایک کمرے میں فائلوں کی الماری رکھ کر اسے دفتر کا نام دے دیا گیا۔یہیں ناظمہ اور ان کی ٹیم جمع ہوتی، یہیں منصوبے بنتے اور نیچے اتارے جاتے، یہیں رپورٹس تیار کی جاتیں۔بعض مرتبہ صبح سے شام ہو جاتی تو بازار سے دہی اور روٹی منگائی جاتی الماری میں موجود شکردان سے چینی دہی میں ملائی جاتی اور طعام سے لطف اندوز ہوا جاتا۔امّی جی بھی ہر ممکن مہمانداری کرتیں خود انہوں نے بہت سادہ طرزِ زندگی اختیار کیا ہوا تھا۔اپنی ضروریات زندگی بے حد محدود کر لی تھیں۔کہتی تھیں'' راستے میں زیادہ سامان مسافر کے لیے پریشانی کا باعث ہوتا ہے''۔

ذاتی اوصاف:

قرآن پڑھانے اور سمجھانے کے ساتھ ساتھ ہر آن خود کو اس کے پیمانے پر ناپتی اور اسی کے معیار کے مطابق زندگی کا ہر رنگ اختیار کرنے کی پوری کوشش کرتی تھیں۔پیرانہ سالی کے باوجود سَتر اور پردے کے حکم پر عمل میں انتہائی شدّت سے کام لیتیں۔جب گھر سے باہر نکلتیں تو منہ ڈھک کر اوپر سے دونوں نقاب گرا لیتیں۔جارجٹ کے دوپٹّے میں اندر ململ کا استر لگا کر پہنتیں۔سالہا سال قرآن کی ہمراہی میں زندگی گزاری، اکلوتی بیٹی اپنے پاس رہنے کے لیے

بلاتی لیکن مدرسے میں پڑھنے والی طالبات کے خیال سے نہ جاتیں۔پھر ان کے ایک نواسے کو کراچی میں ملازمت مل گئی تو وہ ساتھ رہنے لگا۔جب اس کی شادی کا وقت آیا تو اپنے مدرسے میں زیرِ تعلیم ایک طالبہ سے اس کی شادی کروائی۔

آپ ہر سال اعتکاف میں بیٹھا کرتیں رمضان کی طاق راتوں میں شب بیداری اور اعتکاف کے لیے آپ کا گھر سب کے لیے کھلا رہتا۔لڑکیوں کو یہ کہہ رکھا تھا''جو چاہے بناؤ اور کھاؤ'' آنے والی طالبات ان کے گھر کو اپنے گھر کی طرح ہی حق سمجھ کر استعمال کرتیں۔ آپ کو لکھنے کا بھی شوق تھا۔ایک زمانے میں''تہذیبِ نسواں'' اور خواتین کے دیگر رسائل میں مضامین بھیجا کرتیں۔اللہ کے ناموں کی تشریح پر مشتمل ایک مختصر کتاب بھی تحریر کر کے شائع کروائی۔

دعوتی لحاظ سے امّی جی کا تجربہ وسیع تھا۔اپنے اوقات اور دنوں کی کاموں کے لحاظ سے تقسیم کر رکھی تھی اس پر پابندی سے عمل کرتیں تھیں۔خواتین سے اس بات پر شاکی رہتی تھیں کہ دینی کاموں کے لیے عذرات پیش کر دیتی ہیں اور دنیاوی کاموں کے لیے وقت نکال لیتی ہیں اور یہ کہ ٹھوس مطالعہ نہیں کرتیں جبکہ مطالعہ ہی سے علم بڑھتا ہے اور علم سے ہی عمل بہتر ہوتا ہے۔خواتین کو سمجھایا کرتیں کہ''دوسروں کی کمزوریوں پر نظر رکھنے کے بجائے اپنی کمزوریوں اور دوسروں کی خوبیوں پر نظر رکھنی چاہیے'' آپس میں میل ملاپ اور خوشی وغمی میں شرکت کو بہت اہم سمجھتیں، کہتی تھیں کہ''اسی طرح واقفیت بڑھتی ہے اور دل آپس میں جڑتے ہیں اور دلوں کا جڑنا اشاعت دین کے لیے بے حد ضروری ہے''۔اس بات پر پورا یقین رکھتیں کہ عورت کے ذریعے قوم بگڑ بھی سکتی ہے اور بن بھی سکتی ہے۔اگر ماں ہی غلط سوچ اور راستہ رکھتی ہو گی تو بچّے جنّت کے راہی کیسے بنیں گے؟اس لیے عورت کو ہر قدم پھونک کر اٹھانے کی ضرورت ہے۔گھر اور بچّوں کو اوّلین ترجیح بناتے ہوئے تربیت اولاد کے نازک کام کو حسّاسیت سے انجام دینا چاہیے۔

سفرِ آخرت:

ان کی بہو مہرالنساء بتاتی ہیں کہ میں نے پانچ سال امّی جی کے ساتھ گزارے۔ان کی ہر بات ہر جملے میں بہت گہرائی ہوتی تھی جس پر جتنا غور کرو اتنے ہی پہلو سمجھ میں آتے تھے۔ میں نے شادی سے پہلے ان سے تین سپارے مع ترجمہ پڑھے تھے۔شادی کے بعد انھوں نے میرے پڑھنے کے لیے صبح دس بجے کا وقت مقرر کیا۔کبھی گھریلو ذمّہ داریوں کے باعث اس میں تاخیر ہوئی تو خفا ہوتی تھیں۔کہتیں ''وقت نکل جاتا ہے تو ہاتھ نہیں آتا۔ابھی ہم سے پورا قرآن پڑھ لو'' بچوں کے ساتھ انتہائی مشفق تھیں۔ان کے کھیل میں شریک ہوجاتیں۔ان کے ساتھ ان کی زبان میں گفتگو کرتیں اور بہت خوش رہتیں۔ چھیانوے برس کی عمر پائی لیکن آخری دو سالہ معذوری کے سوا کبھی کوئی بڑی بیماری نہیں ہوئی۔جسمانی معذوری کے دور میں بھی ذہنی طور پر پوری طرح توانا تھیں۔اس حال میں بھی خواتین کو قرآن پڑھایا کرتیں اور باقی وقت تلاوتِ قرآن اور نماز میں گزارتیں۔ یہاں تک کہ رات کو نماز پڑھتے پڑھتے سجدے ہی کی حالت میں سو بھی جاتیں۔ جمعہ کے دن اُنھیں میں پانی گرم کرکے اور پوری تیاری کر کے نہلاتی تھی لیکن جس دن ان کا انتقال ہوا ہے اس دن صبح جب میں اٹھی تو دیکھا کہ وہ نہا دھو کر صاف کپڑے پہنے تیار بیٹھی ہیں۔حیران ہوکر میں نے پوچھا کہ آپ کو کس نے نہلایا؟ تو کہا کہ ''میں تے آپاں ہی نائیں''۔ابھی تک سمجھ نہیں آتا کہ خود سے انھوں نے سب کام کیسے کیے جبکہ ان کے کپڑے بھی اوپر ٹرنک میں رکھے رہتے تھے جو وہ خود سے نہیں اتار سکتی تھیں۔ان کے انتقال کے بعد میں نے انھیں خواب میں دیکھا کہ ان کے پیر دبا رہی ہوں اور محسوس کر رہی ہوں کہ نرم نرم پاؤں ہیں اور سوچ بھی رہی ہوں کہ مرنے کے بعد تو انسان کا جسم سخت ہوجاتا ہے لیکن امّی جی کے پاؤں کیسے نرم نرم ہیں۔

تقریباً ایک صدی تک زمانہ کو قرآن کے نور سے منوّر کرنے والی یہ روشن ہستی ۱۶ر نومبر ۱۹۹۱ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔جس کے لیے وہ عرصہ دراز سے تیاری کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ہر ملنے والی خاتون کو یہ نصیحت بھی کرتی جاتی تھیں کہ ''دین کی راہ میں لگی رہنا''۔

اپنی بہو سے اس بات کا وعدہ لیا کہ ان کے بعد یہ مدرسہ دنیا کو فیض پہنچاتا رہے گا اور قرآن کی خوشبو یہاں مہکتی رہے گی۔

آج بھی یہ مدرسہ بفضل تعالیٰ قائم ودائم ہے۔بچّے اور بچّیاں آتے ہیں۔قرآن کا سبق لیتے ہیں اور ان کے لیے صدقہ جاریہ کا سبب بنتے ہیں۔کتنی خوش نصیب تھیں امّی جی جنھوں نے روحانی اولاد کے طور پر ہزاروں بچّوں کو دین کا علم سکھایا اور اس میں نہ دن دیکھا نہ رات۔ ایسے ہی بندوں کو اللہ رب العالمین نے قابل رشک ٹھہرایا ہے۔

آج بھی اس مکان کے باہر موجود ''امّی جی ہاؤس'' کی تختی یہ پیغام دیتی ہے کہ:

دھوپ کے ماروں کو جس کی چھاؤں میں راحت مِلے
ریگزار زندگی میں وہ شجر ہو جایئے

ماخذات

۱۔ فیروزہ ہاشمی صاحبہ۔پڑوسن،کارکن حلقہ خواتین
۲۔ مہرالنساء صاحبہ۔بہو(نواسے کی بیگم)
۳۔ ممتاز صاحبہ۔کارکن جماعت اسلامی
۴۔ کتاب۔آپا حمیدہ بیگم۔فروغ احمد
۵۔ رسالہ بتول مئی ۱۹۷۵ء۔۔۔انٹرویو امّی جی
۶۔ اوصافِ حمیدہ۔۔۔ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

بنت الاسلام

۱۹۲۱ء تا ۱۹۸۹ء

میں ہر وقت اس فکر میں رہتی تھی کہ ہر ایک سے یہ اعتراف کراسکوں کہ میں ہر فن مولا ہوں اور کوئی بھی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ جبکہ اسے ذرا بھی اس بات کا خیال نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اسے ماہر دستکار اور خانہ دار سمجھتا ہے یا نہیں اور ہر ایک اس کی تعریف کرنے کو تیار تھا۔ یہ سب کچھ کیوں تھا؟ اگرچہ خود پسندی اور خودنمائی کی شدت نے ضمیر کو بہت حد تک مردہ کر دیا تھا، تاہم اس میں زندگی کی کچھ بچی کھچی رمق موجود تھی جو کمزور اور ضعیف آواز سے حقیقت کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بڑائی اس طرح حاصل نہیں ہوتی کہ اس کو مقصود بنا کر اس کے حصول کے لیے مصنوعی کوششیں کی جائیں۔ بڑائی تو نتیجہ ہوتی ہے نیکی اور فرض شناسی کا! اس دنیا میں عزت کے پیچھے پیچھے دوڑیں تو وہ کبھی ہاتھ نہیں آتی اور اس سے بے نیاز ہو کر اپنے فرائض کے پیچھے لپکیں تو وہ دوڑی دوڑی آجاتی ہے!

(''چراغِ اشک'' از: بنت الاسلام)

ایک خندہ پیشانی والا روشن چہرہ صفحۂ قرطاس پر اپنے قلم سے موتی بکھیرنے میں مصروف تھا کہ کمرے میں کوئی اندر داخل ہوا اور پرجوش لہجہ میں کہا: ''مبارک ہو۔ آپ کا مرتب کردہ احادیث کا مجموعہ مقابلہ سیرت نگاری میں صدارتی ایوارڈ یافتہ قرار پایا ہے۔'' ایک لحظہ کے لیے قلم ساکت ہوا۔ سوچ میں ڈوبی ہوئی نگاہیں خوشخبری دینے والے کے چہرے پر جم گئیں اور یہ الفاظ لبوں سے ادا ہوئے کہ ''میں نے یہ مجموعہ اس لیے تو نہیں لکھا تھا'' اور اگلے لمحہ وہ روشن چہرہ پھر قلم کے موتی بکھیرنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ قلم کے ذریعہ ساری عمر جہاد کرنے والی اور شہرت و ناموری سے حددرجہ گریزاں رہنے والی اس پاکیزہ ہستی کو زمانہ ''بنت الاسلام'' کے قلمی نام سے جانتا اور پہچانتا ہے۔ جنہوں نے حق کے اظہار کے لیے ساری عمر قلم کو ہاتھ میں تھامے رکھا لیکن شہرت سے دور رہنے کی خاطر نام بدل بدل کر اور کبھی گمنام طریقے سے مضامین شائع کروانے میں مصروف رہیں یہاں تک کہ خود تحریک کے ذمہ داران نے ''بنت الاسلام'' کا قلمی نام تجویز کیا اور حق تو یہ ہے کہ آپ نے اس نام کا حق ادا کر دیا۔

ابتدائی تعارف:

اصل نام نسیم آراء تھا اور آپ مولانا ظفر اقبال صاحب کی صاحبزادی تھیں جو پنجاب یونیورسٹی میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ ان کا محبوب ترین مشغلہ قرآن پاک کو لفظی اور اعراب کی مکمل صحت کے ساتھ زیور طباعت سے مزین کرانا تھا۔ نسیم آراء کے چچا مستری محمد عبداللہ صاحب تھے جو ملحقہ گھر میں رہتے تھے۔ اسی مکان میں ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کا تاسیسی اجتماع منعقد ہوا اور اسی مکان میں رسالہ ترجمان القرآن کا دفتر قائم کیا گیا۔

۱۹۴۷ء میں جب مولانا مودودی محترم دارالسلام سے منتقل ہو کر لاہور تشریف لائے تو ان کے والد نے پڑوس میں مکان کرایہ پر دلوایا۔ مولانا ظفر اقبال صاحب ابتدا ہی سے مولانا مودودی کے عقیدت منداور ان کے دمساز رہے اسی لیے ان کے سب بچے بھی اسی فکر و فضا اور ماحول میں پروان چڑھے۔

نسیم آراء تمام بہن بھائیوں سے بڑی تھیں۔ ان میں قبولیت حق کی انتہائی صلاحیت موجود

تھی اس لیے انہوں نے اپنے گرد و پیش میں حاصل مواقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور اس ماحول اور ذاتی کسب نے انہیں کندن بنا دیا۔ بیگم مولانا مودودی گواہی دیتی ہیں کہ 'نسیم آرا صاحبہ مجھ سے چھ سال چھوٹی تھیں۔ وہ میری سہیلی، چھوٹی بہن اور ہمسائی تینوں حوالوں سے بے حد قریب رہیں۔ ان کی والدہ ایک دین دار اور مشفق خاتون تھیں۔ اب اس عمر میں کمزور ہو چکی تھیں اور سارا گھر نسیم آرا چلاتی تھیں۔ ان لوگوں کے حسنِ اخلاق سے ہم نے سیکھا کہ ہمسائے کے حقوق کی ادائیگی کیسے کی جاتی ہے؟ اس شدید افراتفری کے زمانہ میں چھوٹی عمر میں دو چھوٹے بچوں کے ساتھ، سامان کے بغیر مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ میں اجنبی لوگوں میں رہ رہی ہوں۔ میں نے سولہ سال کی عمر سے اس نیک اور صالح روح کو ہر رنگ ہر لباس میں دیکھا۔ بیٹی، بہن، بیوی اور پھر ماں کے لباس میں لیکن ہر لباس میں وہ بہترین تھی۔ غمی و خوشی دونوں کیفیات میں اسے حدود اللہ کے اندر ہی دیکھا۔ انہوں نے تفہیم القرآن کو کوئی دس مرتبہ ختم کیا تھا اسی طرح باقی لٹریچر کا مطالعہ بھی انہوں نے بار بار کیا۔ تحریک کا سارا فلسفہ ان کے اندر جذب ہو گیا تھا''۔

دعوت دین بذریعہ تحریر:

مولانا مودودیؒ کے قرب اور ان کے لٹریچر کی تفہیم نے نسیم آرا صاحبہ کو فریضہ اِقامت دین کے نصب العین پر یکسو کر دیا تھا۔ جلد ہی ان کی آپا حمیدہ بیگم سے ملاقات ہو گئی اور وہ حلقہ خواتین کی ابتدائی ذمہ داران کی ٹیم کا حصّہ بن گئیں۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمانانِ پاکستان، پاکستان کے قیام کو منزل کا حصول سمجھ کر مطمئن ہو چلے تھے اور کاروبارِ مملکت اپنے حکمرانوں کے سپرد کر چکے تھے۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان کے انتقال کے بعد حکمران ذاتی مفادات کے اسیر ہو کر ملک کو صراطِ مستقیم سے دور لے جا رہے تھے۔ تیزی سے تبدیل ہوتے حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ملکی پالیسیز بھی ہمہ وقت تبدیلی کی زد میں تھیں۔ پاکستان تو بن چکا تھا لیکن جن مقاصد کے لیے بنایا گیا تھا، ان مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والی ٹیم مفقود تھی۔ ملکی رائے عامہ بنانے میں ذرائع ابلاغ اور ادب کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا تھا۔ قومی ذرائع ابلاغ تو مکمل طور پر ریاستی کنٹرول میں تھے اور جو دیگر ذرائع حقائق کو عوام تک پہنچانا چاہتے انہیں قید و بند کا شکار کر دیا جاتا۔ ادب کے میدان میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا غلغلہ تھا ''جو ادب برائے

ادب'' کے قائل تھے۔ اسلامی معاشرہ کی مسلّمہ اقدار کو انہیں ادب کے نام پر اپنے قلم تلے روندنے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا تھا۔ ایک طرف کمیونزم کا پرچار تھا تو دوسری طرف بے حیائی کو شاہکار بنا کر پیش کیا جارہا تھا۔ تفریح کے نام پر نوجوان طبقہ ذہنی پسماندگی وغفلت کا شکار ہوتا چلا جارہا تھا۔ خواتین قومی زندگی کے فیصلے اپنے مردوں کے سپرد کر کے گھریلو امور میں مشغول ومنہمک تھیں۔ اسلام کے نام پر مختلف مواقع پر ہونے والی رسومات کے انعقاد اور اس میں شرکت کچھ وظائف میں انہماک اور کچھ بزرگوں سے عقیدت مندی کو کافی سمجھتی تھیں۔

ان حالات میں حلقہ خواتین جماعت اسلامی کے تحت آپا حمیدہ بیگم کی قیادت میں جمع ہونے والی چند خواتین توسیعِ دعوت کے اہم مسئلہ پر غور وفکر میں مصروف تھیں۔ کام کو آگے بڑھانے کے لیے ہفتہ وار اجتماع کی تجویز پیش کی گئی تو ساتھ ہی نسیم آرا صاحبہ نے اپنی رائے بھی سامنے رکھی کہ ''قلم اور کاغذ کو بھی دعوت کا ذریعہ بنایا جائے۔'' ان کا کہنا تھا کہ تبلیغِ دین کے لیے محض زبانی کلام ہی کافی نہیں ہے۔ سات کروڑ کی آبادی میں چند خواتین مقررین کافی نہیں ہیں۔ تقریر کے ساتھ ساتھ تحریر کے ذریعہ بھی دعوت پہنچائی جائے۔ ان کی یہ تجویز دلوں میں اتر گئی۔ یہ ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے جب آپا حمیدہ بیگم اور نسیم آرا صاحبہ کی عمر تو زیادہ نہ تھی لیکن اوائل عمر میں انہوں نے دعوت کی توسیع کے لیے بڑا پختہ پروگرام بنایا۔ عام ادبی رسائل منگائے اور پڑھے جانے لگے۔ پہلے خلافِ اسلام تحریروں پر تبصرہ بھیجنا شروع کیا اور پھر اپنی تحریریں بھی بھیجی جانے لگیں۔ ان تحریروں کے ذریعہ پڑھی لکھی ہم خیال و ہمنوا خواتین تحریک کو ملیں۔ جب یہ اندازہ ہوا کہ ہم خیال لکھنے والیوں کی ایک ٹیم اکٹھی ہوگئی ہے اور پاکستان و ہندوستان میں ہم ذوق پڑھنے والوں کی بھی معقول تعداد ہے تو نسیم آرا صاحبہ ہی نے یہ رائے دی کہ ''اب ہمیں خود اپنا ایک ادبی واصلاحی ماہنامہ نکالنے کا بندوبست کرنا چاہیے''۔

رسالہ بتول کا اجراء:

یہ ۱۹۵۴ء کا دور تھا۔ وسائل تو بہت کم تھے لیکن اللہ کے بھروسے پر ماہنامہ ''عفت'' کی اشاعت شروع کر دی گئی۔ آپا حمیدہ بیگم اس کی مدیرہ قرار پائیں۔ ڈھائی سال بعد کچھ انتظامی مسائل کے سبب رسالہ کا نام تبدیل کر کے ''بتول'' کے نام سے ڈیکلریشن لیا گیا جس کا پہلا

پرچہ نومبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ آپا حمیدہ بیگم کی بیماری ومعذوری کے باعث ستمبر ۱۹۷۳ء میں ادارہ بتول کے بورڈ کی مشاورت سے نسیم آرا صاحبہ کو اس کی مدیرہ مقرر کیا گیا اور یوں آپ کی ایک مستقل وابستگی بتول کے ساتھ قرار پائی۔

حلقۂ ادب کا قیام:

''بتول'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ہم خیال قلمکار خواتین کی تحریروں کے معیار کو بہتر بنانے اور مزید ایسی خواتین کی تلاش کے لیے ''حلقہ ادبِ اسلامی خواتین'' کے نام سے ایک گوشہ بھی قائم کیا گیا جس کی نگرانی بھی بنت الاسلام صاحبہ کے سپرد کی گئی۔ ایک طرف اپنی تحریروں کے ذریعہ علمِ دین کو آسان زبان میں خواتین تک پہنچانے کے لیے کوشاں رہیں۔ دوسری طرف نو آموز قلمکاروں کی حوصلہ افزائی، قدردانی اور ماہرانہ مشوروں سے ان کی تحریروں کو بہتر سے بہتر بنانے اور انہیں مستقل اس جدوجہد پر آمادہ رکھنے میں مصروف رہیں۔ ان کی مستقل حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ ادب کے گلستان میں کھلنے والی کلیاں جلد تناور درخت بن کر لہلہانے لگیں۔

اللہ تعالیٰ نے بنت الاسلام صاحبہ کو ایک نیک اور دیندار گھرانے میں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے آراستہ کیا تھا، ان کے سادہ جملوں میں اثر آفرینی کی طاقت خود ان اصولوں پر عمل کے باعث پیدا ہوتی تھی۔ وہ ہر زخم کے لیے مرہم، ہر ایک کے درد کا مداوا، ہر پیاسے کے لیے آبِ حیات، ہر صحرانورد کے لیے سایہ گُل، ہر جلن کی ٹھنڈک اور کڑی دھوپ میں چلنے والوں کے لیے ابر سایہ دار تھیں۔ قدرت نے انہیں زبردست فراست ایمانی، معاملہ فہمی اور بصیرت عطا کی تھی۔

تحریک کی ابتدائی جانثاروں میں شامل ہونے کے ناطے انہوں نے اپنی توانائیوں کو اپنے مقصد کے لیے وقف کر رکھا تھا لیکن تدریس اور تحریر ان کے دو خصوصی میدان تھے۔ وہ خود کہتی تھیں کہ ''انسان مر کر مٹی ہو جاتا ہے لیکن اس کے لکھے ہوئے حروف زندہ رہتے ہیں''۔ یہی وہ سوچ تھی جس کے تحت انہوں نے ساری عمر قلم تھامے رکھا۔ دین کی سچّی تڑپ نے ان کے قلم کو منفرد طرزِ تحریر عطا کیا تھا جس سے انہوں نے ادبی شہ پارے تخلیق کیے۔ وہ زندگی کو نہایت غور اور گہرائی سے دیکھنے کی عادی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لٹریچر میں عمومی مثالیں بہت ملتی

ہیں۔کوشش ہوتی کہ جو بات لکھیں وہ اللہ یا اس کے رسولؐ کی بات ہو یا بزرگانِ دین کے حوالے سے ہو، اپنی بات کم سے کم کہتیں۔قلم سے کوئی حرف لکھتے ہوئے بھی احتیاط اور جوابدہی کا احساس غالب رہتا۔ان کی تحریروں میں اپنی ذات کی طرح سادگی کا عنصر نمایاں ہوتا۔سادہ مگر دلکش تحریروں نے ہزارہا لوگوں کے دل و دماغ بدل ڈالے۔

عام فہم زبان میں اسلامی تعلیمات کو خواتین تک پہنچانے کی غرض سے انہوں نے ''زندگی بے بندگی، شرمندگی'' کے عنوان سے کتابوں کی سیریز کا آغاز کیا اور اس سلسلہ کی گیارہ کتب لکھیں۔ اسلامی اخلاقیات پر مبنی عنوانات حسد، صبر، عفو و درگزر وغیرہ پر بھی گیارہ کتابچے تحریر کیے۔ساتھ ہی ساتھ بتول کے دو سلسلے ہر ماہ تحریر کر کے ارسال کرتی رہیں۔افسانے اور ناول بھی تحریر کیے جاتے رہے۔بیماری کی حالت میں، آپریشن کے بعد بستر پر بیٹھے بیٹھے بھی لکھا۔زندگی کے آخری سالوں میں شاعرہ بھی بن گئیں۔نظم و نثر میں تیس کے قریب بچوں کی کتب لکھیں۔ایک دعاؤں کی مختصر کتاب بھی ترتیب دی۔کہتی تھیں کہ ''میرے لیے دعا کرو کہ زندگی کا کوئی دن خدمتِ دین کے بغیر نہ گزرے''۔

جب لوگ پوچھتے تھے کہ آپ نے اس میدان کو کیسے منتخب کیا اور اتنی کتب کیسے لکھ دیں تو بتاتی تھیں کہ ''مجھے چھوٹی عمر سے ہی پڑھنے کا شوق تھا۔گھر میں آنے والے ہر اخبار و رسالہ کو پڑھتی، عربی تعلیم والد صاحب نے دی۔وقت گزارنے کے لیے طرح طرح کے مشاغل اختیار کیے لیکن جب مولانا مودودی کی تحریریں پڑھیں تو سب سے اہم کام یہ لگا کہ خواتین کے لیے بالکل عام فہم، دینی و اصلاحی لٹریچر فراہم کیا جائے۔جو جو موضوعات ذہن میں آتے ان کے متعلق لکھ لکھ کر مختلف فائلوں میں ڈالتی جاتی، اس طرح بہت مواد جمع ہو گیا لیکن اس کی اشاعت کے لیے والد صاحب سے بات کرنے میں جھجک محسوس ہوتی۔ایک دن ہم بہن بھائیوں میں اپنی رقومات صدقہ جاریہ کی مد میں خرچ کرنے پر بات ہو رہی تھی تو چھوٹی بہن نے رائے دی کہ سب سے اچھا استعمال اچھی کتب کی اشاعت ہے۔سب نے اس پر اتفاق کیا۔پھر اس غیبی مدد کے ذریعہ مجھے اپنا تمام مواد چھپوانے کا موقع مل گیا۔''بس مجھے ایک ہی خیال پریشان کرتا ہے کہ کہیں اس میں ریا نہ آ جائے اور ساری زندگی کی محنت اکارت نہ چلی جائے۔'' اسی خدشہ کے پیش نظر وہ نام بدل بدل کر اور کبھی گمنام طریقے سے اپنے مضامین اشاعت کے لیے بھیجا

کرتیں۔''اسوۂ حسنہ'' کو بھی سیرت نگاری کے مقابلے میں بھیجنے پر آمادہ نہ تھیں لیکن جب اس کے دعوتی مقاصد ان کے سامنے رکھے گئے تو اس پر راضی ہو گئیں اور پھر جب انعام کی رقم ملی تو وہ تمام رقم ادارہ بتول کی عمارت کی تعمیر کے لیے دے دی۔بیماری کے دوران جو بھی آتا اس سے ادارہ بتول کا حال پوچھتیں اور اس کے لیے ہدایات دیتیں۔''بتول'' رسالہ کے لیے جو عنوانات آپ کے ذمہ تھے، وہ آپ نے اپنی عمر کے آخری ماہ یعنی جون ۱۹۸۹ء تک لکھے۔

ان کو خاکہ نگاری، تاریخ نویسی، سوانح نگاری اور انشائیہ نویسی پر پوری گرفت حاصل تھی۔تحریر میں سادگی اور خلوص اس حد تک موجود ہوتا تھا کہ بات براہ راست دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔

اپنے قلمی جہاد کے ذریعہ دنیا والوں کو بڑے دلنشین انداز میں سمجھایا کہ ''زندگی بے بندگی شرمندگی'' لیکن بے عملوں اور شکستہ دلوں کو ساتھ ہی ''غم نہ کر'' کا دلاسہ دیتے ہوئے ''اسوۂ حسنہؐ'' کے مرہم کی طرف متوجہ کیا کہ دنیا و آخرت کی کامیابی اسی پر منحصر ہے۔زندگی کی رعنائیوں میں مقصدِ زندگی سے دور جانے والوں کے لیے ''نفس کا تزکیہ'' قلب و نظر کی تطہیر کا باعث بنا تو کہیں ''حبِ الٰہی'' نے بندہ کو خالق کے قرب کی لذت سے آشنا ہونے میں مدد دی۔''فکرِ آخرت'' نے احساسِ بندگی عطا کیا۔تو ''صوم و صلوٰۃ''، ''زکوٰۃ و حج'' نے بندگی کے طریقے بھی سکھلائے اور پھر اخلاق کی کرنوں سے چمکتے ''صبر''، ''عفو'' اور دیگر کتابچوں نے حسنِ اخلاق اختیار کرنے میں مدد دی۔

بحیثیت اُستاد:

تحریر کے بعد جس دوسرے میدان میں انہوں نے دعوتِ دین کی ہمہ جہتی جدوجہد کی وہ تدریس کا میدان تھا۔والد نے آپ کو گھر میں ایم اے تک تعلیم خود دی۔۱۹۵۱ء میں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ اسلامیات کا آغاز ہوا تو والد کے اصرار پر آپ نے وہاں لیکچرر شپ اختیار کی۔خود بتاتی ہیں کہ ''میں نے کالج میں ملازمت کا تصور بھی نہ کیا تھا لیکن جب والد صاحب کے اصرار پر یہاں آئی تو انکشاف ہوا کہ دین کی تبلیغ کے لیے تو یہ شعبہ بہترین نتائج کا حامل ہے''۔دین کی اشاعت کی لگن لیے آپ اس میدان میں مستقل مصروفِ جہاد رہیں یہاں تک کہ کچھ عرصے کے لیے جب تبادلہ ساہیوال کر دیا گیا تو مقصد کی لگن میں یہ تکلیف بھی برداشت کر لی۔ہفتہ کے اختتام پر گھر آتیں اور اگلے پورے ہفتہ کے کام نمٹا کر پھر ساہیوال چلی جاتیں۔

طالبات کے ساتھ ان کا رویّہ اتنا مشفقانہ تھا کہ لڑکیاں ان کی کلاس میں آنے کے لیے ضد کیا کرتیں۔ایک ساتھی استاد بتاتی ہیں کہ ’’ایک بار میں نے ان سے کہا کہ اسلامیات اختیاری کی کلاس میں بہت لڑکیاں ہوگئی ہیں اب مزید کا داخلہ بند کر دیا جانا چاہیے۔‘‘ تو انہوں نے کہا ’’انہیں مت روکو۔ان کے لیے تو میں نے اتنی دعائیں مانگی ہیں۔ میں تو کلاس میں ہر لڑکی کے اضافہ پر دو نفل شکرانہ ادا کرتی ہوں۔‘‘ طالبات کسی بھی مسئلہ کے حل کے لیے ہر وقت ان کے پاس آ سکتی تھیں۔وہ ایسا بنک تھیں جہاں لوگ اپنے تفکرات اور مسائل جمع کروا کے سکون اور اطمینان کیش کروایا کرتے تھے۔انہوں نے اپنے تدریسی دور میں ہزاروں تشنگانِ علوم کو اس طرح سیراب کیا کہ ان میں سے بیشتر فیض یافتگان خود علم و فضل کے تابندہ اور درخشندہ ستارے بن گئے۔

وہ قرآن نہ پڑھ سکنے والی طالبات کو اپنے کمرے میں شفقت سے قرآن پاک بھی پڑھاتی تھیں۔دیگر کتب کے مطالعہ سے رغبت دلاتی تھیں۔وہ سامع کے دل میں اپنی بات اس طرح بٹھا دیتی تھیں کہ سننے والوں کو یہ محسوس بھی نہ ہوتا تھا کہ مجھے پڑھایا سکھایا جا رہا ہے۔ان کی طالبات کے بقول ان کے لیکچرز دلوں پر نقش ہو جاتے تھے۔ایک طالبہ نے تحریر کیا کہ ’’میں جو زندگی کو بے مقصد طریقے سے محض ضائع کرنے میں گزار رہی تھی اور کالج کے زمانہ میں دوسروں کا مذاق اڑانا میرے لیے تفریح کا باعث تھا جب ان کی کلاس میں آئی تو ان کی سحر انگیز شخصیت نے مجھے مکمل تبدیل کر دیا۔کھلنڈرا پن ختم ہوا۔سنجیدہ مطالعہ کا شوق ہوا۔قرآن سے محبت نے جنم لیا۔اچھے شعراء کے کلام کی طرف راغب ہوئی، حالانکہ انھوں نے صرف ایک سال مجھے پڑھایا‘‘۔

’’وہ ہفتہ میں چھ دن پڑھانے کے علاوہ آنرز کی طالبات کے لیے عربی گرامر کی اضافی کلاس بھی لیتیں۔کالج میں انہی کی کوشش سے ایک چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر ہوئی۔اپنے کمرے میں ایک چھوٹی سی لائبریری بنا رکھی تھی۔ طالبات کو مطالعے کی رغبت دلاتیں اور اپنی لائبریری سے کتب لے جانے کی دعوت دیتیں۔طالبات کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کی اسلامی رنگ میں تربیت کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتیں یہاں تک کہ خود سفید دوپٹہ شلوار پر ایک ہی پرنٹ کی دو قمیصیں بنالی تھیں اور کالج میں وہی پہن کر آتیں تاکہ اپنے عمل سے طالبات کو سادگی کا درس دے سکیں۔ان کی شاگرد تاعمر ان کی شاگرد ہونے پر فخر کرتیں۔طالبات کی مالی مدد کے لیے بھی بہت

حسّاس تھیں۔کالج میں پرنسپل کی اجازت سے ہفتہ میں ایک دن سلائی کی کلاس رکھ لی تھی جس میں کالج کی ہر لڑکی کو دعوت دی گئی کہ جسے جو کچھ بھی آتا ہے وہ فی سبیلِ اللہ آ کر اس گھنٹے میں کام کر جائے۔اس میں جو میز پوش، گدیاں و دیگر چیزیں بنتیں وہ کالج کے شوکیس میں سجا دی جاتیں۔اکثر لڑکیاں یا اسٹاف ممبرز یہ چیزیں خرید لیتیں اور حاصل شدہ رقم کالج کی نادار لڑکیوں کی فیسوں اور کتابوں کے کام آتی۔خود بھی لڑکیوں کی مالی امداد میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھیں۔

اپنی ساتھی استانیوں کے لیے بھی ان کا عمل رہنمائی کا باعث تھا۔تمام اساتذہ کے ساتھ اتنا پر خلوص تعلق تھا کہ ہر ایک کو یہی گمان ہوتا کہ وہ ان کی سب سے قریبی ساتھی ہے۔ہر ایک کی بات نہایت توجہ و دلچسپی سے سنتیں اور گھریلو معاملات سے لے کر تعلیمی معاملات تک میں صحیح مشورہ دیتیں۔راز کی بہت پاسداری کرتیں اور کبھی کسی کی بات دوسروں تک نہ پہنچنے دیتیں۔پیریڈ کی گھنٹی بجتے ہی کلاس لینے کے لیے روانہ ہو جاتیں۔باتیں کرنے والی ٹیچرز کے قریب سے گزرتے ہوئے کہتیں۔’’کڑیو حلال نہیں جے کھانا؟ (لڑکیو حلال کر کے نہیں کھانا؟) حساب کتاب کی اتنی فکر ہوتی کہ ٹیچر کے دو دو پیسے بھی اگر ان کی طرف ہوتے تو واپس کرتیں اور کہتیں۔’’اپنا حساب صاف کرلو۔ورنہ حشر میں تو سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی‘‘۔تفریح کے وقفہ میں اساتذہ کے لیے ایک خصوصی کلاس شروع کر رکھی تھی جس کا مقصد تعلیم یافتہ طبقے کو اسلامی نظامِ زندگی کی سمجھ دینا تھا۔

حُسنِ اخلاق:

تحریر کا میدان ہو یا تقریر کا، انسان کے الفاظ میں تاثیر اس کے عمل کی بدولت ہی پیدا ہوتی ہے اور بنت الاسلام صاحبہ کی زندگی اس پر گواہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے جتنے دلآویز ظاہر سے نوازا تھا آپ نے اسی کے مطابق دلآویز باطن بھی اختیار کر لیا تھا۔ان کی شخصیت میں ایک حسن اور سحر تھا۔جو اِن سے ملتا ان کے حسنِ اخلاق اور محبت بھرے سلوک کا ضرور گرویدہ ہو جاتا۔انہوں نے اپنے خیالات کو برائیوں سے پاک کر لیا تھا۔ان کی نظر میں کوئی برا نہ تھا۔ برا تھا تو وہ فعل برا تھا جو کسی سے کسی وقت سرزد ہو گیا تو انسان کہاں برا ہوا؟ کبھی کسی نے انہیں سخت لہجے میں بات کرتے، غصّہ کرتے یا برا بھلا کہتے ہوئے نہیں دیکھا۔آپ ہر زیادتی کرنے والے کو اس فکر میں معاف کر دیتیں کہ ’’اگر اللہ نے مجھے میرے گناہوں کے بدلے معاف نہ کیا تو پھر؟‘‘ انہیں تعلق بنانے

اور نبھانے کا فن آتا تھا۔ بات کرنے والی کا ہاتھ تھام لیتیں اور جب تک وہ خود نہ چھڑائے، ہاتھ نہ چھوڑتیں۔ بات کرتے ہوئے محبت سے مخاطب کا نام بار بار لیتیں جس سے مخاطب بے حد اپنائیت محسوس کرتی۔ ایک دوست بتاتی ہیں کہ ایک دفعہ میں ان سے ملاقات کے لیے گئی اور ان سے اکیلے میں اپنی ایک پڑوسن کی شکایت بیان کرنا چاہی تو مرحومہ نے اپنے ہاتھ سے میرا منہ بند کر دیا۔ بات وہیں رہ گئی۔ نہ میں بیان کر سکی، نہ انہوں نے سننا گوارا کیا۔ ایک خاتون انہیں اپنے سسرال کی تلخیوں کی تفصیل سنانے لگیں تو اس کو سمجھایا کہ ''ہر اچھے مال کی زکوٰۃ ہوتی ہے۔ تم سمجھو کہ اتنا اچھا شوہر ملنے پر سسرالی تلخیوں کو برداشت کرنا ادائیگی زکوٰۃ ہے۔

فرمانبردار بیٹی:

بچپن سے بڑھاپے تک اپنے اردگرد موجود لوگوں کے لیے محبت کا زمزمہ بنی رہیں۔ والدین کی انتہائی فرمانبردار اور خدمت گزار بیٹی تھیں۔ والدہ کینسر کا شکار ہوئیں تو ان کی تیمارداری کے لیے دن رات ان کے ساتھ رہتیں۔ رات کو باتھ روم میں لالٹین جلا کر رکھتیں کہ زیادہ روشنی سے کہیں وہ بے آرام نہ ہوں۔ اسی دوران انہوں نے اسوۂ حسنہ کی تین ضخیم جلدوں کو مکمل کیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد والدہ کو پاس جا کر دیکھتیں کہ کہیں انہیں کسی چیز کی حاجت نہ ہو۔ یہی حال اپنے والد کی بیماری کے دوران بھی رہا جو شوگر کے مریض تھے۔ بیمار ہوتے تو رات رات بھر جاگتی رہتیں۔ ہلکی سی آہ پر بھی فوری ان کے پاس جا کھڑی ہوتیں۔ والدین کی اتنی خدمت کے باوجود ہمیشہ یہی سمجھتیں کہ ان سے حق ادا نہ ہو سکا اسی لیے انہوں نے اپنی تمام تر تالیفات وتصنیفات کو اپنے والدین کے نام منسوب کر دیا۔

شفیق بہن:

گھر میں سب سے بڑی تھیں اور چھوٹے تمام بہن بھائیوں سے انتہائی محبت کرتی تھیں۔ والدہ کے ساتھ چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالتیں۔ روتے بلکتے بچے اِن کے نرم ہاتھوں اور گود سے اتنے مانوس تھے کہ گود میں آتے ہی چپ ہو جاتے۔ انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کے لیے سبق آموز کہانیاں لکھیں جن کو پرکشش بنانے کے لیے ان کے پیرا گراف پر مختلف رنگوں سے پھول بنا دیتیں تاکہ پرکشش لگیں اور بچے شوق سے پڑھیں۔ انہیں قرآن پاک پڑھانے

کے ساتھ ساتھ اسکول کے کام میں بھی مدد دیتیں۔ چھٹی کے دن بچوں کا اجتماع رکھتیں جس میں محلے کے بچے بھی شرکت کرتے۔ اس میں خود پروگرام کراتیں۔ ایک رپورٹ فارم بھی خود سے بنا کر بچوں کو دیتیں جس میں اچھے اور برے کام کے کالمز بنے تھے۔ ہفتہ بھر کے بعد اجتماع کے دن بچے اپنی رپورٹیں سناتے اور جس کی رپورٹ سب سے اچھی ہوتی اسے انعام دیا جاتا۔

بہن بھائیوں کی یہ محبت سدا ان کے دل میں جوان رہی۔ چھوٹی بہن سعیدہ بتاتی ہیں کہ جب والد نے مجھے اسکول کے بعد کالج میں داخلے کی اجازت نہ دی تو آپا نے میری پڑھائی کی ذمہ داری لے لی۔ انتہائی پیار کے ساتھ باقاعدگی سے مجھے پڑھاتیں اگر کبھی میں سو جاتی تو میری ٹانگیں دباتیں۔ میں شرمندہ ہو کر اٹھ جاتی تو کہتیں کہ ''کوئی بات نہیں۔ تم اچھی طرح نیند پوری کر لو پھر پڑھائی بھی اچھی ہوگی''۔

جب بہن بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں تو ان سب کی خیر وعافیت کے لیے روزانہ ہر ایک کے نام صدقہ نکالتیں اور مہینہ بھر بعد خیرات کر دیتیں۔ چھوٹی بہن عفت کے شوہر محترم کا اچانک انتقال ہوا تو اسے سینے سے چمٹا کر کہا۔ ''صبر۔صبر۔صبر۔ اصغر تو ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ اب تم اللہ کو اپنا ساتھی بنا لو۔ وہی تمہارے سب کام سنوارے گا''۔ عفت بتاتی ہیں کہ ان کی صبر کی تلقین سے جیسے میرے دل میں ایک ٹھنڈ سی پڑ گئی اور پھر اللہ ہی پر توکل نے تمام کاموں کو سنوار دیا۔ چھٹی کے دن سب بہن بھائیوں کی اولادوں کو 'فصیح منزل' میں اکٹھا کر کے دینی تعلیم کا درس دیتیں۔ سب بچے اپنی ''بی بی خالہ'' پر فدا تھے۔ کہتے تھے کہ ''ان کے سمجھانے سے دین مشکل معلوم نہیں ہوتا''۔ بہن بھائیوں کی اولاد سے بھی بے تحاشا محبت کرتی تھیں۔ ایک دفعہ بھانجی کو روتا دیکھا تو خود رونے لگیں۔ بہن سے کہا۔ ''تم ان کے ساتھ سختی سے پیش نہ آیا کرو۔ مجھ سے ان کے آنسو دیکھے نہیں جاتے۔ انہیں روتا دیکھ کہ میرا دل کٹنے لگتا ہے۔ باہر کا ماحول بڑا سخت ہے۔ انہیں مجبوراً ایسے ماحول میں بھیجنا پڑتا ہے۔ ہمارے بچے لاکھوں سے بہتر ہیں۔ دعا مانگا کرو اللہ انہیں اپنی حفاظت میں رکھے''۔

ذمّہ دار بیوی:

شادی کے بعد ہمیشہ شوہر محترم کے حقوق پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ نبھانے کی کوشش

رہی۔ ان کے شوہر گواہی دیتے ہیں کہ ''صبر وتحمل اس رفعتِ کردار کی اوّلین کرن تھی جو اس ماہتاب زہد سے پھوٹتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ احترامِ رفاقت کی صدائے باوقار تھی۔ ذاتی رائے کو اُنہوں نے رضائے رفیق میں اس طرح مدغم کر دیا تھا گویا ہر معاملہ میری ہی صوابدید پر منحصر تھا۔

دنیاداری یا ظاہرداری کا گزران کے کوچۂ زیست سے ممکن نہیں تھا۔ میری والدہ ماجدہ کا احترام بھی انہوں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ ساس اور بہو کے روایتی تعلق کی جھلک کبھی لمحہ بھر کے لیے بھی دکھائی نہ دی۔ میں نے والدہ محترمہ کو کبھی ان سے شاکی نہ پایا، حالانکہ یہ رفاقت چودہ پندرہ برس پر محیط تھی۔ بیٹی سے انہیں بے پناہ محبت تھی لیکن ممتا ان کو ادائے فرض سے کبھی غافل نہ کر سکی۔ اولادِ نرینہ کی عدم موجودگی کو انہوں نے کبھی ''محرومی'' سے تعبیر نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک جو کچھ تھا من جانب اللہ تھا۔

اسی پاکیزہ عقیدے کا مظاہرہ انہوں نے اپنی بیماری کے دوران کیا۔ انتہائی قسم کی جسمانی اذیت وایذا کے باوجود ہائے وائے کے کلمات کبھی ان کے منہ سے نہیں نکلے جب کبھی ذرا سا بھی افاقہ ہوا وہ حسبِ معمول تحریر وتالیف میں منہمک ہوگئیں گویا انہیں کوئی بیماری تھی ہی نہیں''۔

دوست ماں:

ان کی بیٹی کہتی ہیں کہ ''گھر میں بہن بھائیوں کی کمی کو امّی نے ایک بہن اور ایک سہیلی کی طرح پورا کرنے کی کوشش کی۔ میرے ساتھ کھیلنا، گڑیوں کی شادی کرنا، کہانیاں سنانا ان کے معمولات میں سے تھا۔ لکھنے کا شوق دلاتیں۔ میری سہیلیاں اکثر گھر آتیں تو ان کی بہت خاطر مدارت کرتیں۔ چند لمحے بھی انہیں فارغ ملتے تو کوئی کتاب ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ میری زندگی کسی قسم کی ڈانٹ ڈپٹ سے ناآشنا گزری۔ جب سے آنکھیں کھولیں ایک نرم اور شفیق وجود کو اپنے گرد پایا۔ صدموں نے کبھی ان کے حوصلے پست نہیں کیے۔ کبھی ان کی قوتِ ارادی کو متزلزل نہیں کیا''۔

فیاضی:

گھر والوں کے ساتھ ساتھ گھر کے ملازمین کا بھی بہت خیال رکھتیں۔ اپنے گھر والوں اور کام کرنے والوں کے کھانے پینے میں ذرا فرق نہ رکھتیں۔ کوئی خادمہ بیمار ہو جاتی تو اس کی بھی گھر کے افراد کی مانند خدمت کرتیں۔ لوگوں کے لیے نفع بخش ہونے کا جذبہ ان کے اندر ہر وقت

موجزن رہتا۔ اللہ کے راستہ میں اتنا چھپ کر دیتیں کہ ان کے قریب رہنے والوں کو بھی پتا نہ چلتا تھا کہ وہ کس کس کی مدد کر رہی ہیں؟ کسی کے گھر کا بجلی کا بل ادا کر دیتیں، کسی کو آٹا لے دیتیں، کسی کی اسکول فیس ادا کر دیتیں۔ گو کہ ایک رجسٹر میں سارا حساب لکھ رکھا تھا لیکن لینے والوں کا اصل نام نہیں لکھتی تھیں۔ کہیں ''ز'' کے لیے، کسی پر ''الف'' کے لیے، کسی جگہ استانی جی کے لیے کا حوالہ تھا۔ آخر وقت میں اپنی بہن کو یہ رجسٹر سپرد کر کے حسابات سمجھائے تو اس بات کا علم ہو سکا۔

سُنّت پر عمل:

اپنی زندگی کے شب و روز ہمیشہ سنّتِ رسولؐ کے مطابق گزارنے کی کوشش میں لگی رہتیں۔ طاق کا عدد ہمیشہ پسند کیا۔ کلّی کرنے سے سوئیٹر کے خانے ڈالنے تک اس کا خیال رکھتیں یہاں تک کہ کھانا پکاتے ہوئے لونگ اور مرچ بھی طاق مقدار میں ڈالتیں۔ روزانہ رات کو سنّت کے مطابق سرمے کی تین تین سلائیاں اپنی آنکھوں میں لگاتیں جس کی برکت سے اتنا پڑھنے لکھنے کے باوجود آخر عمر تک چشمہ نہ لگا۔

احساسِ امانت:

لین دین اور حساب کتاب ہمیشہ لکھ کر کیا اور صاف ستھرا رکھا۔ ایک رجسٹر میں ہر قسم کے حساب معہ تاریخ اور ناموں کے لکھ کر رکھتیں۔ ہر وقت فکر رہتی کہ پتا نہیں آخری وقت کب آجائے اس لیے حساب اس طرح لکھا ہوا ہو کہ پیچھے رہ جانے والوں کو سمجھنے میں مشکل نہ پیش آئے۔ وفات سے چند دن قبل رجسٹر سامنے رکھ کر بہن کو ایک ایک چیز سمجھا کر گئیں۔

علم سے محبت:

عیدین کے مواقع پر دل کھول کر تحائف دیتیں۔ کتابوں سے انہیں بے حد محبت تھی۔ ہزاروں روپے کی کتب تحفے میں بانٹ دی جاتیں۔ بے حد مطالعہ کرنے کے باوجود وہ اس پر قانع نہ تھیں، ہر مصنف اور نئی کتاب کو ذوق وشوق سے پڑھتیں۔ عربی زبان سے بے حد محبت تھی۔ دوسروں کو یہ زبان سکھانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتیں۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد اسلامیہ پارک کی خواتین کے اصرار پر ان کے لیے ہفتہ وار درس کا آغاز کیا۔ خواتین کی طرف سے عربی پڑھنے کی خواہش کا اظہار ہوا تو ایک گھنٹہ اس کے لیے مختص کر دیا۔ آسان طریقے پر

سبق تیار کر کے لاتیں اور نہایت شفیق انداز میں پڑھاتیں۔اس میں ناغہ نہ ہونے دینا آپ کا اصول تھا۔بعض مرتبہ بارش کے باعث چند ہی خواتین کلاس میں آئیں تو بھی آپ نے اسی شوق و جذبے سے عربی بھی پڑھائی اور درس بھی دیا۔ بیماری کے بعد تکلیف و کمزوری کے باوجود مستقل آتیں۔کوئی آرام کا کہتا تو اس سے کہتیں،''اس محفل میں آ کر تو میں اپنی بیماری بالکل بھول جاتی ہوں۔اس دن کا تو مجھے انتظار رہتا ہے''۔جب آپ کی کوئی نئی کتاب چھپ کر آتی تو اپنی عربی کلاس کی شاگردوں کو ضرور دیتیں۔

سادگی:

عجز وانکساری وسادگی نمایاں خوبی تھی۔حیاان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔سفید شلوار اور سفید دوپٹہ ہمیشہ لباس بنا رہا،جس پر مختلف پرنٹڈ قمیضیں بنالی جاتیں۔

پاکستان اور امتِ مسلمہ سے محبت:

یہ آپ کی شخصیت کا بڑا نمایاں وصف تھا۔پاکستان سے بے حد محبت کرتی تھیں اور کسی کے منہ سے پاکستان کی برائی نہیں سن سکتی تھیں۔صبح روز آیت الکرسی پڑھ کر چاروں کونوں میں پھونک مارتیں کہ''اللہ میرے ملک کو سلامت رکھنا۔دائیں بائیں اوپر نیچے سے میرے وطن کی حفاظت کرنا۔ کوئی اسے میلی آنکھ سے نہ دیکھے''۔''ملک کے وسائل کی قدر اور حفاظت پر دوسروں کو ہر وقت متوجہ کرتی رہتی تھیں۔سمجھاتی تھیں کہ''اگر ہم اپنے ملک کی گیس،بجلی اور پانی اور دیگر نعمتوں کو ضائع کریں گے تو اللہ کے ہاں دہرے مجرم ٹھہرائے جائیں گے۔ایک اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کی ناشکری کے اور دوسرے اپنے ملک کے ساتھ ناانصافی کے مرتکب گردانے جائیں گے''۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں بے پناہ قومی جذبات سے کام کیا۔۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران کالج میں فوجیوں اور متاثرہ خاندان کی امداد کے لیے کیمپ قائم کیا جہاں ان کی ضرورت کی اشیا اکٹھی اور پیک کی جاتی تھیں۔طالبات کو لحاف میں ڈورے ڈالنا سکھائے۔۱۹۷۱ء کے المیہ پر دلی درد کے باوجود انہوں نے بہت استقامت سے کام لیا اور غمگین طالبات،استانیوں اور دیگر خواتین کو ہندہ کی مثال یاد دلائی جب غزوہ بدر میں کفار کی شکست پر اس نے عہد کیا تھا کہ جب تک میں اس شکست کا انتقام نہیں لے لوں گی،آنسو نہیں بہاؤں گی تاکہ میری آتشِ

انتقام سرد نہ پڑ جائے۔وہ زور دیتی تھیں کہ''آنسوؤں سے آتشِ انتقام کو ٹھنڈا نہ کریں بلکہ اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف ولولہ تازہ رکھیں''۔ساتھ ہی طالبات کو یہ تاکید بھی کرتی رہیں کہ''اس قومی بحران کے موقع پر ہم سب کو اپنے معیارِ زندگی میں کمی کرنی چاہیے۔اپنی حیثیت سے کم لباس پہنیں،غیر ملکی مصنوعات کا استعمال چھوڑ دیں،ہر طالبہ یہ عہد کرے کہ جب تک ملک کے حالات درست نہیں ہوتے وہ کوئی نیا لباس نہیں بنائے گی۔بجلی کے استعمال میں بھی بچت کرنا چاہیے تاکہ قومی سرمایہ ضائع نہ ہو''۔

اس صبر واستقامت کے پیچھے پوشیدہ حزن و ملال ان کی تحریروں سے جھلکتا نظر آتا ہے جب وہ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی''میں یوں رقم طراز ہوتی ہیں.....!

''اے چمکنے والے تارو!تم کاہے کے لیے یوں لرز رہے ہو؟تمہاری سرزمین پر تو کسی نے حملہ نہیں کیا ہے۔تمھیں تو اپنے وطن کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔تمہارے ہاں تو کوئی کھلا اور چھپا غدّار پیدا نہیں ہوتا،تمہارے ہاں تو حرص وآزار کے مارے لیڈر نہیں ہوتے جو کروڑوں کی آبادی کو داؤ پر لگا دیں۔تم کیوں کانپ رہے ہو؟تم کیوں لرزہ براندام ہو''۔

''وہ ستائیسویں کی رات تھی۔یادگار رات۔جب بارہ بجے تو ایک دم فضا بدل گئی۔یہ ریڈیو پاکستان ہے۔آہ تم کیا جانو۔یہ نغمہ کتنا شیریں تھا۔ہماری غلامی کی زنجیریں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔کھڑکھڑاتی۔کھنکھناتی زنجیریں ٹوٹ کر گر رہیں تھیں۔ہم آزاد ہو رہے تھے۔ پورے کے پورے آزاد۔اس وقت بھی آدھی رات ہے۔بارہ بھی بج چکے ہیں۔مگر نعرے کیوں نہیں سنائی دے رہے؟مگر نعرے کہاں سے سنائی دیں؟وہ بننے کی رات تھی۔یہ ٹوٹنے کی رات ہے۔مسلمانو!تمہیں کیا ہو گیا ہے کیا تم واقعی راکھ کا ڈھیر ہو چکے ہو؟تم نے کیسے توڑ لیا اس شے کو جسے تم نے اتنی کاوش،جدّ وجہد،قربانیوں کے بعد حاصل کیا تھا؟''

مسلمانوں کے قومی اور عالمی دکھوں کی ٹیسیں وہ اپنے دل میں محسوس کرتیں۔مسلم ممالک کے حالات سے پریشان رہتیں لیکن امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑتیں اور یہی کہتیں کہ''ان شاء اللہ خدا اپنے دین کی حفاظت کرے گا۔تاریخ اسلام میں پہلے بھی نشیب وفراز آتے رہے ہیں۔''

اپنی ذات میں صالحیت وجاذبیت،سکینت وعافیت کے انمول خزانے سمیٹے ہوئے اللہ کی

بندی دن کو طالبات کی کردار سازی اور رات کو قلم چلاتی رہی۔

بیماری پر صبر:

ان کا یہ مشن جاری تھا کہ اللہ نے انہیں ایک امتحان کے لیے چُن لیا جس کا اندازہ تو ہو رہا تھا، لیکن اہلِ خانہ کی پریشانی کے باعث اس پر اب تک پردہ ڈالتی آئی تھیں اور ان کے جسم میں کینسر آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ آپ پیارے نبیؐ کی آیاتِ شفا پڑھ کر اس پر پھونکتی رہیں اور اپنے جہاد میں لگی رہیں لیکن جب ''اسوہ حسنہ'' پر کام کرتے ہوئے ''خودکشی'' کے موضوع پر احادیث نظر سے گزریں تو اس خیال نے ذہن میں سر اٹھایا کہ کہیں اس بیماری کو چھپا کر اس جرم کی مرتکب نہ ہو رہی ہوں لہٰذا اس وقت گھر والوں اور بہن بھائیوں کو اس سے مطلع کیا۔ ڈاکٹرز نے ان کی اتنی پھیلی ہوئی بیماری کے ساتھ ان کے زندہ رہنے کو معجزہ قرار دیا تو انہوں نے اس کی وجہ آیاتِ شفا کو قرار دیا جو وہ پڑھ کر اس پر پھونکتی رہی تھیں۔

بیماری سامنے آنے پر اس کا طویل علاج شروع ہوا جس کا سامنا اسی صبر وتحمل سے کیا جو آپ کی پوری زندگی کا خاصہ تھا۔ جیسے وہ زندگی بھر اپنی کسی تکلیف، مصیبت، کسی رنج وغم، کسی دلآزاری کا ذکر زبان پر نہ لائیں اسی طرح زندگی کے اس آخری دکھ کو بھی انہوں نے عزم و ہمت کے ساتھ جھیلا۔ زبان کو ایک آہ، ایک سسکی سے بھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ تمام بیماری کے دوران کبھی منہ سے یہ نہ کہا کہ ''مجھے بہت تکلیف ہے۔'' تکلیف کے باوجود ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتیں اور اس کا اور اس کے بچوں کا حال چال پوچھتیں۔ دعا پر بہت زور دیتیں۔'' ہمیشہ یہی کہا کہ ''میرا دل اس دنیا میں ایک دن بھی نہیں لگا۔ جب بھی آخرت کا سوچتی ہوں تو دل خوش ہو جاتا ہے کہ وہاں نہ ملک کے مسائل کی پریشانی ہوگی، نہ رشتہ داروں کے جھگڑے، نہ جھوٹ نہ فریب، جیسا انسان چاہے گا ویسا ہی ہوگا۔'' ایک پورے دن سانس انتہائی خراب رہا۔ اگلے دن طبیعت قدرے بہتر ہوئی تو کہا کہ ''مجھے فکر ہے تو بس اس بات کی کہ کہیں طبیعت خدانخواستہ اتنی خراب نہ ہو جائے کہ میں بےصبروں میں سے ہو جاؤں اور کوئی غلط لفظ میرے منہ سے نکل جائے۔ آپ سب دعا کریں کہ اللہ مجھے آخری دم تک صابروں میں رکھے اور اتنی تکلیف نہ دے جو میری قوت برداشت سے باہر ہو جائے''۔

اس تمام عرصہ میں بھی حدود اللہ کی پاسداری کے لحاظ سے مکمل طور پر حساس رہیں۔ بروقت نمازیں پڑھنے کی فکر رہتی۔ کبھی شک پڑ جاتا تو اگلی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھتیں، سب سے زیادہ فکر فجر کی نماز کی ہوتی۔ تین بجے ہی سے اٹھ بیٹھتیں۔ پھر فجر کی نماز پڑھ کر ہی سوتیں۔ بیماری کے دنوں میں رنگ خوب نکھر آیا۔ تمام داغ دھبے مٹ گئے۔ جلد موتی کی طرح صاف شفاف ہوگئی۔ ایک روز انہیں شدید تکلیف میں دیکھ کر چھوٹی بہن صفی سخت دلبرداشتہ تھی تو ایک ساتھی ڈاکٹر خاتون نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ''جب ہم لوگ امتحان میں کسی لائق طالب علم کو امتیازی پوزیشن دینا چاہتے ہیں تو سوال پوچھ پوچھ کر اس کا حشر کر دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی آپا جی کو امتیازی مقام دینا چاہتا ہے جب ہی انہیں آزما رہا ہے۔'' ان کی یہ بات سو فیصد درست ثابت ہوئی اور خالقِ حقیقی نے جب انھیں اپنے پاس بلانا چاہا تو فرشتے اس خاموشی سے ان کی پاک روح کو اپنے ساتھ لے گئے کہ قریب بیٹھ کر کھانا کھاتی ہوئی دونوں بہنوں کو بھی خبر نہ ہو سکی۔ بیشک اللہ نے اس وعدہ کو پورا کر دکھایا کہ مومن کی جان اتنی آہستگی سے نکلتی ہے گویا خوشبو کی شیشی کا ڈھکن کھلے اور خوشبو بےآواز باہر آ جائے۔

دم واپسیں

۹ جون ۱۹۸۹ء کو یہ چراغ احتیاط سے سچے موتی کی طرح کپڑوں میں لپیٹ کر رکھ دیا گیا جس نے ہزاروں چراغ جلائے تھے جو روشن رہیں گے اور جب ان کا وقت ختم ہونے لگے گا تو وہ دوسروں کو روشن کر جائیں گے اور اس طرح محبت کا یہ سفر، سوزِ دل کی یہ لہر اور بندگی کی یہ ہوا، یہ ''بادِ نسیم'' تا ابد چلتی رہے گی۔ ان شاء اللہ!

ماخذات

''بنت الاسلام''۔ مرتبہ۔ سلمیٰ یاسمین نجمی
بتول۔ بنت الاسلام نمبر۔ جون ۱۹۹۰ء
''چراغِ اشک'' مصنفہ بنت الاسلام

&

احمدیہ بیگم

۱۹۲۹ء تا ۲۰۱۲ء

)

4

زندگی میں تو محبت و مشقت اور خدمت ان کا مستقل اصول تھا ہی، ان کی وفات بھی پورے خاندان کی یکجائی کا باعث بن گئی۔ ہر ایک یہی کہہ رہا تھا کہ ''آج ہمارے خاندان کی روشنی رخصت ہو گئی''۔ ان کی وفات کے تیسرے دن عصر کے وقت شہد کی مکھیوں کا ایک غول آیا، آخری دعا کرنے والوں کے سروں پر سایہ کیا اور ایسے محسوس ہوا جیسے سب کے سروں پر شہد کا اسپرے ہو گیا ہو۔ پھر وہ غول ایک طرف اُڑ کر چلا گیا۔ ہر ایک نے اس موقع پر یہی محسوس کیا کہ گویا زندگی میں محبتوں کی مٹھاس تقسیم کرنے والی نے وفات کے بعد بھی شہد کی مٹھاس تقسیم کر دی۔

4

مردان شہر سے ملحقہ دیہات کے ایک مکان کے صحن میں ایک لڑکا چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ہتھیلی پر نکلے ہوئی ایک دانے کے باعث انتہائی بے چین تھا۔ اس کے قریب ہی ایک مہربان وشفیق خاتون سرہانے بیٹھی ہوئی اس دانے کے گرد اپنی انگلی گھمائے جارہی تھیں۔ اس عمل سے بچّے کو کچھ سکون مل رہا تھا۔ دن بھر کے کاموں سے نڈھال وہ خاتون اس عمل کے دوران کبھی کبھی اونگھ جاتیں تو درد سے بے چین بچّہ انھیں پھر اٹھا دیتا اور وہ پھر اس کے ہاتھ کو سہلانے لگتیں۔ اس طرح بچّہ کی تیمارداری میں انھوں نے پوری رات جاگ کر گزاری۔ یہ بچّہ ان خاتون کے شوہر کا بھتیجا تھا اور اسے اپنی مہربان چھاؤں مہیّا کرنے والی ذات احمدیہ بیگم صاحبہ کی تھی جو رکنِ جماعت اسلامی خیبر پختونخوا افضل معبود صاحب کی ہمشیرہ تھیں اور جنہیں صوبے کی پہلی خاتون رکن بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔

ابتدائی تعارف:

احمدیہ بیگم اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ وہ مردان کے قریب ایک گاؤں طورو شہادت پور کی رہائشی تھیں۔ برابر میں ہی ان کے چچا کا گھر تھا جہاں ایک رات ڈاکو آ گئے تو چچی نے مدد کے لیے آوازیں دیں۔ ان کے والد مدد کے لیے بھائی کے گھر گئے تو ڈاکو نے گولی مار کر انھیں شہید کر دیا۔ چھوٹی سی عمر میں یتیمی کے سانحہ سے گزرنا پڑا۔ ایسے میں بڑے بھائی فضل معبود صاحب نے جو اس وقت نویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھے، خاندان کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی۔ احمدیہ بیگم کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ انھیں بھی اسکول میں داخل کرا دیا گیا لیکن ابھی چوتھی کلاس ہی پاس کی تھی کہ خاندان کے دباؤ کے پیشِ نظر انھیں اسکول سے اٹھا لیا گیا لیکن فضل معبود صاحب نے جہاں ایک طرف اپنی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا، وہیں بہن کو بھی گھر میں پڑھاتے رہے۔ تعلیم کے بعد فضل معبود صاحب جہاں ملازمت اختیار کرتے، چھوٹی بہن کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ اسی دوران انھیں مولانا مودودیؒ کی کتب پڑھنے کا موقع ملا۔ سعید روح نے سعید دعوت کو فوراً ہی قبول کر لیا اور جب وہ جماعت اسلامی کے اِلہ آباد میں ہونے والے تاسیسی اجتماع میں شرکت کے لیے گئے تو احمدیہ بیگم کو بھی ساتھ لے گئے

اور یوں وہ بھی جماعت اسلامی کے ''سابقون الاوّلون'' کا حصّہ بن گئیں۔

دعوت کا آغاز:

دونوں بہن بھائیوں نے واپس آ کر اپنے علاقے میں دعوت دین کو پھیلانے کا کام شروع کر دیا۔ ابتدا میں احمدیہ بیگم صاحبہ خود درس نہ دے پاتی تھیں۔ گھر میں درس رکھا جاتا تو بھائی فضل معبود صاحب پردے کے پیچھے سے درس دیتے۔ جماعت کے قریبی ساتھیوں کے گھروں کی خواتین ان دروس میں شرکت کرتیں۔ محلے کی خواتین کو بھی دعوت دی جاتی۔ ہر ہفتہ اس سلسلے کو تسلسل سے جاری رکھا گیا اور بعد میں ان دروس کا دائرہ دیگر مقامات تک وسیع ہو گیا۔ فضل معبود صاحب نے اپنی ہمشیرہ احمدیہ صاحبہ کو بھی درس دینا سکھایا اور خود انھیں لے کر درس کے مقام تک جاتے تھے۔ وہ اندر درسِ قرآن دیتیں اور وہ باہر بیٹھے رہتے اور پھر انہیں ساتھ لے کر واپس آتے۔ احمدیہ بیگم صاحبہ کا تحریری رابطہ مرکزی نظم جماعت سے قائم تھا۔ وہاں سے ملنے والے نصاب کا وہ باقاعدگی سے مطالعہ کرتیں اور ملنے والی ہدایات کی روشنی میں اپنا کام جاری رکھتیں۔ جماعتی لٹریچر کا مطالعہ، دعوتِ دین کا پھیلاؤ اور قیام پاکستان کے دوران مہاجرین کی امداد و آبادکاری جیسے کاموں کا سلسلہ ان کی شادی تک جاری رہا۔ ۱۹۵۱ء میں ان کی شادی ایک ایسے روایتی گھرانے میں ہوئی جہاں خواتین کا گھر سے نکلنا، اخبار پڑھنا، خطوط بھیجنا غیرت وعزت کیخلاف سمجھا جاتا۔ اگرچہ شوہر ان کے کاموں کو پسند فرماتے تھے اور اس میں معاون تھے لیکن مضبوط خاندانی نظام کے دباؤ کے آگے وہ بھی مجبور تھے۔ ان حالات میں احمدیہ بیگم صاحبہ کی رہنمائی مولانا مودودی کے ان الفاظ نے کی کہ ''آپ پانی کی مانند بنیے جس کی راہ میں کتنی ہی چٹانیں کھڑی کر دی جائیں وہ اپنا رستہ بنا ہی لیتا ہے''۔ آپ نے گھریلو نظام میں کسی تنازع کی بنیاد رکھنے کے بجائے آئندہ کی نسل میں سے مجاہد و مجاہدات نکالنے کی منصوبہ بندی کی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی خدمت اور اخلاق سے خاندان والوں سے قربت اختیار کی۔ ایسے میں قیّمہ حلقہ خواتین کے یہ الفاظ بھی آپ کو اپنی جگہ جمائے رکھنے کا باعث بنے جس میں سہ ماہی نصاب کے ساتھ ارکان بہنوں کو نصیحت کی گئی تھی کہ ''صراطِ مستقیم اور راہِ حق پر آپ کے قدم مضبوطی سے جمے رہیں۔ حق ہی کو حق سمجھیں

اور اوّلیت دیں۔ اپنے بہترین اسلامی اوصاف اور دل جیت لینے والے اخلاق اور مضبوط کردار سے لوگوں کے سامنے بہترین داعی کا نمونہ پیش کریں''۔

بہترین بیوی و بہو:

شادی کے وقت شوہر اسٹیشن ماسٹر تھے۔ بیس سالہ سروس کے بعد انہوں نے ریٹائرمنٹ لے لی اور قانون پڑھ کر وکالت شروع کر دی اور ہائیکورٹ کے وکیل کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ میری کامیابی کا تمام سہرا احمدیہ بیگم کے سر ہے جنہوں نے اس دوران مجھے ہر قسم کے مسائل سے مبّرا رکھا۔ ذہنی سکون کے باعث میں یکسوئی کے ساتھ تعلیم حاصل کر کے اُن چند لوگوں میں شامل ہو سکا جنہوں نے فرسٹ ڈویژن میں قانون کا امتحان پاس کیا تھا۔

شادی کے بعد دس سال تک اولاد نہیں تھی تو احمدیہ بیگم نے مثالی صبر کا مظاہرہ کیا۔ آپ شوہر سے کہتی تھیں کہ وہ دوسری شادی کر لیں، اولاد تو امتحان کا پرچہ ہوتی ہے، اللہ مجھے اس امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ احمدیہ بیگم کے حُسن سلوک سے اُن کے شوہر اور ساس ان کے اتنے گرویدہ تھے کہ ان کے سوا کسی دوسری عورت کو لانے کے لیے تیار نہ تھے اور دعا کرتے تھے کہ ان ہی کے طفیل اللہ انہیں اولاد عطا کر دے۔ اللہ نے ان کی دعا کو سنا اور انہیں اولاد سے نوازا۔

ان کے شوہر آپ کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ انہوں نے میری والدہ اور میرے خاندان کی بہت خدمت کی ہے۔ میں اللہ کی ذات سے اُمید کرتا ہوں کہ اس کے بدلے اللہ تعالیٰ انہیں جہنم کی آگ سے بہت دور رکھیں گے۔

بچوں کی تربیت:

اللہ تعالی نے اولاد کی نعمت سے شادی کے گیارہ سال بعد نوازا، اللہ تعالیٰ نے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا تو اپنے داعیانہ جذبات اپنی اولاد میں منتقل کرنے شروع کر دیے۔ بچوں کو شروع سے وقت کی اہمیت اور اس کے بہترین استعمال کی تاکید کی۔ نصیحت کرتی تھیں کہ ''تھوڑا وقت بھی ملے تو کوئی کتاب اخبار یا رسالہ پڑھا کرو جس سے کوئی اچھی بات سیکھ سکو''۔

بچوں کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پہ توجہ رکھتیں۔ اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتیں اور دن

بھر کی تفصیل پوچھتیں اور یاد کرائی ہوئی سورتیں سنتیں۔ ساتھ کھیلنے والے دوستوں اور لائبریری سے پڑھنے کے لیے لائی گئی کتابوں پہ بھی نظر رکھتیں۔

بچوں کو دوسروں کے بارے میں باتیں کرنے سے روکتی تھیں۔ بچوں کو آہستہ آہستہ تحریکی لٹریچر پڑھایا۔ بچّیوں کو جمعیت طالبات میں بھیجا۔ بچّی خود درس دینے کے قابل ہوئی تو گھر میں خاندان کی بچّیوں کو بلا کر درس کرواتیں۔ بچّی کے درس کو غور سے سنتیں اور بعد میں بہتری کے لیے مزید مشورے دیتیں۔ بیٹے نے بیٹی کے جمعیت کی سرگرمیوں میں باہر نکلنے پر سوال اٹھایا تو کہا ''ابھی میں زندہ ہوں۔ یہ جائے گی اور دین پھیلائے گی۔'' ہر طرح سے دونوں بیٹیوں کی اس کام میں مدد کی۔

آپ کی بیٹی وقار النساء بتاتی ہیں کہ امی ہمیشہ ہمیں وقت ضائع کرنے سے منع کرتی تھیں اور خود بھی اس پر عمل کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی خاتون امی کے ساتھ دیر تک بیٹھنے آجاتیں تو امی کہتیں کہ فارغ بیٹھنے سے بہتر ہے کہ ہم ساتھ ساتھ لہسن چھیل لیں۔ میں امی سے کہتی تھی کہ آپ تو بس قائداعظم کی طرح کام، کام اور صرف کام پر عمل کرتی ہیں۔ وہ ہم سے کہتی تھیں کہ میرے بھائی فضل معبود صاحب مجھے سمجھایا کرتے تھے کہ اگر ایک لڑکی دوپٹے پر پھول کاڑھ کر پہنے تو وہ اچھی لگے گی لیکن اگر یہی لڑکی اچھی کتاب پڑھ کر سوچ کو خوبصورت بنا لے تو اور اچھی لگے گی۔ وہ ہمیں بھی اسی بات کی تاکید کرتی تھیں کہ جس کام میں زیادہ اور ابدی فائدہ ہو اس میں دل لگایا کرو تاکہ اللہ بھی راضی ہو سکے۔ میرے جمعیت میں جانے پر بہت حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ میری جمعیت کی رکنیت، پشاور یونیورسٹی اور پھر مردان کی نظامت اور پھر صوبائی شوریٰ کی رکنیت تک ہر مقام پر مجھے ہر ممکن مدد فراہم کرتیں۔ جب مختلف کاموں کے دوران حالات کی سختی یا ماحول کے دباؤ کے سبب کچھ گھبراہٹ کا شکار ہوتی تو بہت حوصلہ دلاتیں۔ یہی کہتیں کہ اللہ پر عقیدہ مضبوط رکھو۔ وہی ہر کام کروائے گا۔ میں اللہ سے تمہارے لیے بہت دعائیں کرتی ہوں کہ اللہ تمھیں سکون عطا کرے اور دل کی تنگی سے بچائے۔ شادی کے بعد جب اپنے حالات کے باعث میں بہت زیادہ فعال نہ رہ سکی تب بھی اُنہوں نے مجھے یہی نصیحت کی کہ درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھنا۔ اسے کبھی نہ چھوڑنا۔

جمعیت کے دور میں جب منصورہ میں ہونے والی ایک تربیت گاہ میں میری ملاقات مولانا فتح محمد صاحب کی بیگم صاحبہ سے ہوئی تو وہ تعارف کے دوران میری امی کا حوالہ سن کر بہت خوش ہوئیں اور کہا کہ انھیں حالات نے پابند کر دیا تو انھوں نے تین کارکن جمعیت کو دیے۔

میں شادی کے بعد کالج میں لیکچرر شپ کر رہی تھی تو میرے گلے میں ایسی تکلیف ہوئی کہ آواز نکلنی بند ہوگئی۔ میں نے علاج کے لیے رخصت لی اور اس دوران ایم فل اکنامکس میں داخلہ لے لیا۔ اپنے گھر درس جاری رکھا لیکن درس کے لیے کسی اور کو بلا لیتی تھی۔ پڑھائی بہت سخت تھی اور مجھے اسے بہت وقت دینا پڑتا تھا۔ امی مصروفیت دیکھتیں تو کہتیں کہ تفسیر اور دینی کتب کے مطالعہ کے لیے بھی وقت نکالا کرو خواہ تھوڑا ہی تاکہ دین سے تعلق کمزور نہ ہونے پائے۔ ایک دفعہ اسلامی تعلیمات کے کسی موضوع پر امی سے گفتگو کرتے ہوئے میں بھول کا شکار ہوگئی تو امی اس پر بہت ناراض ہوئیں کہ تم نے دنیاوی تعلیم کو اتنا وقت دے دیا ہے کہ تم دینی تعلیم کو وقت دینا بھول گئیں اور اتنی بنیادی بات تمہارے ذہن سے نکل گئی۔ بار بار وہ اس پر تکلیف کا اظہار کرتیں جس سے دین کے علم سے ان کی رغبت اور اس کی اہمیت کا ان کے دل میں جو مقام تھا اس کو سمجھا جا سکتا تھا۔

بہترین ساس:

بیٹیوں کے ساتھ ساتھ بہو سے بھی بہت محبت کی۔ کبھی اس کے بارے میں کوئی ایک بھی ناگوار لفظ نہ کہا۔ کبھی کسی کام پر توجہ دلانی ہوتی تو اسے بڑے پیار سے کہتیں۔ ''یہ کام اس طرح کر لیا کرو تو شاید زیادہ اچھا ہو''۔ بیٹیوں کو سمجھاتیں ''یاد رکھو، بہو کو اس گھر کے مطابق ڈھلنے میں بہت وقت لگے گا۔ ہم دعائیں کریں گے کہ اس کا دل یہاں لگ جائے اور یہ خوش رہے۔ کوئی ان کی بہو کے بارے میں کچھ بھی کہتا اس کی باتوں کی حمایت نہ کرتیں۔ ان کی بہو بیان کرتی ہیں کہ ان کے جانے کے بعد مجھے پتا چلا ہے کہ بچے پالنا کتنا مشکل کام ہے۔ وہ ہمیشہ بچوں کو اپنے ساتھ کھیل میں اور کتابوں میں مشغول رکھتی تھیں۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں مجھ سے بہت سی غلطیاں ہو جاتیں لیکن امی نے کبھی مجھے کچھ نہیں کہا۔ بعد میں کسی موقع پر باتوں کے دوران وہ عمومی انداز میں صحیح طریقہ اس طرح بیان کرتیں کہ میں بھی سیکھ لیتی لیکن

ان کا انداز ایسا نہ ہوتا کہ مجھے برا لگے۔ اب میں اور خواتین کو بھی یہی بتاتی ہوں کہ گھر میں بہو لائیں تو شروع دنوں میں اسے بہت محبت دیں کہ ابتدائی دور میں گھر والوں کے رویے لڑکی کو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ اپنی کوتاہیاں اور امی کا شفیق برتاؤ یاد آتا ہے تو دل سے ان کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔

حُسن سلوک سے دعوت:

خاندان کے ہر فرد کو وہ دل سے چاہتی تھیں۔ وہ شہر میں مقیم تھیں اور خاندان کے بیشتر افراد دیہات میں تھے۔ جو بھی بیمار ہوتا یا کسی اور ضرورت کا سامنا کرنا پڑتا وہ مع خاندان کے گھر آ کر مقیم ہو جاتا۔ احمدیہ بیگم گھر کے تمام کاموں کے ساتھ ساتھ ان مریضوں کی خدمت اور ان کے تیمارداروں کی دلجوئی اپنا فرض اوّلین سمجھتی تھیں۔ کبھی اپنے اکیلے پن یا تھکاوٹ کا عذر آڑے نہیں آنے دیا۔ اگر کبھی بچّے کسی قسم کا اظہار کرتے تو کہتیں ''مجھے بتاؤ یہ آخر اور کہاں جائیں گے؟ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے لیے سبب بنایا ہے، دل تنگ مت کیا کرو۔''

ان کے شوہر محترم کے چچازاد بھائی (جو اُن کے ہم عمر ہی تھے) کے سات بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ وہ سب باری باری بسلسلہ تعلیم ان ہی کے گھر مقیم رہے۔ احمدیہ بیگم کا ان کے ساتھ خدمت، تعلیم اور تربیت کا ایسا تعلّق رہا کہ آج جبکہ وہ سب نانا نانی اور دادا دادی کی عمر کو پہنچ چکے ہیں ان کے بچّوں کو بتاتے ہیں کہ ''وہ ہماری ماں تھیں تم لوگوں نے تو بہت کم وقت ان کے ساتھ گزارا ہے، زیادہ وقت تو ہم نے ان کے ساتھ گزارا ہے''۔ ان ہی اولادوں میں سے ایک بیٹا بیمار تھا۔ اسپتال میں ڈرپ لگی تھی۔ چھٹی ہوئی تو ان کے گھر آ کر مقیم ہوا۔ گرمی کی لمبی دوپہروں میں احمدیہ بیگم اس کی نگہداشت کے لیے اس کے پاس بیٹھتیں اور پاس ہی ایک ڈنڈا رکھ دیتیں اور کہتیں کہ ''میری ایک بری عادت ہے کہ مجھے بیٹھے بیٹھے اونگھ آ جاتی ہے۔ اگر مجھے اونگھ آئے تو مجھے اس ڈنڈے سے ہلا کر جگا دینا''۔ دن رات کے کاموں کی تھکن کے باعث آنے والی اونگھ کو بھی وہ اپنی ہی غلطی شمار کرتی تھیں۔ پورا سسرالی خاندان اپنے مسائل کے حل کے لیے ان کے پاس آتا اور وہ آپس کے تنازعات کو خوش گمانی کی ترغیب دے کر حل کرواتیں اور کہتیں کہ ''اس کی کوئی مجبوری ہوگی، وہ ایسا قصداً نہیں کر رہا ہوگا تم معاف کر دو''۔ خود بھی

ہمیشہ دوسروں کے بارے میں اچھا گمان رکھتیں۔

ان کے حسن سلوک سے ان کے پڑوسی بھی فیض یاب ہوتے۔ کسی کے گھر میں شادی ہوتی تو آپ دلہن اور گھر میں آنے والے مہمانوں کے لیے روز ناشتہ بھجواتیں اور درمیانی اوقات میں چائے بھجوانے کا اہتمام کرتیں۔ پڑوسی خواتین سے نہ صرف ان کی بلکہ ان کے والدین اور میکے تک کی خیریت دریافت کرتیں اور پیش آنے والے مسائل کا سادہ حل قرآن وحدیث کی روشنی میں بتاتیں۔

سیاسی کردار کی اہمیت:

وقار النساء بتاتی ہیں کہ الیکشن کے دنوں میں والدہ میرے کاموں میں بہت زیادہ معاونت کرتیں۔ ووٹ ڈالنے ضرور جاتیں اور جس حد تک حالات اجازت دیتے لوگوں کو اس کی اہمیت بتا کر ووٹ ڈالنے کی ترغیب دیتیں۔ عمر کے آخری دور میں جب صحت کی خرابی کے باعث گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا تھا، تب بھی اصرار کے ساتھ ووٹ ڈالنے کے لیے گئیں۔ پولنگ بوتھ مکان کی اوپری منزل پہ تھا تو ان کے جذبہ کو دیکھتے ہوئے پریزائڈنگ آفیسر نے نیچے آ کر امی کے ووٹ ڈالنے کا انتظام کیا۔ میرے بھائی جو ڈاکٹر ہیں اور پشاور میں جاب کرتے ہیں انھیں بہ اصرار مردان آ کر ووٹ ڈالنے کا کہتیں۔

اختتام زندگی:

ساری زندگی خدمت میں گزار دی۔ آخر میں جب دل بہت کمزور ہو گیا اور ڈاکٹروں نے محنت کرنے سے روک دیا تب بھی یہی کہتی تھیں کہ ''تم لوگوں نے مجھے کام کرنے سے روک دیا ہے ورنہ میں اب بھی کر سکتی ہوں۔ اس حالت میں بھی قرآن وحدیث، اخبارات ورسائل باقاعدگی سے زیر مطالعہ رہتے اور ان کے خاص خاص مضامین نشان زد کر کے بچّوں کو پڑھنے کے لیے دیتیں کہ تم لوگ مصروفیت کی وجہ سے زیادہ وقت نہیں دے سکتے لیکن یہ حصہ اہم ہے اسے ضرور پڑھ لو۔'' گھر میں بیٹی نے قرآن پاک کے ترجمے کی کلاس جاری رکھی ہوئی تھی جس میں اگر کسی بھی وجہ سے وقفہ آ جاتا تو اسے بہت ناپسند کرتی تھیں۔ آخری سال جب وہ بہت بیمار رہیں تو بیٹی ان کی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے خواتین کو چھٹی دے دیتی تو ناراض ہوتیں، کہتیں تمہارا

''عقیدہ کمزور ہے۔ دل مضبوط رکھا کرو۔ چاہے کچھ ہو جائے دین کا کام جاری رہنا چاہیے۔ تم انہیں چھٹی مت دیا کرو''۔ شاید اسی لیے آخری دن درسِ قرآن کے وقت تک بالکل ٹھیک رہیں۔ اس کے بعد ان کی طبیعت بگڑ گئی اور ۲۳ جنوری ۲۰۱۲ء کو وہ اس دارِ فانی میں ۸۳ برس کی عمر گزار کر اپنے رب کے حضور رخصت ہو گئیں۔

زندگی میں تو محبت وشفقت اور خدمت ان کا مستقل اصول تھا ہی، ان کی وفات بھی پورے خاندان کی یکجائی کا باعث بن گئی۔ ہر ایک یہی کہہ رہا تھا کہ ''آج ہمارے خاندان کی روشنی رخصت ہو گئی''۔ ان کی وفات کے تیسرے دن عصر کے بعد شہد کی مکھیوں کا ایک غول آیا۔ آخری دعا کرنے والوں کے سروں پر سایہ کیا اور ایسے محسوس ہوا جیسے سب کے سروں پر شہد کا اسپرے ہو گیا ہو۔ پھر وہ غول ایک طرف اُڑ کر چلا گیا۔ ہر ایک نے اس موقع پر یہی محسوس کیا کہ گویا زندگی میں محبتوں کی مٹھاس تقسیم کرنے والی نے وفات کے بعد بھی شہد کی مٹھاس تقسیم کر دی۔ روشنی کی مانند زندگی بسر کرنے والی یہ شفیق ومہربان خاتون آج دنیا میں نہیں لیکن ان کی اولادیں اپنے اپنے مقام پر ان کے لیے صدقۂ جاریہ ہیں اور صوبے میں دعوتِ حق کے جو ابتدائی بیج آپ اپنی محنت سے بو گئیں، آج ان کی شاندار فصل لہرا رہی ہے۔

اللہ آپ کی مساعی کو قبول فرمائے۔ آمین!

ماخذات

۱۔ وقار النساء صاحبہ۔۔ بیٹی
۲۔ سید احمد صاحب۔۔ بھتیجے
۳۔ شاہدہ بیگم صاحبہ۔۔ بھتیجی

&

مسعودہ بیگم

۱۹۲۸ء تا ۲۰۱۲ء

)

4

''آپ کی بڑی خواہش تھی کہ ملتان میں لڑکیوں کا ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیے جس میں دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دی جائے، تاکہ انہیں باشعور شہری اور مسلمان بنایا جاسکے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے آپ نے اپنے والدین کی جانب سے جائیداد میں ملنے والے حصے کو وقف کر دیا۔ آپ نے اس مقصد کے لیے بیرونِ ملک مقیم اپنے عزیز و اقارب کو بھی شامل کیا اور ۱۹۹۱ء میں پندرہ لاکھ روپے سے عائشہ پبلک اسکول اور جامعۃ البنات عائشہ کی پُرشکوہ عمارت کی تعمیر و تشکیل عمل میں لائی گئی، بعد میں ضرورت پڑنے پر آپ نے اپنا زیور بھی اس مقصد پر خرچ کر دیا۔

اپنے داماد انجینئر شوکت محمود خان کو اس کے نقشہ اور تعمیر کی ذمہ داری اور اپنی بیٹی میمونہ کو اس ادارہ کے چلانے کا ذمہ دار بنایا۔ آپ کے خلوص کی برکت سے جلد ہی یہ ملتان کا ایک مثالی ادارہ بن گیا''۔

4

ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والی جواں سال خوبصورت خاتون گہری سوچ میں محو تھیں۔ان کی بڑی بہن ان کے لیے آنے والے رشتہ کی تفصیل بتا کر جا چکی تھیں اور اب فیصلہ انھیں کرنا تھا۔ وہ اپنے خاندان کی انتہائی قابل، نیک خصلت اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔خاندان کے چوٹی کے ایک کاروباری گھرانے میں ان کی بات چیت پکّی ہونے کے مراحل میں تھی کہ ان کے لیے ملتان سے تعلق رکھنے والے ایک تحریکی صاحب نے رشتہ کی درخواست بھیج دی تھی۔مقام حیرت یہ تھا کہ وہ نہ صرف شادی شدہ بلکہ تین بچّوں کے باپ بھی تھے۔تحریک ان کے دل میں گھر کر گئی تو انھوں نے اس تحریک کو اپنی اگلی نسلوں میں منتقل کرنے کے لیے ایک تحریکی گھرانے کی لڑکی کو عقدِ نکاح میں لانے کا خواب دیکھا اور ملتان میں انھیں عبدالقادر خان کے گھر سے بہتر کوئی گھرانہ نہ لگا۔پہلی بیوی ان کے خاندان سے تھیں جسے وہ اس رشتے پر راضی کر کے ساتھ لے کر آئے اور خود ان کی بیوی نے لڑکی کی والدہ کے قدموں پر اپنا دوپٹہ رکھ کر رشتے کی درخواست کی۔گھر والوں نے معاملہ بیٹی کی رضامندی پر چھوڑ دیا۔اس نیک خصلت اور سراپا تحریکی خاتون نے مستقبل کے خاکے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس رشتے کے لیے ہاں کر دی۔ایک جواں سال، تعلیم یافتہ، خوبصورت اور معزز گھرانے کی اس خاتون کے اس ایثار و قربانی کے پیچھے محض تحریک کی خیر خواہی اور دین کی سربلندی کا جذبہ پوشیدہ تھا۔تحریک کی خاطر ایک سوکن اور اس کے تین بچّوں کو کُھلے دل سے برداشت کر کے نئے گھر میں قدم رکھنے والی یہ خاتون ملتان کی مسعودہ بیگم تھیں جن کی شادی پر خاندان کی سب عورتیں افسردگی کے عالم میں کہہ رہی تھیں کہ ''آج ہمارے خاندان کا سب سے تابناک ہیرا غیروں میں چلا گیا''۔

ابتدائی تعارف:

ان کے والد کا نام عبدالقادر خان اور والدہ کا خورشید بیگم تھا جو آپس میں رشتہ دار تھے۔ آپ کا گھرانہ ایک متمول اور دینی و علمی ماحول رکھنے والا گھرانہ تھا۔والد صاحب مطالعے کے شوقین اور ایک وسیع لائبریری کے مالک تھے جس میں اس وقت کے ادبی، سیاسی اور اصلاحی رسائل بھی آیا کرتے تھے۔جیّد علما سے آپ کا رابطہ رہتا تھا، والدہ کو بھی تعلیم کا بہت شوق تھا۔ لیکن خاندان میں چونکہ لڑکیوں کے پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔اس لیے گھر ہی میں لکھنا پڑھنا

سیکھا تھا وہ اُردو و فارسی کتب کا مطالعہ کر لیتی تھیں۔

اس ماحول میں ۱۹۲۸ء میں مسعودہ بیگم نے آنکھ کھولی، ابتدائی تعلیم گھر کے قریب واقع پرائمری اسکول سے شروع ہوئی۔آپ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ابتدا ہی سے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔حرم گیٹ ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد ملتان ڈگری کالج میں داخلہ لیا اور ہر جگہ نمایاں پوزیشن حاصل کی۔۱۹۴۷ء میں ایف۔اے کیا جو اس وقت بہت کم لوگ کیا کرتے تھے۔ فارسی، عربی، انگلش اور ریاضی پسندیدہ مضامین تھے۔ ایف۔اے کرنے کے کچھ عرصہ بعد ملتان میں طالبات کے لیے گورنمنٹ کالج کا آغاز ہوا تو وہاں بطور لیکچرار تعینات ہوئیں۔ جہاں آپ انگلش، فارسی اور ریاضی کی تعلیم دیتی تھیں۔

جماعت اسلامی سے تعارف:

کالج کی تعلیم کے دوران رسالہ ترجمان القران دیکھا جس میں مئی ۱۹۴۷ء کو دارالسلام میں منعقد ہونے والے اجتماع عام کا اشتہار چھپا تھا۔انہوں نے اپنے والدین کو اس سے مطلع کیا۔والدین نے بھی اس میں دلچسپی لی۔ یہ وہ دور تھا جب تحریک پاکستان زور و شور سے جاری تھی۔خاندان کے بڑوں نے مخالفت کی کہ تین جوان بیٹیوں اور بیوی کو لے کر اس وقت نہ جاؤ لیکن تمام مخالفتوں کے باوجود یہ قافلہ دارالسلام پہنچ گیا۔وہاں ان کی ملاقات جماعت اسلامی کی سرکردہ خواتین سے ہوئی جن میں آپا حمیدہ بیگم بھی شامل تھیں۔ان کے پورے گھرانے نے دل و جان سے اس کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے کا عزم کیا۔وہاں سے واپسی پر والدین جماعت کے نظم سے جڑ گئے اور انہوں نے طالبات میں دین کی دعوت کا آغاز کیا۔آپ کے والدین نے تمام بیٹیوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جبکہ اس زمانے میں عورتوں کا باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔وہ کالج جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ طالبات کو لٹریچر پڑھنے کو دیتی تھیں۔

جماعت اسلامی کے تحت ہونے والے تمام اجتماعات عام میں شرکت کی اور تعلیم کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد باقاعدہ اس سے منسلک ہو کر نظم کی ہدایت کے تحت کام کرنے لگیں۔ابھی خواتین کا علیحدہ تنظیمی سیٹ اپ نہیں بنا تھا اور مردانہ نظم کے ساتھ مل کر ان کی ہدایت کے مطابق ہی کام ہوتا تھا۔دروس قرآن کا سلسلہ شروع کیا گیا۔کتابیں اور رسائل تقسیم کیے گئے۔۱۹۵۰ء میں رکنیت منظور ہو گئی۔۱۹۵۱ء میں شادی انجام پائی اور زندگی کے نئے مرحلے میں داخل ہو گئیں۔

از دواجی زندگی:

توکل الی اللہ کرتے ہوئے نئی زندگی میں قدم رکھا تو سوتیلے رشتوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا۔ بڑی بیگم کو عزت واحترام دیا۔ بچوں کے ساتھ اخلاق ومعاملات بہترین رکھے۔ انہیں دین سے جوڑا۔ اور تعلیم وتربیت کا خیال رکھتے ہوئے خوب محبت دی۔ جماعت کی دعوت سے آشنا کرایا۔ اجتماعات میں شرکت کروائی۔ بڑی بیگم خود کہتی تھیں کہ مجھے مسعودہ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اپنے بچوں کی آمد کے بعد بھی ان بچوں کا اسی طرح خیال رکھا۔ ان کی خوشی غمی میں شریک رہیں، اپنے بیٹوں کے کاروبار میں بڑے بیٹوں کو بھی شامل کیا اور بڑی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔ عام عورتوں کی طرح کبھی گلے شکوے نہ کیے۔ دوسروں کو انہیں قبول کرنے میں بہت وقت لگا لیکن انہوں نے بہت صبر وتحمل کے ساتھ سب کے حقوق ادا کیے۔

اپنے شوہر خواجہ عبدالاحد سے محبت مثالی تھی۔ اطاعت وفرمانبرداری کے ساتھ ان کی پسند و ناپسند کا خیال اور ان کے آرام میں کبھی اپنے طور پر کمی نہ چھوڑی۔ دونوں ایک دوسرے کے دمساز تھے۔ بہت ادب واحترام اور محبت سے ان کا تذکرہ کرتیں۔ شوہر بھی تہجد گزار اور بااصول آدمی تھے۔ فجر کی اذان کے وقت تمام بچوں کو اٹھا کر مسجد چلے جاتے، واپس آ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے پھر جماعت کے پمفلٹ اور رسائل اٹھا کر ملاقاتوں کے لیے نکل جاتے۔ واپس نو بجے تک آ کر ناشتہ کرتے اور دکان چلے جاتے۔ ملتان کے صاحبِ حیثیت لوگوں میں سے ایک تھے لیکن درویش منش آدمی تھے۔ کبھی غرور پیدا نہیں ہوا۔ آخر عمر تک خود سائیکل چلا کر دکان پر جاتے تھے۔ انتقال سے ایک برس قبل کولہے کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا تو مثالی بیوی نے مثالی خدمت کی۔

بچوں کی تربیت:

اللہ نے پانچ بیٹوں اور تین بیٹیوں سے نوازا۔ تینوں بیٹیاں اور دو بیٹے رکن جماعت ہیں۔ چار بہوئیں رکن جماعت ہیں۔ نواسے، نواسیاں، پوتے، پوتیاں جمعیت طلبہ و طالبات سے وابستہ ہیں۔ بچوں کی تعلیم وتربیت پر بھرپور توجہ دی۔ بچوں کو ساتھ لے کر ہر اجتماع میں گئیں۔ تحریک کا سارا کام بچوں کے ساتھ کیا۔ تمام اسلامی آداب سکھائے اور خود اس کا عملی نمونہ فراہم کیا۔ ان کے اندر علم کا شوق ابھارا۔ کھیل ہی کھیل میں انہیں کلمے، سورتیں اور نظمیں یاد کرواتیں۔ ہر موقع پر بچوں کو انہیں سنانے کے لیے کھڑا کر دیتیں جس سے بچوں میں خود

اعتمادی پیدا ہوتی۔ خود بھی بچوں کو اسلامی فکر کی حامل لوریاں سناتیں اور دیگر ماؤں کو بھی ایسی لوریاں لکھ کر دیتیں جن میں مجاہدانہ رنگ ہوتا۔

بچوں میں جنت کے شوق کو ابھارتیں۔ بیٹی بشریٰ بتاتی ہیں کہ کبھی بچپن میں بخار ہو جاتا تھا تو میں امی کی خصوصی توجہ حاصل کرنے کے لیے کہتی کہ ''میری طبیعت خراب ہے لگتا ہے مر جاؤں گی'' تو وہ بجائے میرے منہ پر ہاتھ رکھنے کے مجھ سے کہتی تھیں۔ ''کلمہ اور دعائیں پڑھ لو۔ چھوٹے بچے تو جنت کے پھول ہوتے ہیں۔ امی ابو کے لیے جنت کا ٹکٹ ہوتے ہیں۔ بڑے ہو کر تو پتا نہیں کتنے گناہ ہوں گے، کتنی غلطیاں ہوں گی۔ پھر وہاں تو نبی کریم ﷺ ہوں گے، حضرت عائشہؓ ہوں گی، انبیاء کرام ہوں گے''۔ اس طرح بچوں سے موت کا خوف دور اور جنت کا شوق ابھارنے کی کوشش کرتیں۔ بچپن میں جو بھی بات پوچھتے، اس کا جواب شعر کی صورت میں دیتیں۔ کم فہمی کی وجہ سے ہم چڑ بھی جاتے لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے تمام بچوں میں ادبی ذوق کُوٹ کُوٹ کر بھر گیا۔ بچہ جیسے ہی بولنا شروع کرتا کلمے اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ تحریکی نظمیں بھی یاد کراتیں اور تربیت گاہوں میں یہ کہہ کر لے جاتیں کہ وہاں جا کر انہیں سنانا ہے۔ اس طرح بڑے بڑے مجمع کے سامنے بچوں کو مائیک پر کھڑا کر کے ان میں خود اعتمادی پیدا کی۔ نظموں کی کتابیں بیگ میں ہمیشہ رکھتیں پھر یہ نظمیں اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو بھی یاد کروائیں۔

اپنے بچوں کے ساتھ ان کی اولادوں کی بھی بہترین تربیت کی کوششیں کیں۔ جس ماں کو اپنے کسی بچے پر قابو پانا مشکل لگتا، اسے ان کے پاس بھیج دیتیں۔ آپ کے نواسے اسامہ خاکوانی بتاتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا تو ذرا تتلا کر بولتا تھا۔ اکثر مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتیں اور زبان پر انگلی رکھ کر الفاظ کہلواتیں اس طرح میری تتلاہٹ دور کی۔ اپنی اولادوں کی تمام بچوں سمیت دعوت کرتیں تو ہمارے شور مچانے اور شرارتیں کرنے پر غصہ نہ کرتیں بلکہ اپنے ہاتھوں سے ہمارے لیے کھانے تیار کرتیں اور ہمیں کچھ نہ کچھ سکھانے کی فکر میں رہتیں۔

خاندان میں کردار:

بچے بڑے ہوئے تو ان کے رشتے طے کرتے ہوئے دینی تعلیمات کی روشنی میں تمام امور سرانجام دیے۔ تمام بہوؤں کو خود بغیر جہیز کے لائیں۔ خود ہی ان کا فرنیچر، بستر، کپڑے اور

دیگر چیزوں کی تیاری کی۔ ماؤں سے بڑھ کر ان کی پذیرائی کی۔ بہوؤں کے کسی کام میں مداخلت نہیں کی بلکہ گھر اور بیٹوں کو ان کے حوالے کر دیا۔ اور کسی بھی فضول رسم سے اجتناب کرتے ہوئے پردہ کے مکمل اہتمام کے ساتھ شادیاں سرانجام پائیں۔

آپ کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ ملتان کے رکن جماعت خان ربانی صاحب جن کی زوجہ کے انتقال کے باعث ان کی بیٹی ذہنی طور پر بہت افسردہ ہوگئی تھی انہوں نے مسعودہ بیگم سے درخواست کی کہ اگر آپ اسے اپنی بہو بنالیں تو مجھے امید ہے کہ وہ اس محبت بھرے ماحول میں آ کر اس صدمے سے باہر نکل آئے گی۔ انہوں نے بہت خوشی کے ساتھ اس درخواست کو قبول کیا اور جب بہو کو گھر لے کر آئیں، تو پہلے دن ہی اسے کہہ دیا کہ تم میری بہو نہیں بیٹی ہو اور میں تمہاری ماں ہوں اور ہمیشہ ماؤں والی شفقت ہی برقرار رکھی۔

بڑی بہو بشریٰ تسنیم گواہی دیتی ہیں کہ ''وہ دنیا کی بہترین ساس تھیں۔ ساس بہو سے بڑھ کر ہمارے درمیان اللہ کے لیے محبت کا رشتہ تھا اسی کی بدولت ہمارے مابین بہت زیادہ دوستی تھی۔ ان کا ہر اس فرد سے قدردانی کا رشتہ تھا جو قرآن اور تحریک سے والہانہ وابستگی رکھتا ہو۔ بیٹیوں کے مقابلے میں بہوؤں کا ساتھ دیتیں اور ان سے زیادہ تعلق کا اظہار کرتیں۔ مجھے نصیحت کرتیں کہ شوہر کے ساتھ زیادہ نرمی کریں تو وہ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میرے سامنے اپنے بیٹے کو ایسے اشعار سناتیں جن میں بیوی کی خوبیوں اور قدردانی کرنے کا اظہار ہوتا۔ میرے شوہر کہتے کہ یہ دنیا کی عجیب ترین ساس بہو ہیں جو دونوں مل کر میرے خلاف ہو جاتی ہیں۔ بیٹے سے کہتیں کہ اگر تم نے اسے تکلیف دی تو میں تم سے سخت ناراض ہو جاؤں گی۔ ہم نے بے شمار سفر ساتھ کیے۔ حج وعمرے بھی کیے لیکن کبھی معمولی سی بھی رنجش نہ ہوئی۔ سارا کمال ان کی حمایت، خلوص اور قدردانی کا تھا۔ میری خدمت کو بہت سراہتیں اور سب سے کہتیں کہ اس نے میرا ایسے خیال رکھا جیسے مائیں بچوں کا رکھتی ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بے حد محبت تھی۔ آپ ﷺ کا نام لیتے ہی آواز بھرّا جاتی۔ ان کا توکّل علی اللہ، سادگی اور دنیا سے بے نیازی ایسی تھی کہ حیرت ہوتی تھی۔ ہر وقت ایک بیگ میں دو جوڑے کپڑے، چند کتابیں اور چند اور ضروری چیزیں ڈالے تحریکی سفر کے لیے تیار رہتیں۔ ملتان اور نواحی شہروں اور قصبات میں انہوں نے انتہائی جانفشانی سے دین کے کام کو پھیلایا۔ یہ ان کے لگائے ہوئے

تحریکی بیج ہیں جو اب پھل پھول بن کر ان کے لیے صدقہ جاریہ بنے ہوئے ہیں۔ دوسروں کے خطوط محفوظ رکھتیں۔ میرے خطوط بھی پلاسٹک کور کروا رکھے تھے۔ سفر و حضر میں پمفلٹس ساتھ رکھتیں اور حکمت کے ساتھ مواقع نکال کر انہیں ہمراہیوں کو سناتی تھیں''۔

بہو مجیدہ زبیر کہتی ہیں کہ'' آپ بہت حلیم الطبع، ملنسار، محبت اور قدر کرنے والی تھیں۔ کوئی بھی ان کے پاس بیٹھتا تو خوش ہی رہتا تھا۔ ہنس مکھ تھیں اور ہر ایک سے حسن سلوک کی کوشش کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے بھی جماعت اسلامی سے جوڑنے کی کامیاب کوشش کی اس کے لیے میری ذمّہ داریوں کو بھی اپنے ذمہ لے لیا کرتیں۔ جب مجھے کسی پروگرام میں جانا ہوتا تو کہتیں کہ آج کھانا میں بنالوں گی۔ تم اجتماع میں چلی جاؤ۔ یہ رویہ بہت تقویت دیتا تھا اور اس سے میری جماعت میں دلچسپی اور لگاؤ میں اضافہ ہوا''۔

تحریکی سرگرمیاں:

شادی کے بعد تحریکی عزائم کو مہمیز ملی۔ دعوتی کام میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ دن کا زیادہ حصہ دعوتی ملاقاتوں، رسائل کی تقسیم اور کتب پڑھ کر سنانے میں صرف کرتیں۔ منصوبہ بندی کے ساتھ ملاقاتیں کرتیں۔ تعلیم سے خصوصی شغف کے باعث ملتان شہر کے تعلیمی اداروں میں کام کو خصوصی ترجیح میں رکھا۔ جس کے لیے محکمہ تعلیم کی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر سے باقاعدہ تحریری اجازت نامہ حاصل کیا اور بڑے وقار سے تمام اسکولوں میں آہستہ آہستہ کام شروع کر دیا۔ اعلیٰ تعلیمی معیار کی وجہ سے ملاقات اور بات چیت کرنی آپ کے لیے مشکل نہ تھی، اس لیے کام کا آغاز ہی موثر طبقے اور تعلیمی اداروں سے ہوا۔ سربراہان ادارہ سے ذاتی روابط نے دینی وتحریکی رنگ اختیا کر لیا۔ شہر کے تمام ہائی اسکولز میں آپ کی آمد ورفت تھی۔ کہیں اسمبلی میں اخلاقیات پر درس دیتیں، کہیں اسٹاف ممبرز کی کلاس لے رہی ہوتیں، کہیں پرنسپل کے ساتھ بیٹھ کر مطالعہ کرتیں، بچوں کے لیے اسکولز میں بک اسٹالز لگواتیں۔

گورنمنٹ گرلز اسکولز اور محکمہ تعلیم کے دفاتر میں کام کے ساتھ ساتھ مدارس میں کام کا بھی آغاز کیا۔ مدارس کی نگران خواتین سے دوستیاں کیں۔ انہیں اپنے دروس میں شرکت کی دعوت دی اور خود وہاں جا کر درس دیے۔ یہ سلسلہ تاحیات جاری رکھا۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے تک دعوتی کام پورے ملتان شہر میں پھیل چکا تھا۔ اپنے ساتھ کام کرنے والی بہنوں کو تربیت دے کر رکنیت کے معیار تک پہنچایا۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں کام کو منظّم کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ حمیدہ بیگم صاحبہ نے جو اس وقت حلقہ خواتین کی قیمّہ تھیں ان کو ملتان شہر کی ناظمہ مقرر کیا۔ وہ خطوط کے ذریعہ آپ سے رابطہ رکھ کر کاموں سے آگہی لیتیں اور آگے کی رہنمائی دیتیں۔ صوبہ کے بڑے اجتماعات میں مرد و خواتین دونوں شریک ہوتے ایسے میں مسعودہ بیگم جنوبی پنجاب کے مختلف شہروں سے آنے والی خواتین سے رابطہ کرتیں اور بعد میں خطوط اور لٹریچر کی ترسیل کے ذریعے وہاں بھی دعوت پہنچانے کی کوششیں جاری رکھتیں۔

۱۹۷۴ء میں ام زبیر صاحبہ قیمہ بننے کے بعد ملتان کے دورے پر آئیں۔ ہر سطح کے اجتماعات میں شرکت کی۔ موثر خواتین کے ساتھ ان کی نشست رکھی گئی اور کام کے دائرے کو آگے بڑھانے کی تدابیر سوچی گئیں۔ اس دورے کے کچھ عرصے بعد کام میں توسیع کے لیے خواتین نظم کو گاڑی خریدنے کی ہدایت دی گئی جس کے بعد مختلف علاقوں میں دورے کے ذریعہ کام کو آگے بڑھایا گیا۔ اسی عرصے میں ملتان کے ریڈیو اسٹیشن سے بھی روابط ہوئے اور مسعودہ بیگم نے وہاں جا کر تقاریر ریکارڈ کروائیں جنہیں ریڈیو ملتان سے خواتین کے پروگرامز میں نشر کیا گیا۔

تنظیمی استحکام:

جنوبی پنجاب اس وقت تین ڈویژن ملتان، بہاولپور اور ڈیرہ غازی خان پر مشتمل تھا۔ تینوں ڈویژن کی ذمہ داری سپرد کی گئی تو انہوں نے تینوں ڈویژن کے بڑے بڑے شہروں کو ہدف بنایا۔ ان شہروں کے مرد کارکنان کے باعث خواتین جماعت کی دعوت سے آشنا تھیں۔ انہیں خود کام سکھانے اور منظّم کرنے کی ضرورت تھی۔ بہاولپور ڈویژن میں رحیم یار خان، صادق آباد اور بہاولپور شہر کو، ڈیرہ غازی خان میں ڈی جی خان اور مظفر گڑھ کو اور ملتان ڈویژن میں ملتان شہر، خانیوال اور جہانیاں کو ہدف بنایا۔ پلاننگ کے ساتھ یہاں کے ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہانہ دورے کیا کرتیں۔ کارکنان کی تربیتی نشستیں منعقد کرتیں۔ نصاب کا مطالعہ کروایا جاتا۔ ڈویژن کے بڑے بڑے شہروں میں تربیت گاہیں رکھ کر دیگر چھوٹے شہروں کی کارکنان کو وہاں بلایا جاتا۔ بالائی نظم سے مرّبی خواتین کو بلا کر پروگرامز کروائے جاتے، خواتین سے متعارف کروایا جاتا۔ بالائی نظم سے آنے والی خواتین کے قیام و طعام کا انتظام خود اپنے گھر میں کرتیں اور اپنی مصروفیات کے باوجود مہمان

نوازی میں کسر نہ اٹھا رکھتیں۔ بہت عرصے تک تمام تربیت گاہیں بھی آپ کے گھر پر ہوتی رہیں۔

۱۹۵۱ء میں رکنیت کی منظوری کے بعد سے ۱۹۸۸ء تک ملتان و جنوبی پنجاب کی نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔ مرکزی، صوبائی و ضلعی شوریٰ کی رکن رہیں۔ ہر جگہ قائدانہ اوصاف سامنے آئے۔

اسلامی جمعیت طالبات سے شغف:

طالبات کے ساتھ محبت و شفقت کا خصوصی معاملہ تھا۔ اسلامی جمعیت طالبات کا قیام ملتان ہی میں عمل میں آیا۔ طالبات کے اس اجتماع کا انتظام بخوبی سنبھالا۔ اس کے بعد ہونے والے اجتماعات میں بھی بخوشی انتظامی ذمہ داریاں سنبھالتی تھیں اور پروگرامز بھی کراتی تھیں۔ جب بھی طالبات کو سفر میں کسی خاتون کو ساتھ لے جانے کی ضرورت ہوتی تو بخوشی اس کے لیے تیار رہتیں۔ بچیوں کے پروگرام میں بھی کاپی پین لے کر بیٹھتیں اور پروگرام کے نکات نوٹ کرتیں۔

تعلیم کی لگن:

زندگی میں کپڑے، زیور اور دیگر لوازمات سے لگاؤ نہ تھا۔ ان کی زندگی میں کتابوں اور رسائل و جرائد کی اہمیت ان سب سے بڑھ کر تھی۔ مطالعہ کتب ان کی روح کے لیے غذا کا کام دیتا تھا۔ ادب سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ نثر و نظم دونوں سے یکساں دلچسپی تھی۔ بے شمار اردو فارسی اشعار ازبر تھے۔ جب بھی فارغ وقت ہوتا تو آپ کے ہاتھ میں ضرور کوئی کتاب یا رسالہ ہوتا۔ موثر چیزیں ڈائری میں نوٹ کر لیتیں اور موقع محل کے مطابق اسے دوسروں کو سناتیں۔

خود حصول علم کے ساتھ دوسروں تک اس کی منتقلی کے لیے بھی کوشاں رہتیں۔ اپنے گھر میں کام کرنے والی ماسیوں اور ان کے بچوں تک کو سپارہ اور اسکول کی تعلیم دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ شاہدہ اکرام صاحبہ بتاتی ہیں کہ ''میں ان کے گھر جاتی تو دیکھتی وہ بچوں کا اسکول لگائے بیٹھی ہیں اور بہت محنت سے ان کو کتابیں پڑھا رہی ہیں۔ دعوتی کاموں کے لیے نکلتیں تو ایک دو بچے ان کے ساتھ ہوتے، راستے میں بھی انہیں سبق یاد کرواتیں اور دوران ملاقات اُن کو الگ بیٹھ کر پڑھنے کی تاکید کرتیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کے لیے اہل خانہ خاتون کو سبق سنواتیں۔ نہ جانے کتنے بچوں کو انہوں نے پڑھا کر مختلف جماعتوں کا امتحان دلوا کر گورنمنٹ اسکولوں میں داخل کروایا اور اپنے لیے صدقہ جاریہ کا انتظام کیا''۔

عائشہ پبلک اسکول کا قیام:

ان کی بڑی خواہش تھی کہ ملتان میں لڑکیوں کا ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیے جس میں دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دی جائے تا کہ انہیں با شعور شہری اور مسلمان بنایا جا سکے۔اس خواہش کی تکمیل کے لیے اپنے والدین کی جانب سے جائیداد میں ملنے والے حصے کو وقف کر دیا۔اس مقصد کے لیے بیرون ملک مقیم اپنے عزیز و اقارب کو بھی شامل کیا اور ۱۹۹۱ء میں پندرہ لاکھ روپے سے عائشہ پبلک اسکول اور جامعۃ البنات عائشہ کی پرشکوہ عمارت کی تعمیر و تشکیل عمل میں لائی گئی۔ بعد میں ضرورت پڑنے پر اپنا زیور بھی اس مقصد پر خرچ کر دیا۔اپنے داماد انجینئر شوکت محمود خان کو اس کے نقشہ اور تعمیر کی ذمّہ داری سونپی اور اپنی بیٹی میمونہ کو اس ادارہ کے چلانے کا ذمہ دار بنایا۔ان کے خلوص کی برکت سے جلد ہی یہ ملتان کا ایک مثالی ادارہ بن گیا۔

تقسیم لٹریچر:

ان کی تحریکی سرگرمیوں میں لٹریچر کی تقسیم کو ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔اپنی ذمّہ داری کی ادائیگی کے لیے بے شمار دورے کرتی تھیں اور ہر وقت لٹریچر اپنے پاس رکھتی تھیں۔دوسرے شہروں میں جاتے وقت اپنے مخصوص بیگ سے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ یا اخباری تراشوں کی فوٹو اسٹیٹ نکالتیں اور ٹرین یا بس میں موجود آس پاس بیٹھے مرد و خواتین کے ہاتھوں میں پکڑا دیتیں۔اکثر سیرت کی کوئی نہ کوئی کتاب بھی دیتیں۔ بوریوں میں بھر کر کتابیں ساتھ لے جاتیں اور دیگر شہروں میں جا کر بک اسٹالز لگاتیں۔ملاقات کرتے ہوئے سامنے والی خاتون کی نفسیات کے مطابق اسے کتاب دیتیں اور بعد میں اس پر ڈسکشن بھی کرتیں۔ بھانجی ذکیہ فاطمہ بتاتی ہیں کہ آخر وقت تک انہوں نے کتب کی فہرست مجھے بھجوائی ہے کہ یہ کتب مجھے منگوا دو، مجھے تحفے میں دینی ہیں۔

تحریکی ساتھیوں سے تعلقات:

رحماء بینھم کی جیتی جاگتی تصویر تھیں۔تحریکی بہنوں سے ملنا گویا ان کی عید ہوتی تھی۔ تحریکی بہنوں کے ساتھ ان کی دلچسپی کے امور پر گفتگو کرتیں۔گھریلو صورتحال سے واقفیت رکھتیں۔ کسی کا کوئی مسئلہ ہوتا تو اس کے گھر جا کر بھی سلجھانے کی کوشش کرتیں۔ان کے لیے خلوص دل سے

دعائیں کرتیں۔اگر تحریک کے اکابرین گرفتار ہوتے یا جماعت پر کوئی مشکل وقت آتا تو بہت بے قرار ہو جاتیں۔ مسلسل آیت الکرسی کا ورد اور نفل پڑھ کر دعائیں مانگتیں اور جب تک مسئلہ حل نہ ہو جاتا یہی کیفیت رہتی۔ ہر کسی کو یہی محسوس ہوتا کہ خالہ جان سب سے زیادہ مجھ ہی سے محبت کرتی ہیں۔کوئی اپنا مسئلہ بتاتا تو اسے ہمیشہ راز میں رکھتیں، کسی دوسرے سے کبھی اس کا ذکر نہ کرتیں۔

عبادت میں ریاضت:

تعلق باللہ کی مضبوطی کے لیے عبادت میں ریاضت کو شعار بنائے رکھتی تھیں۔انتہائی کمزوری، بیماری اور بڑھاپے میں بھی نہ صرف رمضان المبارک کے تمام روزے رکھتیں بلکہ نفلی روزے بھی کثرت سے رکھتیں۔ ہر رمضان میں لازماً اعتکاف میں بیٹھتیں۔

محترمہ شاہدہ اکرام صاحبہ ان کے بارے میں بتاتی ہیں کہ ”اعتکاف کے دوران ان سے ملاقات کرنا میرا معمول تھا۔ میں ان سے دعاؤں کی حریص رہتی۔اپنا ہر مسئلہ ان کے گوش گزار کر دیتی۔وہ مجھے دعائیں پڑھ کر سناتیں۔ایسے لمحات میں ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہوتے، خشیت ان کے چہرے سے ٹپکی پڑتی، میں ان کی زبان سے جھڑتے ہوئے حکمت کے موتی چنتی رہتی۔ان کی پڑھی ہوئی دعاؤں کو میں نے ان کی خلوتوں میں ان کے عمل سے سمجھا اور لاشعوری طور پر میری زبان سے بھی جاری ہو گئیں۔قرآن کریم سے ان کو عشق کی حد تک محبت تھی۔دوران سفر میں نے ہمیشہ انہیں تلاوت وحفظ قرآن میں مشغول پایا۔کہا کرتی تھیں کہ میں نے قرآن کے مخصوص حصے سفر ہی میں حفظ کیے ہیں۔ رمضان کی شب بیداریوں میں قرآن پاک کی آیتیں اس جذبے سے پڑھتیں کہ سننے والیوں کو بھی رونا آ جاتا تھا اور ایمانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔کسی سے ملاقات کے لیے جاتیں تب بھی قرآن پاک کھول کر مخصوص رکوع کی تلاوت، ترجمہ سناتیں، سننے والی پر بہت اثر ہوتا“۔

آپ کی بڑی بہن صغریٰ فاطمہ آپ کے بارے میں کہا کرتی تھیں کہ ”میری یہ بہن جنت کی حور ہے“۔کم کھانا، کم سونا اور کم بولنا اِن کا معمول تھا جس پر استقامت سے کاربند رہتیں۔ ان کے دن مخلوق کے لیے اور راتیں خالق کے لیے مختص تھیں۔

توکل علی اللہ:

مشکل سے مشکل وقت میں بھی صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتیں اور ہر معاملے میں اللہ پر ہی توکل کرتیں۔ایک مرتبہ ان کا چھوٹا بیٹا محمد جنید سیڑھی سے نیچے گرا تو عینک کے شیشے سے اس کی آنکھ کا پپوٹا کٹ گیا اور آنکھ کا ڈیلا نظر آنے لگا لیکن وہ نہ گھبرائیں۔ بڑے بیٹے فوراً اسے اسپتال لے گئے اور وہ نوافل اور اذکار کے ذریعہ رب کے حضور عاجزی سے دعا میں مصروف ہوگئیں۔ڈاکٹروں نے پپوٹا سی دیا اور معجزانہ طور پر بینائی محفوظ رہی۔

ایک دفعہ آپ کے کچن سے تانبے کی دیگچیوں کا سیٹ چوری ہوگیا تو مکمل یقین کے ساتھ اسی وقت دو نفل صلوۃ الحاجت اور سورۂ لقمان کی سولہویں آیت کی تسبیح پڑھی، تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھنے لگا کہ آپ کی دیگچیاں گم ہوئی ہیں؟ اور بتانے پر دے گیا۔اس نے بتایا کہ ایک لڑکا میری دکان پر انہیں بیچنے آیا تھا۔ مجھے شک گزرا کہ یہ چوری کی ہیں، جب سختی سے اس سے پوچھا تو اس نے آپ کے گھر کا پتا بتادیا۔

امانت، دیانت:

ہر چیز کے بارے میں احساس امانت بہت زیادہ تھا۔تحریک کی امانتوں کی حفاظت کا بہت اہتمام فرماتیں۔چھوٹے سے چھوٹے کاغذ کے پُرزے کو بھی سنبھال کر رکھتیں خصوصاً سرکلرز کی بہت زیادہ حفاظت کرتیں انھیں فوٹو اسٹیٹ کرا کے آگے تقسیم کرتیں۔بیلٹ وقت پر پُر کر کے دینے میں بھی بہت حسّاسیت کا مظاہرہ کرتیں اور ملتے ہی اسے پُر کرنے اور آگے پہنچانے کی فکر کرتیں۔وقت کو بھی قیمتی امانت سمجھتیں اور ہر کام منضبط طریقے سے کرتیں۔

عجز وانکسار:

ناظمہ رہ کر بھی ایک کارکن کی طرح کام کرتیں۔اپنے لیے کسی امتیاز کو پسند نہ کرتیں بلکہ ان کی کوشش ہوتی کہ پیچھے رہ کر ہی کام کرتی رہیں اور اکثر فارسی کا یہ مصرعہ کہتیں کہ ''من دانم کہ من آنم'' (میں جانتی ہوں کہ میں کیسی ہوں)

افراد کو آگے بڑھانا:

اپنے لیے انتہائی کسرنفسی سے کام لینے والی مسعودہ بیگم دوسروں کی تعریفیں اور حوصلہ افزائی کرنے میں بہت آگے رہتیں۔کسی کے اندر کوئی چھوٹی سی بھی خوبی دیکھتیں تو اسے بہت

سراہتیں۔اپنے ہاتھوں کام دوسروں کے سپرد کر کے خوش ہوتیں۔شاہدہ اکرام صاحبہ بیان کرتی ہیں کہ میں ان کے ساتھ ہائی اسکولز کے پروگرام میں جایا کرتی تھی۔کچھ عرصے تک وہ پروگرام کرتیں اور میں سنتی رہتی پھر ایک دن انھوں نے اجازت نامہ مجھے پکڑا دیا اور کہا کہ ''یہ کام آج سے آپ کی ذمہ داری ہے''۔انھوں نے اپنی زندگی میں تینوں ڈویژن میں کام کے بیج ڈالے۔ پھونٹنے والی کونپلوں کو مستقل محنت سے تناور درختوں میں تبدیل کیا اور پھر مزید آبیاری کے لیے متبادل ہاتھوں میں کام منتقل کر کے روحانی طور پر مطمئن ہوگئیں۔

باہمت مجاہدہ:

عمر کے آخری حصّے تک اجتماعات میں شرکت کی کوشش رہتی۔ یہاں تک کہ جب چلنا اور کھڑا ہونا مشکل ہونے لگا تو گھر والے گھر پر آرام کی ہدایت کرتے لیکن اس وقت بھی اجتماع میں شرکت ان کی پہلی ترجیح ہوتی۔

شامِ زندگی:

شوہر محترم کے انتقال کے بعد صحت خراب رہنے لگی ایک دن اچانک آپ کی یادداشت ختم ہوگئی اور آپ فارسی میں باتیں کرنے لگیں۔علاج ہوتا رہا اور آہستہ آہستہ یادداشت واپس آ گئی، لیکن مختلف بیماریوں نے انہیں بہت کمزور کر دیا تھا۔ان کی خواہش تھی کہ وہ مدینہ چلی جائیں جس کے لیے ان کے وہاں مقیم بیٹے کوشش بھی کر رہے تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی الحمدللہ زبان پر ہوتا۔انہوں نے بیٹوں کے گھروں میں رہنے کے دن طے کر لیے تھے۔اپنی بیٹی بُشریٰ کے گھر مقیم تھیں اور گھر میں ماسی کے بچّوں کو پڑھانے میں مصروف تھیں اسی دوران کھانسی کا دورہ پڑا، اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں تین بار درود شریف پڑھا اور پھر روح پرواز کر گئی۔

خُدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ماخذات

۱۔ محترمہ شاہدہ اکرام صاحبہ۔سابقہ ناظمہ صوبہ پنجاب حلقہ خواتین
۲۔ بُشریٰ تسنیم صاحبہ۔بہو ۳۔ مجیدہ زبیر صاحبہ۔بہو ۴۔ ذکیہ فاطمہ صاحبہ۔بھانجی
۵۔ محترم اسامہ خاکوانی صاحب۔نواسے ۶۔ رفیعہ فاطمہ صاحبہ۔بہو

&

بنت مجتبیٰ مینا

۱۹۲۸ء تا ۲۰۱۱ء

)

میں عورت ہوں!

یہ کانٹوں پھولوں کا گلبن
یہ دنیا جو ہے اک گلشن
اس گلشن کی میں نکہت ہوں
میں عورت ہوں، میں عورت ہوں

فطرت کی آنکھ کا تارا، میں
تاریکی میں اجیارا، میں
میں جانِ وفا و الفت ہوں
میں عورت ہوں، میں عورت ہوں

میں نگراں نوعِ بشر کی ہوں
تصویر میں رنگت بھرتی ہوں
میں مادرِ قوم و ملّت ہوں
میں عورت ہوں، میں عورت ہوں

(از: ''کلام بنت مجتبیٰ مینا'')

۱۹۸۳ء کا دور تھا ملک میں بلدیاتی انتخابات منعقد کیے جا رہے تھے۔ لاہور میں جماعت اسلامی کی خواتین نمائندگان انتخاب جیت کر پولنگ اسٹیشن سے باہر نکلیں تو چند مرد کارکن استقبال کے لیے ہار لیے کھڑے تھے۔ تینوں خواتین کارکنان کے لیے یہ صورتحال خلاف توقع تھی ان میں سے ایک کارکن تو پریشان ہو کر یہ کہنے لگیں یا اللہ خیر یہ کس آزمائش میں پڑ گئے ان کے کہنے پر دوسری کارکن بہن نے ہاتھ بڑھا کر یہ ہار لیے اور انہیں تھما دیے جو انہوں نے فوراً بیگ میں ڈال دیے اور کہا کہ، ''یہ سب تو ہم نے اللہ کے لیے کیا ہے، اللہ سے ڈر لگ رہا ہے''۔ ذمہ داری کا ملنا ایسی خوش کن شے نہیں جس پر ہار پہن کر خوشی منائی جائے''۔ ذمہ داری کے بوجھ کا شدت سے احساس رکھنے والی اور کسی بھی قسم کی نمود و نمائش سے اجتناب کرنے والی یہ خاتون بنت مجتبیٰ مینا تھیں جنہیں ادبی میدان کا مینارہ نور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی شخصیت میں برصغیر کے مسلمانوں کی اعلیٰ تہذیب رچی بسی تھی انہوں نے پورے شعور کے ساتھ اپنی ذات سے بلند ہو کر نوع انسانی کی تعمیر و تربیت کو اپنی زندگی کا محور و مرکز بنا لیا تھا، اس غرض کے لیے انہوں نے جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی تو اپنی تمام عمر اسی مقصد پر والہانہ نثار کر دی۔

جماعت سے وابستگی

نظم نے انہیں جہاں کھڑا کر دیا انہوں نے اس محاذ کو بہترین طریقے سے سنبھالنے میں اپنی تمام صلاحیتیں کھپا دیں۔ وہ خود کو ہمیشہ پچھلی صفوں میں رکھنے کی کوشش کرتیں لیکن اگر کوئی ذمہ داری دے دی جاتی تو پھر اس کو کماحقہ ادا کرنے میں لگ جاتیں۔ کام کی ابتدا میں جب وسائل کم تھے بسوں، تانگوں، ٹیکسیوں پر جا جا کر دعوتی کام انجام دیا۔ جب انتخابات کا وقت آیا تو اس کی مہم میں حصہ ڈالنے کے لیے نہ صرف خود سرگرم رہیں بلکہ جذباتی ہو جانے والے کارکنان کو بھی اس راہ پر تھامے رہتیں۔ نرم لہجے میں سمجھاتیں اتنا اچھا راستہ اپنا لیا ہے اس سے اچھا راستہ نہیں ہے، خواہ مخواہ جذباتی ہو کر اپنا راستہ کھوٹا کر رہی ہیں۔ مرکزی شوریٰ کی ابتدا سے رکن تھیں نہایت پابندی سے اس میں شرکت کرتیں اور اکثر اپنی باری پر اس طرح دلائل سے بات کرتیں کہ سب اس پر متفق ہو جاتے جماعت سے محبت ان کی رگ و پے میں دوڑتی تھی اس

کی کارکردگی کو بہتر سے بہترین دیکھنے کی خواہاں رہتی تھیں۔ ۱۹۷۲ء میں آپ رکن بنیں اور اس کے بعد ہر مقام پر ہراول دستہ کا کردار انجام دیا۔ ۱۹۷۷ء میں پرجوش طریقے سے تحریک نظام مصطفیٰ کا ساتھ دیا بہادری اور کارکن سے والہانہ محبت کی اک جھلک اس واقعہ میں نظر آئی جب زہرا وحید صاحبہ کے گھر پر ٹیکسی سے اُتریں اور دیکھا کہ ان کے گھر کے باہر سرخ سیاہی سے کراس کا نشان لگا ہوا ہے جو کسی خفیہ ایجنسی کی کارروائی لگتی تھی اور گھر پر نشان لگا کر شاید حکومتی عتاب کا نشانہ بنانے کی تیاری تھی۔ آپ نے ایجنسیوں اور محلّہ والوں کی پروا نہ کرتے ہوئے ڈرائیور کو یہ نشان مٹانے کا حکم دیا اور جب تک یہ نشان نہ مٹا، باہر ہی کھڑی رہیں۔

استقامت

جماعت اسلامی کے تمام ادوار میں اس کا سرمایہ بنی رہیں اور جب کچھ اطراف سے ایسی تنقیدی آوازیں اُبھرنے لگیں کہ مولانا نے خواتین کے سیاست میں زیادہ حصہ لینے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور جماعت اب مولانا کی فکر سے انحراف کر رہی ہے تو بھی آپ اطاعت نظم میں سیاسی محاذ پر جمی رہیں انہوں نے ان پُرخار راہوں پر پہلے چل کر راہیں آسان، صاف اور روشن کر دیں۔ یہ بات اس وقت انتہائی صدمہ کا باعث بنی کہ ہر قدم پر ساتھ دینے والے شوہر محترم جماعت اسلامی سے الگ ہو کر دوسری تحریک کا حصہ بن گئے، لیکن اس صدمے کے باوجود آپ استقامت سے اپنے مقام پر کھڑی رہیں۔ اپنے بچوں کے لیے بھی دعا گو رہیں کہ وہ جماعت اسلامی کا کام کرنے والے بنیں ان حالات میں جتنے بھی کڑے مراحل آئے وہ سب صبر کے ساتھ گزارنے کی ہی نصیحت کرتی رہیں۔

حسن توازن

صبر ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔ انتہائی خوددار، حیادار، بہترین رازدان، صدقہ کرنے والی، دوسروں کو رعایت دینے والی، ایثار پسند، خوش اخلاق اور سادگی پسند خاتون تھیں ۱۹۵۷ء میں شادی ہوئی تو بھرا پُرا سسرال ملا، گھر میں ہر طرح کے سسرالی رشتے دار موجود تھے۔ بڑا خاندان، بھاری کام، حساس رشتے نبھاتے کبھی ماتھے پہ شکن نہیں آئی۔ وہ آہستہ آہستہ سلیقہ و نفاست سے کام کرتی جاتیں اور ساتھ موجود افراد سے دنیا بھر کے موضوعات پر تبصرے و

تجزیئے ہوتے جاتے ان کے مزاج میں نہ سختی تھی نہ رہبانیت۔انہوں نے کبھی کسی چیز سے کسی کو حکماً روکا نہ کرنے پر اصرار کیا۔ وہ معاملہ کے دونوں پہلو سامنے رکھ دیتیں خاندان کی بیٹیاں ان سے فیشن، متوازن غذا، میک اپ اور زیورات پر بھی مشورے لیتیں اور سسرالی، خاندانی تعلقات اور رشتوں کی اُلجھنوں پر بھی رہنمائی لیتیں۔ وہ سمجھاتیں کہ اللہ سے دعا کیا کرو کہ وہ دلوں میں محبت دے، محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے وہ خود اپنا اثر دکھاتی ہے پھر کوئی حق جتلانے یا منوانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ سادگی، سلیقہ اور قرینہ ان پر ختم تھا۔ان کا گھر نفاست طبع اور ذوق سلیم کا منہ بولتا ثبوت تھا۔خود کہتی تھیں کہ اگر صحن میں ایک چارپائی بھی ٹیڑھی رکھی ہو تو میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔گھر کے جملہ کاموں کو نمٹاتے ہوئے ہی آپ نے تحریک کی ذمہ داریوں کو بھی بخوبی انجام دیا۔ دن میں گھریلو اور جماعتی کام ہوتے اور رات میں کپڑوں کی سلائیاں اور ادبی کام انجام پاتے۔

میدان ادب کی رہنما لکھاری

میدان ادب میں شاہ بلوط کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ۱۹۸۱ء سے ہر ماہ کی آخری جمعرات کو ادبی نشست کی روایت حلقہ خواتین لاہور میں جاری وساری تھی۔تسلسل سے جاری اس روایت کو عنوان دے کر ایک محفل کی شکل قرار دینے کا فیصلہ کیا گیا۔سب کے مشورے سے حریم ادب کا نام تجویز ہوا اس کی پہلی صدر بنت الاسلام صاحبہ اور مینا آپا سیکرٹری قرار پائیں۔ بنت الاسلام صاحبہ کی وفات کے بعد اس بزم کی صدارت مینا آپا کے سپرد کر دی گئی جنہوں نے آخر وقت تک اس بزم کی سرپرستی کی۔اس کے ساتھ ہی آپ ادارۂ بتول کی بھی سرپرست تھیں جس کے تحت بچوں کے لیے نکلنے والے رسالے ''نور'' کی ادارت آپ نے کم وبیش پچاس سال تک سنبھالی۔اس طویل عرصے نور کے اداریے اور ریڈیو نورستان کے تقریباً چھ سو پروگرام ان کا گراں قدر قلمی اثاثہ ہے۔انہوں نے ریڈیو نورستان کے عنوان سے تحریر کا ایک نیا اسلوب نکالا، جہاں ریڈیو کے خبرنامے کے انداز میں بچوں کو خبروں تک رسائی دی جاتی تھی۔'' ٹک ٹک ٹک۔ السلام علیکم۔ ۸۶ میٹر بینڈ پر یہ ریڈیو نورستان ہے''۔ یہ وہ صدا تھی جو قلمی صورت میں بچوں کو اپنا اسیر بنائے ہوئے تھی بچوں کا ادب لکھنا اور اس میں بچوں کی دلچسپی برقرار رکھنا بے حد کٹھن

کام ہے لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اس کا بیڑہ اُٹھائے رکھا اور بچوں کی نفسیات اور شوق کے مطابق نور کی کہانیوں کے حصار کو قائم رکھا۔خوبصورت آغاز، حکیمانہ مکالمہ، دلچسپ راہ عمل اور دعائیہ اختتام! بچیوں میں یہ تمنا پیدا کی۔ایک دفعہ بزبان شاعری نصیحت کی۔

میں حسن سیرت کا وہ نمونہ بنوں کہ دنیا پکار اُٹھے
یہ کس چمن میں کلی کھلی ہے یہ کس گلستاں کا پھول مہکا

انہوں نے اسلامی وتعمیری ادب کو پروان چڑھانے کی زندگی بھر کوشش کی۔ادبی نشست کے اختتام پر مینا آپا نہایت مدبّرانہ فہم وفراست سے بھرپور انداز میں تنقید فرماتیں۔ پہلے اچھے پہلوؤں کی نشاندہی کرتیں بعد میں خامیوں پر نظر ڈالتیں۔ان کا تبصرہ سارے پروگرام کی جان ہوتا تھا بہترین الفاظ کے چناؤ کے ساتھ اتنا نپا تلا تبصرہ کرتیں جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دیا جائے ان کا تبصرہ سننے کے لیے لوگ دور دور سے ادبی محفل میں شریک ہوتے نوآموز لکھنے والیوں کو بھی ہماری بہت اچھی مصنفہ کہہ کر متعارف کرواتیں۔

قلمکار خواتین کی تیاری

نئے آنے والیوں کی حد درجہ حوصلہ افزائی کرتیں ایسے کہ انہیں ادب سے پیار ہو جاتا۔ وہ پتھروں میں سے پارس تلاش کرنے کا کٹھن کام کرتی تھیں۔ بحیثیت مدیرہ نور بھی اور بحیثیت نگران حریم ادب لاہور بھی۔اس سالہا سال کی محنت سے آپ نے اصلاحی ادب کی قلمکار خواتین کی کھیپ تیار کی جس کے چند نمایاں ناموں میں فرزانہ چیمہ، سمیہ مسعود عبدہ، ناہید زاہد، فرات غضنفر، صائمہ اسماء، ذروہ احسن اور آسیہ راشد شامل ہیں بار بار کہتیں کہ جوانی میں لکھو جتنا لکھنا ہے بڑھاپے میں لکھنا بہت مشکل ہے۔تقریر کے مقابلہ میں تحریر کا دائرہ اثر وسیع ہے تقریر تو کم ہی لوگ سنتے ہیں لیکن جب کوئی اچھی تحریر شائع ہوتی ہے تو اسے ہزاروں لوگ پڑھتے ہیں۔ وہ ادیب تھیں اور ادیب دوسروں کو رہنمائی دیتا ہے اس لیے وہ بہت سوچ سمجھ کر بات منہ سے نکالتیں۔الفاظ کا چناؤ، مقصدیت، روانی، غرض آپ کی گفتگو اور دو قواعد کی تمام خوبیوں کا مرقع تھی۔ گفتگو ہو یا عبارت اسے چار چاند لگ جاتے۔ لکھنے والیوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ان کی بنیاد کی درستی بھی آپ کے پیش نظر رہی۔ ہمیشہ نصیحت کی کہ ''اخبار ورسائل میں کوئی چیز چھپ جائے تو انسان

خود کو بڑا سمجھنے لگتا ہے۔ یہ نام ونمود کی خواہش مقصد سے دور لے جاتی ہے اس خواہش سے دور رہنا جس دن ہمارے دلوں میں یہ خواہش جڑ پکڑ گئی ہماری تحریریں بے کار ہو جائیں گی' اپنی اس نصیحت پر خود ایسا عمل کیا کہ زندگی میں اپنی شاعری کو کبھی مرتّب کر کے شائع نہ کروایا۔

بحیثیت شاعرہ

ان کی شاعری با مقصد اور باوزن ہوتی تھی وہ شاعر برادری کے اس کمیاب گروہ سے تعلق رکھتی تھیں جس نے اس شعور کو محض اظہار ذات تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ اپنی شخصیت کو سنوارنے میں اس سے بہت مدد لی۔ نبی کریمؐ سے اتنی محبت تھی کہ اپنے نعتیہ اشعار سناتے ہوئے اکثر ان کی آنکھیں اشکبار ہو جائیں، خود بھی روتیں اور شرکا کو بھی رلا جاتیں۔

ان کی طبیعت میں سوز پایا جاتا تھا' اسی سوز نے ان کی شاعری کو پُرسوز بنا رکھا تھا۔ سقوط ڈھاکا کا المیہ پیش آیا تو یہ سوز نہاں شاعری میں ڈھل گیا۔

مرثیہ دلی مرحوم کا لکھا تھا کبھی
مرثیہ ڈھاکا و جیسور کا اب کہنا ہے
تو نے کیا کیا نہ سہا سیل بلا کے ہاتھوں
تجھ کو کیا کیا دل ناشاد ابھی سہنا ہے

حسن اخلاق

اخلاق و معاملات میں آپ نو باتوں کے حکم والی حدیث کی مصداق تھیں۔ ٹکراؤ کی بہ نسبت مصالحت، انا کی بہ نسبت انکسار، ضد کے بجائے جھکاؤ ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ جب منصورہ لاہور میں خواتین مرکز کی بنیاد رکھی جانے لگی تو آپ کو پکارا گیا کہ اپنے تحمل کا ایک پتھر بھی اس کی بنیاد میں رکھ دیجیے! ہر عمر کے لوگوں میں گھل مل جاتیں ایک ماہ کے بچے سے لے کر سو سال کے بزرگ تک سبھی کو ایک جیسی توجہ اور محبت دیتیں۔ نوزائیدہ بچے کو اُٹھا کر کہتیں۔ بنانے والے نے کتنے پیارے ہونٹ بنائے ہیں، آنکھیں کتنی پیاری ہیں اس طرح ہر چیز کی تعریف کرتیں اور ماں خوش ہو جاتی۔ انسانوں سے محبت کرنا ان کا ایمان تھا۔ جھگڑوں میں تصفیے کرانے میں ملکہ حاصل تھا۔ شکایت کرنے والے کی بات کو مسکرا مسکرا کر پلٹتی رہتیں۔ اس کا

مطلب کچھ اور ہوگا شاید آپ نے غلط سنا ہو، آپ کو نہیں کسی اور کو یہ بات کہی ہوگی اور پھر آخر میں کہتیں ارے بہن چھوڑو۔ پھر کیا ہوا؟ معاف کر دو، بڑا اجر پاؤ گی۔ کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں اور مسکراتے لب لیے آپ مختصر، مدلل، جامع و سنجیدہ بات کرتیں جو ہمیشہ موضوع سے متعلق ہوتی۔ حکمت ان کی خداداد صلاحیتوں میں سے تھی۔ ناراض کارکنوں کو سمجھایا کرتیں۔ پہلے بات کا وزن کیا کرو پھر بولا کرو۔ سمجھو بات ہوئی ہی نہیں کیونکہ غصہ میں انسان انسان نہیں رہتے۔ بعد میں اس بات کا ٹھنڈے دل اور حکمت سے جائزہ لو۔ ہم نے رشتہ داریاں، برادریاں اللہ کے نام پر چھوڑ دیں۔ اب یہی ہمارے خاندان اور محبتیں ہیں۔ ان کو چھوڑ دیا تو کہاں جائیں گے؟ ہمیشہ دوسروں کو رعایت دیتیں۔ صائب الرائے تھیں لیکن دوسروں کی رائے کو ترجیح دیتیں۔ بہترین رہبر و رہنما تھیں۔ ان کا لکھا دیکھ کر لوگ ادیب بنتے۔ شاعران کی شاعری دیکھ کر اپنی اصلاح کرتے لیکن آپ انکسار میں گم رہتیں۔ ادارہ بتول کی صدارت اور مدیرہ نور ہوتے ہوئے بھی عام کارکن کی طرح رہیں۔ مزاج میں ذرا بھی غرور نہ تھا۔ ان کے ایمان کی بنیادیں بڑی مضبوط تھیں کبھی معاشی حالات میں سختی آئی تو بڑے یقین سے فرمایا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ میرا رازق خدا کبھی مجھے آزمائے گا۔ میرا ایمان ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے زندگی بھر کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ وہ تو دلوں کو موہ لیا کرتی تھیں۔ ہر کسی کو اچھے الفاظ سے یاد کرتیں۔ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتیں۔ بہت اچھی سامع تھیں، پوری توجہ سے بات سنتیں اور اپنے تئیں بہترین مشورہ دیتیں، جس کا لب لباب یہ ہوتا کہ دوسروں کے قصوروں سے درگزر کیا جائے، خوش گمانی رکھی جائے اور نرمی سے کام لیا جائے۔

رشتوں کی پاسداری

گھر، شوہر اور بچوں کی تربیت ہمیشہ ترجیحات میں رہیں۔ شادی کے وقت بچیوں کو بھی نصیحت کی کہ اس فرض کے ساتھ ساتھ دوسرے کام لے کر چلنا۔ بچوں کو شروع سے اپنے کاموں میں شریک کیا۔ انہیں ادب سے آشنا کیا اور اس سے محبت کرنا سکھائی۔ بیٹی کے ساتھ انگریزی ادب کی کتابوں پر تبصرے اس طرح جاری و ساری رہتے کہ لوگ سمجھتے کہ انگلش میں ایم اے کیا ہوا ہے۔ انگریزی ادب پہ ان کا تبصرہ تھا کہ انگریز چونکہ ہمارے آقا تھے اس لیے ان

کے ادب کو اس قدر بانس پر چڑھایا گیا ورنہ حقیقت میں ہمارا فارسی و اردو ادب انگریزی ادب سے بدرجہا بہتر اور بالغ ہے۔ بچوں کو آفاقی نظر سے دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کی ہمت دلاتیں۔ وہ بچوں کے اندر بڑی شخصیت کا کھوج لگا کر ان کی تعمیر کرتیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی دلچسپیوں میں حصہ لیتیں۔ صلاحیتیں اُجاگر کرنے کا شوق دلاتیں، ان سے باتیں کرتیں، ان کے مشاغل پوچھتیں، کہتیں کہ بچوں سے مکالمہ کرنا چاہیے کیونکہ بچے اپنے بڑوں سے ہی ادب آداب اور تہذیب سیکھتے ہیں۔ پوتے اور پوتیوں کو وہ ورثہ منتقل کرنے کی کوشش کرتیں جو برصغیر کی مسلم ثقافت کا خاصہ تھا بچوں کو کوئی ڈانٹتا تو ان کا چہرہ اُتر جاتا۔ ان کا کہنا تھا کہ بچہ بھی پورا آدمی ہوتا ہے۔ اس کے احساسات، جذبات اور عزت نفس کا خیال رکھنا چاہیے۔ ادب سے دلچسپی کے باعث ایسی بہو لانے کی خواہش رکھتی تھیں جو لکھنے پڑھنے والی ہو بے شک اسے کھانا پکانا نہ آتا ہو، سعیدہ احسن صاحبہ کی بیٹی ''ذروہ'' آپ کی بہو بنی تو اسے بھی یہی نصیحت کی کہ ''اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر لکھو۔ انسان سوچتا ہے کہ فارغ ہو کر یہ کام کروں گا لیکن فراغت کبھی نصیب نہیں ہوتی وقت ملتا نہیں نکالنا پڑتا ہے۔

ساس بہو کا آزمائشی رشتہ بھی بڑی خوبی سے نبھایا یہاں تک کہ بہو کہتی تھی کہ میں اپنی ساس کا زیادہ ذکر اس لیے نہیں کرتی کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔ بیٹے کی شادی کے بعد دلہن کے ساتھ اس کے گھر اسے رہنے کے لیے بھیج دیا یہ کہہ کر ''میاں ہم تو جانتے ہیں تم کیسی اولاد ہو۔ اب سسرال والوں کے ساتھ رہ کر ثابت کرو کہ انہیں کتنا اچھا بیٹا ملا ہے''۔ بہو آسٹریلیا سے واپس آئی تو چھوٹی بہن کے امتحانات کے باعث طے یہ پایا کہ وہ پہلے سسرال جائے گی پھر امتحانات کے بعد میکے آئے گی تو اپنی بیٹی کو یہ کہہ کر ائیر پورٹ بھیجا کہ ذروہ جب تک اپنی ماں کے گلے لگ کر ان کا دل ٹھنڈا نہ کر لے میرے پاس نہ آئے۔ ایک دفعہ اسلام آباد سے اپنی سمدھن کو فون کر کے کہا کہ آج میں نے اپنے بیٹے اور بہو کو پہلی بار آزادانہ گھر چلاتے دیکھا، دو نفل ادا کرتے ہی آپ کو فون کر رہی ہوں۔ ہمیشہ کوشش کرتیں کہ ان کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ ہو۔ وضو کر کے آئی ہوتیں اور کھانا لگنے کی اطلاع ملتی تو فوراً کھانا کھانے آجاتیں۔ اپنے بچوں کو ہمیشہ صلہ رحمی کی تاکید کرتیں۔ توجہ دلاتی رہتیں کہ فلاں کو فون کیا؟ فلاں سے ملنے گئے؟ اجتماع اہل خانہ میں بہت شوق سے

شرکت کرتیں اور اس کے بعد بچوں کے لیے کھانے پینے کے انتظامات کی ضرورتاکید کرتیں۔ چھوٹی چھوٹی پریشانیوں پر حوصلہ ہارنے کے بجائے مقابلہ کرنے کی ہمت دلاتیں۔ لاہور میں گیس کے کم ہونے پر جب سب شکوہ شکایت کرتے تو کہتیں ''ارے بھئی گھبرانے اور حکومت کو برا بھلا کہنے کے بجائے کوئلوں پر کھانا پکا لیا کرو۔ پہلے وقتوں میں ہم تو کوئلوں پر ہی پکاتے تھے''۔

دمِ آخر

شوہر محترم کے ساتھ پوری دنیا گھومی۔ بعد میں اپنے بچوں کے ساتھ بھی تمام سرگرمیوں میں شریک ہوتیں لیکن افسردگی چھلک جاتی۔ آخر عمر میں باتیں بھولنے لگی تھیں لیکن اس میں بھی امید کا پہلو تلاش کر لیا کرتی تھیں۔ ''میں بہت بھولتی ہوں مگر فائدہ یہ ہے کہ اگر اچھی بات یاد نہیں رہتی تو بری بات بھی بھول جاتی ہوں اور دکھ نہیں ہوتا'' موت کا ذکر ہوتا تو کہتیں ''موت کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرو خیال کرو تو موت کے خوف میں کمی آتی جائے گی، مجھے اپنے رب کی رحمت پر پورا یقین ہے میں نے زندگی کے ہر قدم پر اس کی رحمت وعنایت کو محسوس کیا ہے کیا اب وہ مجھے چھوڑ دے گا؟ یقیناً نہیں''۔ لبوں پر دعا رہتی کہ ''اللہ نماز پڑھاتا اور روزے رکھواتا ہوا لے جائے''۔ اللہ نے ان کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔ اپنی بیٹی کے پاس دبئی گئی ہوئی تھیں عشاء کی نماز کے بعد طبیعت خراب ہوئی، اسپتال لے گئے۔ آخری وقت میں بھی پورے ہوش و حواس میں کلمہ طیبہ زبان پر جاری تھا۔ ایمبولینس سے اتارتے ہوئے لڑکے نے لا الہ الا اللہ کہا تو کہنے لگیں محمد رسول اللہ بھی کہو۔ کچھ دیر ICU میں رہیں اور پھر ان کی روح اپنے رب کے پاس پرواز کر گئی۔ اپنی زندگی میں ہی اپنے ادارے اور اپنی ذمہ داریوں کے لیے افراد کو تیار کر گئیں زمانے کی گردش نے انہیں ہم سے دور کر دیا مگر ان کی رہنمائی، روشنی اور چمک آنے والے بے شمار لوگوں کے لیے مشعل راہ رہے گی اور آنے والے ان سے سنہرے موتی لیتے ہوئے اس راہ میں نئے نئے دیے جلاتے رہیں گے۔ ان شاء اللہ!

ماخذ

خصوصی نمبر بتول جولائی ۲۰۱۱ء

&
روشن نسرین

۱۹۳۲ء تا ۱۹۸۱ء

)

4

۱۹۶۳ء میں لاہور میں ہونے والے اس اجتماعِ عام میں بھی آپ نے شرکت کی جہاں ایوب خان کے حکم سے شرکاء کو فائرنگ کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی۔ آپ کی چھوٹی بچی اس وقت جس جگہ لیٹی ہوئی تھی، وہیں باہر سے پیٹرول بم آ کر گرا لیکن اللہ کے حکم سے بچی محفوظ رہی۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ خوف و جبر کے ماحول میں لاہور تک کا سفر اور اجتماع میں شرکت حوصلہ مندی کا ثبوت تھا۔

۱۹۷۰ء کے الیکشن کا ایک واقعہ ہے کہ الیکشن مہم کا پہلا جلسہ خواتین کا ان کے گھر کے برابر سڑک پر شامیانہ لگا کر کیا گیا تھا۔ اس جلسے کے دوران بھٹو کے کارندوں نے اچانک شامیانے کی رسیاں کاٹ دیں، لیکن روشن نسرین نے وہاں موجود بچوں اور خواتین کو پہلے ہی حالات سے نمٹنے کے لیے تیار کیا ہوا تھا، اس لیے رسیاں کٹتے ہی بچے ان رسیوں کو پکڑ کر جھولنے لگے کہ شامیانہ خواتین پر گرنے نہ پائے، اس شور وغل میں غنڈے فرار ہو گئے۔

4

عزیز آباد کراچی کے علاقے کے ایک مکان کی نئی رہائشی خواتین سخت پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہی تھیں۔ انہیں اس مکان میں منتقل ہوئے صرف تیسرا دن تھا اور دونوں کے مشترکہ شوہر جو شدید بیمار تھے۔ قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے تھے نیا محلّہ، نہ جان نہ پہچان کسمپرسی کا عالم اس پر مستزاد یہ کہ گھر کے سربراہ کا یوں انہیں تنہا چھوڑ کر چلے جانا، جائیں تو کہاں جائیں! غم والم کی تصویر بنی یہ دونوں خواتین حیران پریشان تھیں کہ کس کو مدد کے لیے بلائیں۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی ہمت کر کے دروازہ کھولا تو ایک خاتون جو برقعے میں ملبوس تھیں ان کے رونے کی آواز سن کر وجہ معلوم کرنے آئی تھیں۔ حقیقت کا علم ہوتے ہی زخمی دلوں پر دلاسے کا مرہم رکھتے ہوئے انہیں گلے لگا کر دلجوئی کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا انتظام سنبھال لیا۔ اہل محلّہ کو اطلاع سے لے کر مرحوم کے سفر آخرت تک کے مراحل میں ان کی مدد کی اور کئی روز گھر جا کر تسلی دیتی رہیں۔ جذبۂ خدمت سے سرشار یہ دلگداز خاتون روشن نسرین تھیں، جن کے لیے پڑوسی اور اُن کے حقوق انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ نئے آنے والے پڑوسیوں کے دروازے پر وہ خود دستک دیتیں۔ ان کی ضروریات معلوم کرتیں۔ کھانے بنا کر بھیجتیں۔ اُس روز بھی وہ اُسی مقصد کے لیے ان گھر کی طرف آئیں اور خواتین کے رونے کی آواز سن کر مدد پر کمر بستہ ہوگئیں۔ بعد میں ان خواتین سے ایسا تعلق استوار ہوا کہ دونوں ہی دین کی راہ کی پُر جوش راہی بن گئیں۔ دونوں جماعت اسلامی کی رکن بنیں۔ اپنے بیٹے کی شادی بھی جماعت اسلامی کی کارکن سے کی۔ یوں دلسوزی کے ساتھ لگایا گیا بیج خوب برگ و بار لایا اور ایک خاندان اور اس کی نسلوں کا رُخ دین کے راستے کی جانب موڑ دیا۔

ابتدائی تعارف:

''روشن آپا'' کے نام سے معروف روشن نسرین کا اصل نام جو اُن کی والدہ نے رکھا، ''سردار جہاں'' تھا لکھنؤ شہر سے تعلق تھا۔ ۱۹۳۸ء کے بعد کا زمانہ تھا۔ انہیں ان کے والد نے بڑے شوق سے اسکول میں داخل کروایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسکول میں بھی گھروں کی طرح کے

لباس یعنی غراروں کا یونیفارم ہوا کرتا تھا، ''ڈولی'' میں اسکول جاتیں جسے ''کہار'' اُٹھایا کرتے۔ یوں وہ اپنے زمانے کی تعلیم یافتہ خاتون کہلائیں۔ ان کی شادی اشفاق حسین صاحب سے ہوئی جو جماعت اسلامی کے طرز فکر کو پسند کرتے تھے، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے بھی متعارف تھے اور اکثر ذاتی دلچسپی کے تحت لکھنؤ میں تعطیل کے دن یتیم خانے کے بچوں کو کھانا کھلاتے اور خود ان کے ساتھ کھاتے۔ ایک ایک پیسہ ہر بچے کو جیب خرچ بھی دیتے۔ چونکہ وہ خود بہت چھوٹی عمر میں یتیم ہوگئے تھے اس لیے یتیموں سے دلی لگاؤ رکھتے تھے۔ اسی جذبۂ خدمت نے انہیں جماعت اسلامی کی فکری و عملی سرگرمیوں سے جوڑ دیا۔ قیام پاکستان کے دو سال بعد وہ کراچی آ گئے۔ جماعت اسلامی کے باقاعدہ کارکن بنے اور پھر رکن۔ ساتھ ہی اپنی اہلیہ روشن نسرین کو بھی تحریک سے متعارف کروایا، فیشن ایبل خاتون جنہوں نے اپنا نام بھی ''سردار جہاں'' سے بدل کر ''روشن نسرین'' رکھ لیا تھا۔ خاندان بھر کی لڑکیوں کے لیے وہ بالوں کے انداز، کپڑوں کی تراش خراش، رکھ رکھاؤ اور حسن و جمال میں ایک مثال تھیں، تعلیم یافتہ تھیں اس لیے ''ماڈرن پبلک اسکول'' کے نام سے اس علاقے کا دوسرا اسکول کھولا جو بعد میں بند ہوگیا۔ اور جب شوہر کی جانب سے دی جانے والی جماعت اسلامی کی دعوت سے روشناس ہوئیں تو گویا ساری دلچسپیوں، سرگرمیوں اور سوچوں کا مرکز دعوت دین قرار پایا۔ اُن کا اوڑھنا بچھونا جماعت اسلامی کی دعوت حق کو پھیلانا بن گیا۔ یہاں تک کہ کراچی جماعت اسلامی حلقہ خواتین کا باقاعدہ آغاز و قیام آپ جیسی خواتین ہی کے ذریعے انجام پایا۔

عمارت کی بنیادی اینٹیں:

علاقہ وسطی کراچی میں جماعت اسلامی کی ابتدائی رکن محترمہ مومنہ صاحبہ نے بتایا کہ ۱۹۶۴ء میں ہم لوگ کراچی آئے یہاں آ کر مجھے جماعت اسلامی کی تلاش ہوئی میرے بڑے بھائی حکیم محمد خالد جو جماعت اسلامی کے تاسیسی ارکان میں سے تھے اور ان کی وابستگی کی وجہ سے جماعت اسلامی کا دوسرا اجتماع عام الہ آباد میں ہمارے گھر پر ہوا تھا، اس بنا پر میں بھی حلقہ خواتین سے منسلک ہونے کی خواہشمند تھی۔ جب کسی ذریعے سے مجھے روشن نسرین کا پتا معلوم ہوا تو ان تک اپنی آمد کی اطلاع اور ملنے کی طلب پہنچائی تو وہ مجھ سے ملاقات کے لیے گھر آئیں

اور مشورہ دیا کہ آپ یہاں لیاقت آباد میں درس رکھ لیں۔انہوں نے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دی۔ جہاں ایک کمرہ انہوں نے اجتماعات کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ان کے شوہر محترم نے روشن آپا کو کام کا پورا طریقہ کار سکھایا۔ پھر روشن آپا نے ابتدائی دس گیارہ ارکان جن میں بلقیس صوفی، بیگم مصطفیٰ سرور، بدر آپا، بیگم نعمت اللہ کلیم، قمر جلیل اور چند اور خواتین شامل تھیں۔ انہیں اجتماع کا رکنان کرنا، اس کا ایجنڈا بنانا، رپورٹ تیار کرنا، درس قرآن دینا سکھایا۔ جب ہم درس دینے سے گھبراتے تھے تو کہتی تھیں کہ لوگوں کو نہ دیکھو قرآن سے سمجھو، قرآن کیا کہہ رہا ہے؟ یہ لوگوں کو بھی بتاؤ۔ ان کے مزاج میں بے حد نرمی تھی ان کی بات دل میں اُتر جاتی تھی۔ ان کے کہنے پر میں نے اپنے گھر میں درس قرآن رکھا۔ پڑوس میں دعوتیں دیں۔زیادہ تر لوگوں نے مخالفانہ رویہ اختیار کیا۔لیکن ان کے سمجھانے پر ہم بہت کچھ سننے کے باوجود اپنی کوششوں میں استقامت کے ساتھ لگے رہے۔انہوں نے بتایا کہ اس وقت لوگ کم تھے لیکن سب ایک خاندان کی طرح رہتے تھے خوشی غمی کے ساتھی تھے۔ بسوں میں سفر کر کے ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے۔میرے بچوں کی پیدائش پر روشن آپا بس میں سفر کر کے آتیں بچوں کے لیے تحائف لاتیں۔

آغازِ سفر:

روشن آپا کی چھوٹی بیٹی غزالہ عزیز صاحبہ نے بتایا کہ امی نے تحریکی سفر کے لیے زادِ راہ کے طور پر سب سے پہلے قرآن کا لفظی ترجمہ پڑھا۔اس کے لیے عزیز آباد سے لیاقت آباد بس پر جاتیں وہاں نور جہاں آپا سے قرآن پڑھتیں جب اچھی طرح قرآن کی دعوت دل میں اُتر گئی تو پھر نہ دائیں دیکھا نہ بائیں، اس دعوت کو آگے بڑھانے میں لگ گئیں۔خاندان میں غیر اسلامی رسوم و رواج اور بدعات کا رواج عام تھا امی اپنا نقطۂ نظر بیان کرتیں جو تنقید کا نشانہ بنتا لیکن امی نے بڑی لگن کے ساتھ دعوت دین کا کام خاندان میں جاری رکھا۔ وقت کے ساتھ سب ہی کسی نہ کسی دائرے میں ان کے ساتھ دین کی جدوجہد میں شامل ہوگئے۔اپنے گھر میں ہفتہ وار درس کا انعقاد ہم بہن بھائیوں کی تربیت کے لیے مفید ثابت ہوا۔جمعرات کو نیند قربان کر کے سات آٹھ برس کی عمر میں اس اجتماع میں ہم شریک ہوتے۔ محلے میں درس کی یاددہانی کروانا ہمارا

کام تھا۔درس کے بعد کسی کتاب یا بتول رسالے سے لڑکیوں سے مضامین پڑھواتیں۔ جس سے مضمون میں دلچسپی پیدا ہونے کے ساتھ اُردو کا تلفظ بھی درست ہو جاتا اور بچوں کی جھجک بھی ختم ہوتی۔ یہ ایک مفید پروگرام رہا۔جس نے بعد میں تحریک کو بہترین کارکنان دیے۔

ناظمہ کراچی کی حیثیت سے عزیز آباد سے دور دراز کی آبادیوں میں دعوتی کام کے پھیلاؤ کے لیے جاتیں۔اس مقصد کے لیے کھوکھراپار، ڈرگ روڈ، شاہ فیصل کالونی سرکلر ریلوے کے ذریعے سفر کر کے جاتیں۔اُن کے ہمراہ اُن کی بچیاں بھی ہوتیں۔اسی طرح غریب آباد میں جہاں اس وقت بجلی نہیں تھی اور چھت پر کپڑے کا ڈوری کھینچ کر چلنے والا پنکھا ہوا کا واحد ذریعہ تھا، وہاں خواتین کو ایک کارکن ''بسم اللہ خاتون'' کے گھر جمع کر کے درس قرآن کا اہتمام کرتیں۔

شخصی اوصاف:

روشن آپا کی بہو معزز فاطمہ صاحبہ نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''وہ چاہتی تھیں کہ کسی میں خیر کی ذرا سی کرن ہو تو اسے پورا چاند بنا دیں نیکی کا ایک ننھا سا بیج بھی ہو تو پورا باغ لگا دیں۔ایسے پہلو سے دوسرے پر اثر انداز ہوتیں کہ وہ اپنے آپ کو بچا نہ پاتے۔

مزاج میں نرمی:

ان کی نرم طبیعت کے باعث لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔معز صاحبہ نے بتایا کہ ''میری والدہ بڑی شرمیلی، کم گو اور گھر گرہستی میں گم رہنے والی خاتون تھیں۔لیکن جب ان سے تعلق استوار ہوا تو بالکل بدل گئیں۔ہم بچوں کو بھی بہت پیار کرتیں اُن کی کتابوں کی ڈھکنے والی ٹوکری ہماری دلچسپیوں کا محور تھی جس میں سے وہ نکال نکال کر ہمیں تحائف میں کتابیں دیتیں۔انہوں نے بتایا کہ!''جب میں سسرال آئی تو ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہ ہوا درگزر کرنا، خوبیوں پر نظر رکھنا، خامیوں کو نظر انداز کرنا، حق سے زیادہ دینا اور اپنا حق نہ مانگنا، پیٹھ پیچھے بھی برا نہ کہنا یہ ایسا صالح ماحول تھا کہ جس میں دوسروں کے لیے نرمی اور محبت گھلی ہوئی تھی۔''میری شادی کے بعد شوہر صاحب نے ایک بار اپنی امی سے پوچھا کہ آپ کو اپنی بہو کیسی لگتی ہے تو انہوں نے مسکرا کر جواب دیا ''اچھی ہے مگر درس نہیں دیتی'' اس جواب پر انہوں نے

دراصل میری توجہ اس اہم کام کی جانب مبذول کروائی، لیکن کبھی دوسرے لوگوں کے توجہ دلانے پر بھی دباؤ نہیں ڈالا''۔

حوصلہ مند خاتون:

صدر ایوب خان کے دور میں جب جماعت اسلامی پر پابندی لگا دی گئی تو وہ بڑی سختی کا دور تھا لیکن آپ کا گھر اس وقت بھی تحریک کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جماعتی لٹریچر اور دیگر اشیا یہیں سے دیگر مقامات تک منتقل کی جاتی تھیں اور وہ ذرا خوفزدہ نہ ہوتی تھیں۔ ۱۹۶۳ء میں لاہور میں ہونے والے اس اجتماعِ عام میں بھی شرکت کی جہاں شرکا کو ایوب خان کے حکم سے فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا۔ چھوٹی بچی اس وقت جس جگہ لیٹی ہوئی تھی، وہیں باہر سے پیٹرول بم آ کر گرا لیکن اللہ کے حکم سے بچی محفوظ رہی۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ خوف و جبر کے ماحول میں لاہور تک کا سفر اور اجتماع میں شرکت ان کی حوصلہ مندی کا ثبوت تھا۔

۱۹۷۰ء کے الیکشن کا دور بھی بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ خوف و دہشت کی فضا میں پیپلز پارٹی کا راج تھا اس زمانے میں قومی اسمبلی میں کراچی سے پانچ نشستیں تھیں۔ جماعت اسلامی ان میں سے دو پر کامیاب رہی ایک پروفیسر غفور احمد صاحب اور دوسرے محمود اعظم فاروقی صاحب۔ روشن آپا پروفیسر غفور احمد کے حلقۂ انتخاب کی نگران تھیں۔ ہر پولنگ ایجنٹ اور اسٹیشن تک پہنچنا اور اپنے ایجنٹ کا خیال رکھنا۔ ان کی جانب سے آنے والی شکایات پر پریذائیڈنگ آفیسر اور پولیس افسران سے بات کرنا اس وقت بڑی ہمت کا کام تھا۔ جب کہ حکومت کی پوری مشینری پیپلز پارٹی کے ساتھ تھی۔ لیکن اللہ کی مدد اور حوصلے سے کیے گئے کاموں کے نتائج اللہ تعالیٰ نے دکھائے کہ پانچ میں سے دو نشستوں پر جماعت کے اُمیدوار کامیاب ہوئے اور ایک پر ہم خیال کامیاب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے دنوں کا ہی ایک واقعہ ہے کہ الیکشن مہم کا پہلا جلسہ جب ان کے گھر کے برابر سڑک پر شامیانہ لگا کر کیا گیا تھا۔ اس جلسے کے دوران بھٹو کے کارندوں نے اچانک شامیانے کی رسیاں کاٹ دیں۔ لیکن روشن نسرین نے وہاں موجود بچوں اور خواتین کو پہلے ہی حالات سے نمٹنے کے لیے تیار کیا ہوا تھا۔ اس لیے رسیاں کٹتے ہی بچے ان رسیوں کو پکڑ کے جھولنے لگے کہ شامیانہ خواتین پر گرنے نہ پائے۔ اس شور و غل میں غنڈے فرار ہو گئے۔

ان کے داماد اسامہ مراد صاحب بتاتے ہیں کہ ''بچوں کی شادیوں میں تو انہوں نے اپنی پسند کو چھوڑ کر شوہر کی مرضی کو پیشِ نظر رکھا۔ چھوٹے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں ان کے انتقال کے بعد انجام پائیں۔ مگر بڑی بیٹی کی شادی اپنی اور اپنے بہن بھائیوں کی مرضی نہ ہوتے ہوئے بھی محض شوہر اور ان کے تحریکی رہنما ساتھیوں کے اصرار پر طے کی۔ بڑے بیٹے کی ایک درس میں آنے والی خاتون کی بیٹی سے کی لیکن اس میں اصل کردار دونوں باپوں یا شوہروں کا تھا۔ دوسری بیٹی کی شادی اگرچہ جماعت میں ایک سرگرم خاتون کے بھائی سے ہوئی مگر ان کا تعلق جماعت سے نہیں کچھ تبلیغی جماعت سے تھا۔ اب یہ دونوں بہو اور داماد ان کے بیٹے بیٹی سمیت جماعت کے رکن ہیں۔ داماد وں کے ساتھ بہت خوش مزاجی اور خیال رکھنے والا رویہ تھا۔ کبھی بھی کسی بات پر تلخی یا تکرار یا ناراضگی مجھے بالکل یاد نہیں۔ کم از کم بڑی بیٹی کی تو اتنی اچھی تربیت کی تھی کہ مجھے اپنے ساتھ سلوک اور دونوں خاندانوں میکہ اور سسرال پورے محلے اور حلقۂ تعارف میں زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی تعریفیں سن کر اس کا شوہر ہونے پر غرور کی حد تک فخر ہے''۔

پہلے انڈسٹریل ہوم کا قیام:

لیاقت آباد کے علاقے میں جماعت اسلامی حلقہ خواتین کا پہلا انڈسٹریل ہوم قائم کیا گیا تاکہ ضرورت مند خواتین کے لیے ہنر کے ساتھ روزگار کا بندوبست بھی ہو سکے۔ روشن نسرین صاحبہ کے ذمے مالیات اور یہاں کے دیگر تنظیمی اُمور تھے جن کے لیے مردانہ نظم سے بھی مشاورت اور رابطہ رکھا جاتا۔ یہ رابطہ پردے کے پیچھے سے ہوتا۔ بہترین انتظامی انداز میں اس انڈسٹریل ہوم کو چلایا گیا اور بے شمار لڑکیاں یہاں سے ہنر سیکھ کر فارغ ہوئیں۔

خدمتِ خلق کا جذبہ:

ایک ساتھی بہن نے بتایا کہ ''۱۹۷۳ء میں نو ابشاہ سے ہم کراچی منتقل ہوئے۔ بیروزگاری کے باعث پریشان تھے رکن جماعت اسلامی بیگم برکاتی نے بیگم قاضی سے متعارف کروایا۔ وہ مڈل ایسٹ بھیجنے کے لیے کپڑے تیار کرواتی تھیں انہوں نے مجھے بھی آرڈر دیا کہ ہر تیسرے دن آ کر کپڑے تیار کر کے دے جایا کروں۔ میری مشین کی رفتار کم ہونے کے سبب کام بہت سست

روی سے جاری تھا یہ مسئلہ میں نے بیگم برکاتی کے سامنے رکھا ایک روز وہ میرے ساتھ لیاقت آباد مارکیٹ گئیں جہاں سے میں بس میں گھر جاتی تھی وہاں سے انہوں نے ایک عدد سلائی مشین خریدی اور جب رکشہ روک کر مجھے دیر ہونے کا کہہ کر اس میں بٹھایا ساتھ ہی مشین بھی رکھوادی تو معلوم ہوا کہ یہ مشین میرے لیے تھی۔ تکرار و اصرار کا سلسلہ کافی دیر جاری رہا لیکن وہ نہ مانیں صرف یہ بتایا کہ آپ کے لیے کسی صاحبہ نے یہ مشین دلوائی ہے لیکن نام بتانے سے منع کیا ہے۔ میرا سلائی کا کام اب بہتر طریقے سے ہونے لگا۔ حالات بدلنے لگے یہ مشین ابھی تک میرا ساتھ دے رہی ہے۔ بالآخر روشن آپا کے انتقال پر مجھے اپنے اس محسن کا نام معلوم ہوا کہ وہ محسن دراصل روشن آپا تھیں جنہوں نے میری خاموشی سے مدد کر کے مشکل حالات میں میرا ساتھ دیا"۔

مسز محمد رفیق غوری جو اُن کے برابر والے گھر میں رہائش پذیر تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ محلے کی خواتین ان کی گرویدہ تھیں لوگوں کے دکھ درد میں شریک رہتیں خدمت کے معاملات میں پیش پیش رہتیں۔ اپنے گھر کام کرنے والی ماسیوں سے بھی ان کا رویہ مثالی تھا۔ اکثر دوپہر کے کھانے کی تیاری کے ساتھ اُن کے لیے بھی کھانے کا اہتمام کرتیں اور خود روٹی ڈالتیں۔ ضرورت مند خواتین کی امداد ایسے کرتیں کہ وہ خود بھی بعض دفعہ بے خبر ہوتیں اُن کی بیماری کے دوران بھی دور دراز مقامات سے خواتین امداد کے لیے آتیں اور دُعائیں دے کر جاتیں۔

بیماری میں صبر:

آخری چند سال شدید بیماری میں گزارے لیکن کبھی کلمۂ ناشکری زبان سے ادا نہ ہوا۔ بیماری کے متعلق بات کرنے والوں کی توجہ شکر کے پہلو کی جانب مبذول کرواتیں بار بار نماز کی نیت باندھتیں اسپتال میں داخل تھیں تو تنفس تنگ ہونے کے باعث چہرہ کھلا ہوا تھا جس سے سخت بے چین تھیں اور ہمراہ موجود بہو سے سوال کرتیں کہ ''تم کو پردہ کرنا اچھا لگتا ہے'' یہ کہہ کر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے جو ان کی اس کیفیت کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ اصل تکلیف کس بات سے محسوس کر رہی ہیں۔

سفرِ آخرت:

وہ لوگوں کے دلوں میں دین کی خدمت کا درد جگانے آئی تھیں اور محض ۵۰ برس کی عمر میں اپنا فرض ادا کر کے اپنے پیچھے صدقۂ جاریہ باقیات الصالحات کی صورت میں چھوڑ کر رب اعلیٰ سے ملاقات کے لیے اُس کے حضور حاضر ہو گئیں ان کے انتقال پر ہر عمر کی خواتین موجود تھیں جو گوہر اشک لُٹا رہی تھیں گھر کا کوئی کونہ خالی نہیں تھا۔ سسکیوں اور آہوں کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بہت سوں کی مربی بہن آج رُخصت ہو رہی تھیں چند نفوس کے ساتھ کراچی میں جماعت اسلامی خواتین کے کام کا آغاز کرنے والی روشن نسرین کا گھر ایک بڑی اجتماعیت کا منظر پیش کر رہا تھا پھولوں کے گلدستے نے باغ کی صورت اختیار کر لی تھی جس میں اُن کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پودے آج اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔۔۔!

ماخذات

۱۔ غزالہ عزیز صاحبہ۔ بیٹی
۲۔ معز زفاطمہ صاحبہ۔ بہو
۳۔ مومنہ خاتون صاحبہ۔ رکن جماعت اسلامی
۴۔ عطیہ نثار صاحبہ۔ ناظمہ صوبہ سندھ

&

بدرالنساء (اُمِ اکبر)

۱۹۳۱ء تا ۲۰۱۳ء

)

4

ایک ایسے ادارہ کا نظام چلانا آسان بات نہ تھی جہاں آنے والی خواتین کے مسائل سے نمٹنے کے لیے کبھی دارالامان، کبھی تھانے اور کبھی جیل سے بھی رابطہ کرنا پڑتا۔ جہاں عورتیں تحفظ کی تلاش میں آتی تھیں اور بعض مرتبہ انہیں اپنوں ہی سے جان وعزت کا خطرہ بھی ہوتا تھا۔

آنے والی کتنی ہی غریب، پسماندہ، میلی کچیلی ہی کیوں نہ ہو "امِ اکبر" خالہ جان اسے بھی ماتھا چوم کر دعائیں دیتیں۔ خود کہتی تھیں کہ "کوئی کتنا ہی گندا یا غریب ہو محبت سب کی ضرورت ہے"۔ ادارہ میں پہنچنے والی وہ سب سے پہلی فرد ہوتیں۔ تاخیر سے آنے کو سخت ناپسند کرتی تھیں۔ گوشۂ عافیت کو وہ اللہ کا گھر کہتی تھیں اور ہر ممکن کوشش کرتی تھیں کہ یہاں کوئی بات ایسی نہ ہو جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہو۔

4

دسمبر ۱۹۷۱ء کے المناک روز و شب میں ایک خاتون مستقل آیت الکرسی کو وردِ زبان بنائے ہوئے تھیں۔ ہر بار آیت الکرسی پڑھ کر دائیں بائیں، آگے پیچھے پھونکیں مار کر اپنے ملک کی چاروں سمتوں کے لیے اللہ کی امان کی دعائیں کرتیں۔ ڈھاکا سے آنے والی خبروں سے ان کی بے کلی میں مزید اضافہ ہوجاتا اور ذکرِ الٰہی کے ورد کی شدت مزید بڑھ جاتی۔ ایسے میں ۱۶ دسمبر کا سورج سقوطِ مشرقی پاکستان کی خبر لایا تو اس باوقار خاتون کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا رواں ہوگیا۔ ''ہم لوگ صحیح نہیں ہیں ہم لوگ صحیح نہیں ہیں۔ صحیح ہوتے تو اللہ ہمیں یہ دن نہیں دکھاتا۔ قرآن سے شغف رکھنے والی اس خاتون نے معاملہ کا قرآن کی روشنی میں تجزیہ کیا اور اس تجزیہ نے کچھ کر گزرنے کی پیاس کو جنم دیا۔ بڑے بھائی نے طلب کو دیکھ کر مولانا مودودی کی چند کتب مطالعہ کے لیے دیں۔ ان کتب کا مطالعہ کرنا تھا کہ گویا دلِ بے قرار کو قرار آ گیا۔ سمتِ سفر روشن ہوگئی۔ دل و دماغ کی یکسوئی سے یہ فیصلہ کر ڈالا کہ اب اسی راہ میں جینا اور جدوجہد کرنا زندگی کا نصب العین ہوگا۔ اس کے بعد چالیس سال سے زائد کا عرصہ اسی عہدِ وفا کو نبھانے میں گزار دیا اور عورتوں میں چاند کی طرح چمکنے والی ''بدرالنساء'' کو جماعت اسلامی نے جس محاذ پر بھی کھڑا کر دیا تو انہوں نے اپنے اخلاص، محنت اور محبت سے اسے چاند کی طرح چمکا دیا۔ بدرالنساء کا اسم بامسمّٰی رکھنے والی یہ خاتون ''اُم اکبر'' کے نام سے جانی اور پہچانی گئیں اور اکابرین کی مانند ہی زندگی گزار کر رب کے حضور پیش ہوگئیں۔ اُم اکبر خالہ جان جماعت اسلامی کی بنیاد کی اینٹوں میں سے ایک اینٹ تھیں جنہوں نے اپنے استحکام سے اوپر تلے رکھی جانے والی کتنی ہی اینٹوں کو پختگی کے ساتھ سیدھ میں رکھنے کا عمل سرانجام دیا۔

ابتدائی تعارف:

۱۹۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہونے والی بدرالنساء صاحبہ اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد اور لاڈلی بیٹی تھیں۔ آپ قیام پاکستان کے وقت آٹھویں کلاس میں زیرِ تعلیم تھیں۔ پورا گھرانہ مسلم لیگی اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں شریک تھا۔ محلّہ کی چار گلیاں مسلم آبادی پر مشتمل تھیں جبکہ باقی آبادی ہندوؤں کی تھی۔ خود بتاتی ہیں کہ ''روزانہ شام میں مرد محلّہ کی حفاظت

کے لیے باہر چلے جاتے تھے اور ہم گھر کا سامان باندھنے میں لگ جاتے تھے کہ ہجرت کے وقت ساتھ لے جاسکیں، یہ الگ بات ہے کہ جب ہمیں نکلنا پڑا تو کچھ بھی ساتھ نہ لے جاسکے۔ میں اپنی بڑی بہن کے ساتھ مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کرتی اور انتظامی کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ جس دن پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو حالات کی سنگینی کے باوجود ہم خواتین مل کر قائداعظم کو مبارکباد دینے ان کے گھر پہنچے جہاں فاطمہ جناح بھی موجود تھیں۔ مسلم لیگی خواتین کی صدر مسز ملک نے ان کے گلے میں ہار ڈالے اور ہم مبارکباد دے کر واپس آ گئے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں میرے بڑے بھائی مجھے اپنے ہمراہ Fury نامی چھوٹے جہاز میں لاہور لے آئے۔ چند دن کیمپ میں رہنے کے بعد ہمیں ماڈل ٹاؤن میں ایک گھر الاٹ ہوگیا جس کے بعد بقیہ گھر والے بھی دہلی سے لاہور پہنچ گئے۔ ۱۹۴۷ء میں شادی ہوگئی جس کے بعد سب گھر والے کراچی منتقل ہوگئے۔ بعد میں بڑے بھائی ہم لوگوں کو بھی کراچی لے آئے اور ہم پہلے سولجر بازار اور پھر لیاقت آباد میں مقیم ہوگئے''۔

اللہ نے آپ کو چار بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نوازا۔ تین بیٹیاں حلقہ خواتین کی رکن اور ایک بیٹا و بیٹی اکنا کے ارکان میں شامل ہیں۔ اس سے اگلی نسل میں دو نواسیاں رکن اور ایک نواسہ اور دو نواسیاں امیدوار رکنیت ہیں۔ الحمدللہ تمام گھرانہ تحریک سے وابستہ ہے۔

خاندانی محاذ کی مجاہدہ:

شوہر رشتہ دار اور تعلیم یافتہ تھے۔ رہائش مشترکہ خاندانی نظام میں تھی۔ ان کی بیٹی حمیرا جاوید بتاتی ہیں کہ ''چار کمروں کے چھوٹے مکان میں ہم چھ بہن بھائیوں، والدین کے علاوہ ابّا جی کے ماموں، ممانی، ہمارے دادا، دادی، پھپھو اور ایک چچا کے شادی ہونے کے بعد دوسرے چچا ساتھ رہتے تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ ''جس جا مان ترسے، اس جا بھوبھل برسے''۔ جہاں رشتوں کو توقعات کے مطابق نبھایا نہیں جاتا، وہاں دھول اُڑنے لگتی ہے اور گھر ویران ہوجاتے ہیں۔ رشتوں کی یہی قدردانی انہوں نے اپنے بچوں میں بھی اِس طرح منتقل کی کہ گھر میں اتنے افراد کے ہوتے ہوئے وہ اپنی شادی شدہ پھوپھیوں کو بلانے کی ضد کرتے اور انھیں اپنے ساتھ قیام کرنے پر اصرار کرتے۔ ساری زندگی رحم کے اور سسرال

کے رشتوں کو بے حد اہمیت دی۔

نظم وضبط، سلیقہ، وقت کی پابندی اور حیاداری ان کی گھٹی میں پڑی صفات تھیں۔ سلیقہ اس درجہ کا تھا کہ اگر بستر کی چادر ٹیڑھی ہو تو انھیں نیند نہ آتی تھی جب تک کہ اسے درست نہ کر لیں۔ اسی سلیقہ کے سبب سسرال والے انھیں ''تمیز بھابی'' کہہ کر بلاتے تھے۔ گھر داری کے ہر کام سے بخوبی واقف تھیں اور ابتدائی عمر سے ہی اپنی بیٹیوں کو تمام کام سکھائے خواہ اس کے لیے انھیں سختی اختیار کرنی پڑی۔ بچّوں کی معیاری تعلیم ان کی ترجیحات میں اوّلین حیثیت رکھتی تھی۔ بیٹی حمیرا کا مزید کہنا ہے کہ ''مشکل معاشی حالات، زیادہ بچے اور مشترکہ خاندانی نظام کے باوجود تمام بچوں کی اعلیٰ تعلیم اور گھروں کی کامیاب معاشرت اس بات کا ثبوت ہے کہ امّی کو اللہ نے بچّوں کی تربیت میں خاص توفیق عطا کی تھی۔ وہ ہمہ وقت ہماری تربیت کی اس ذمہ داری کا احساس رکھتی تھیں''۔

اپنے بچوں کے اسکول کالج سے آنے کے بعد وہ تفصیل سے اِن کی پوری روداد سنتی تھیں اور باتوں باتوں میں اصلاح پر توجہ دلاتی تھیں۔ زبان پر آجانے والے کسی نامناسب لفظ پر بھی سرزنش کی جاتی اور اسے ترک کرنے کی تاکید کی جاتی۔ بچوں کا وقت ضائع کرنا انھیں بالکل پسند نہ تھا اور وہ مختلف کاموں کو اپنے بچوں میں تقسیم کر کے سختی سے پورا کرواتیں۔ ان کی بیٹی صبیحہ شاہد کہتی ہیں کہ ''ہوش سنبھالنے کے بعد سے آخر دم تک ان کا سراپا حیا، جدوجہد اور پاکیزہ لگن سے گندھا نظر آتا ہے۔ تحریک میں آنے سے قبل بھی اور اس کے بعد بھی۔ اللہ نے ظاہری خوبصورتی سے بھی جی بھر کے نوازا تھا۔ زندگی کے مختلف مراحل میں اور حالات کے نشیب وفراز میں ان کا صبر، شکر اور قناعت کا رویہ ہمارے لیے مثال، معیار اور رہنمائی کا بہترین سبب بنا۔ ان کے عمل سے سمجھا گیا کہ زندگی پر کس کس کا اور کتنا حق ہے۔ چھوٹے سے گھر میں سب بہن بھائیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے ساتھ دادا جی، دو دادیاں، پھپھو جانی، پھپھو امی اور چچا کا بھی اس طرح ساتھ رہنا کہ کبھی تنگی، مشکل اور الجھن کا گزر نہ ہو، ہم نے امی سے سیکھا۔ پورے گھر کی صفائی ستھرائی اور صحن کی دھلائی ایک ایسا معمول تھا جو گھر کے وجود کو سنوراتی رہتی تھی۔ الماریوں کی درستی، برتنوں کی چمک، کیاریوں کی مہک، سہ پہر میں محلے کی بچیوں کا قرآن پڑھنے کے

لیے جمع ہونا، ہم سب کا ان کے ساتھ مصروف ہونا اور تلاوت کی بلند ہوتی ہوئی آوازوں میں ایک ایسا سحر تھا جو آج بھی مسحور رکھتا ہے''۔

بیٹی زیبا جمال بتاتی ہیں کہ ''جب سے ہم نے ہوش سنبھالا اپنی امّی کو نماز فجر کے بعد بہت ہی پیاری لے میں سورۃ یٰسین پڑھتے سنا۔ شروع سے ہی آپ بچوں کو سپارہ پڑھایا کرتیں اور بچّوں کے ساتھ ان کی ماؤں سے بھی رابطہ رکھتیں اور ان کے ذاتی وخاندانی معاملات میں ان کی رہنمائی کرتیں۔ چھٹیوں میں بچّوں کی تفریح وتربیت کے لیے خصوصی پروگرام رکھتیں۔ گرمیوں کی تعطیلات میں امّی ہمارے مشورے سے ہمارا ٹائم ٹیبل بنواتیں۔ ہمیں چھٹیوں کی اس لیے خوشی ہوتی تھی کہ اس میں امّی ہمارے ساتھ کھیلوں میں شریک ہوتی تھیں۔ اپنے نوتعمیر شدہ مکان کے اوپر صحن میں امّی کے کہنے پر ہم بچے بجری سے اپنے اپنے گھروں کا نقشہ بناتے اور امّی کسی کے گھر میں ٹہنیاں توڑ کر آم اور امرود کے درخت لگاتیں اور کسی کے گھر میں بہت سارے پھول لگا دیتیں۔ استعمال شدہ کاپیوں کے اوراق کو کاٹ کر نوٹوں کی شکل دی جاتی اور اس کے ذریعہ ہمیں آمد وخرچ کا سارا حساب سکھاتیں۔ ہم سب بہن بھائیوں نے حروف تہجی، گنتی، نظمیں، پہاڑے، کلمے، دعائیں امّی سے اس وقت سیکھیں جب وہ کچن میں روٹی ہانڈی بنا رہی ہوتیں اور ساتھ ساتھ ہمیں یہ سب چیزیں یاد کراتی جاتیں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں سوئٹر بننے کے لیے اون لاتیں اور تمام محلے والوں اور رشتہ داروں کو فوجیوں کے لیے سوئیٹر بننے پر اُبھارتیں۔ امّی ہمارے دلوں میں پاکستان اور جہاد کی محبت جگاتیں اور ہم سب بچے فوجیوں کے لیے تحائف کے پیکٹ بناتے''۔

تحریکی سفر کی ابتدا:

حیاداری، صلہ رحمی اور منضبط زندگی گزارنے والی بدرالنساء صاحبہ کو جب جماعت اسلامی کی دعوت سے آشنائی حاصل ہوئی تو شخصیت کی دلآویزی کچھ اور بڑھ گئی۔ مقصد زندگی کی معرفت نے جدوجہد کی واضح سمت متعین کر دی۔ خدا خوفی اور اقامت دین کے جذبے نے دل میں گھر کر لیا اور غلبہ حق کی جدوجہد میں واضح کردار اختیار کرنے کا پختہ عزم اور اس پر عمل شروع کر دیا۔

دعوت کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔ شوہر علی گڑھ سے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اپنی روایات کے پس منظر میں عورتوں کے گھر سے نکلنے کے حامی نہ تھے، بلکہ انتہائی ضرورت کے علاوہ نکلنے کے عمل کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ یہ ناپسندیدگی ایک کڑی آزمائش کی حیثیت رکھتی تھی۔ فرض کی پُکار اور شوہر کی ناراضی کے مابین خلیج کو اپنی محبت، خدمت، حکمت اور استقامت سے پُر کرنے کی مستقل اور بھرپور کوشش جاری رکھی۔ سفر کبھی آہستہ اور کبھی تیز ہو جاتا لیکن کبھی رُکا نہیں۔ اپنی اولاد کے ساتھ مل کر لٹریچر پڑھا کرتیں۔ بیٹیوں کو اپنے ساتھ لے کر اجتماع میں جایا کرتیں۔ پڑھنے اور علم حاصل کرنے کی لگن اتنی بڑھی کہ چند ماہ میں تحریک کا تمام لٹریچر پڑھ ڈالا۔

ایک انٹرویو میں اس دور کی ابتدائی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ''اس وقت پورے کراچی کا اجتماع کارکنان ایک جگہ ہوتا تھا جس میں ۶۵۔۶۰ کارکنان ہوتے تھے۔ میں کارکن بننے کے بعد جلد ہی حلقہ کی ناظمہ بنا دی گئی۔ صبح دس بجے میں گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر اپنی نائب نوشابہ نیر کے ساتھ ملاقاتوں کے لیے نکل جاتی تھی۔ ایک بجے تک گھر واپس آ کر پھر گھر والوں کو کھانا وغیرہ دے کر شام میں اجتماعات میں شرکت کے لیے نکل جاتی تھی۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ لیاقت آباد میں کوئی ایسی جگہ باقی نہ رہے جہاں درس نہ ہوتا ہو۔ صبح ہم علاقے میں موجود اسکولز میں بھی جاتے اور وہاں کی پرنسپلز سے اسکولوں میں درس کے لیے بھی اجازت لیتے۔ جہاں اجازت مل جاتی وہاں اساتذہ اور طالبات کے لیے درس رکھتے۔ رپورٹ سسٹم کا آغاز بھی میرے سامنے ہوا۔ میں بطور ناظمہ کارکنان سے زبانی رپورٹ لے کر اس کی دو کاپیاں کرتی۔ ایک پر تبصرہ لکھ کر ان کے حوالے کرتی اور دوسری کی مدد سے حلقہ کی رپورٹ تیار کرتی۔ حلقہ کی نظامت کے بعد مختلف ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے کراچی کی نائب ناظمہ مقرر کر دی گئی''۔

میڈیا کا محاذ:

حلقہ خواتین نے مرکزی سطح پر جب اپنی پہلی شوریٰ تشکیل دی تو اس میں اُم اکبر صاحبہ بھی منتخب قرار پائیں۔ آپا اُم زبیر جب قیمہ حلقہ خواتین بنیں تو انھوں نے اُمِ اکبر صاحبہ کو نشر و

اشاعت کی مرکزی نگراں مقرر کیا۔ اس ذمہ داری نے انہیں لرزا کر رکھ دیا۔ آپ اپنی کم تعلیم اور گھریلو نامساعد حالات کے باعث اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل نہیں سمجھتی تھیں۔ رو کر کہا کہ میں مڈل پاس عورت اس کام کی اہل نہیں۔ میں کیا کروں گی؟ نظم سے معذرت چاہی لیکن معذرت قبول نہ ہونے پر رب سے بے تحاشا دعائیں کیں کہ مولا جب یہ ذمہ داری دی ہے تو اس کا حق ادا کرنے والا بھی بنا دے۔ شوریٰ کے اختتام پر وہیں بیٹھ کر ناظمات وشوریٰ کے نام ابتدائی خط تحریر کیا اور وہاں موجود تمام افراد کو دیتے ہوئے ہدایت کی کہ مقام پر جا کر نشر و اشاعت کی ذمہ داری کے لیے ان سے میرا رابطہ کرا دیں۔ بعد میں شہروں کے دوروں کے دوران جا کر بھی افراد منتخب کیے (اس کام کے لیے)۔ یہ اس دور کی بات ہے جب فوٹو کاپی کی سہولت بھی عام نہ تھی۔ وہ کاربن پیپر رکھ رکھ کر سرکلرز کی کاپیاں تیار کرتیں اور شہروں کو ارسال کرتی تھیں۔ کام کی جزئیات تک سکھانے کی لگن میں بعض سرکلرز تو سات سات آٹھ آٹھ صفحات پر مشتمل ہو جاتے جو ان کی اَن تھک محنت کی غمازی کرتے۔

چونکہ یہ ان کے لیے ایک نیا میدان تھا لہٰذا انھوں نے خود اس میدان میں کام کرنا سیکھا۔ ان کی بلند نظری جلد ہی آپ کو کام کے وسیع میدانوں میں لے گئی۔ ہر تحریر دردمندانہ سوچ، گہرے تفکر اور اصلاح کی تڑپ سے مزین نظر آئی۔ نواز شریف صاحب کے پہلی مرتبہ وزیراعظم بننے پر قومی اسمبلی کے تین سو سے زائد اراکین اسمبلی کے نام خطوط ارسال کیے جس میں انھیں اسلامی نظام کے نفاذ کے وعدے یاد دلاتے ہوئے اپنے فرائض کی ادائیگی کی جانب متوجہ کیا اور خواتین کے مسائل سے آگاہ کرتے ہوئے ان کے حل کرنے پر توجہ دلائی۔ مختلف مواقع پر سات مرتبہ ارکان اسمبلی کو خطوط ارسال کیے۔ انہوں نے عورتوں کی نمائندگی کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے مختلف سطحوں پر مشاورت کے بعد سفارشات تیار کیں، جس کے مطابق خواتین کی نمائندگی کے لیے ایک ایسا فورم بنایا جائے جہاں تمام شعبہ ہائے حیات کی خواتین کی نمائندگی ہو، اس فورم میں علماء کرام بھی موجود ہوں۔ مقامی حالات کے ساتھ ساتھ آپ کی نظریں عالمی حالات وواقعات پر بھی مبذول رہتی تھیں اور جن عنوانات پر آپ نے ضرورت محسوس کی، ان پر اقوام متحدہ کے نام خطوط وٹیلیگرام بھی ارسال کیے۔ اپنے کام

میں حتی الامکان گھر والوں کو بھی شریک رکھنے کی کوشش کرتیں یہاں تک کہ خط لکھنے اور فوٹو کاپی کرانے کے بعد اپنی ساس کے حوالے کر دیتیں جو شوق سے انہیں لفافوں میں رکھ رکھ کر لفافے بند کرتی جاتیں۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ خود مختلف مضامین اور کہانیاں اخبارات میں اشاعت کے لیے بھجواتیں تاکہ عمل کی تاثیر سے ان کے قول میں بھی تاثیر پیدا ہو جائے اور اس کام کے دیگر ذمہ داران بھی تحریری جہاد پر کمربستہ ہو جائیں۔ یہ وہ دور تھا جب نشر و اشاعت اور حریم ادب مشترک ہی کام کر رہے تھے۔ بعد میں آگے جا کر انھیں الگ الگ کیا گیا۔ بچّوں کی تربیت آپ کی دلچسپی کا خاص موضوع تھا جس پر ان کے تحریر کردہ مضامین قسط وار ''جسارت'' میں شائع ہوتے رہے جن سے بہت سی ماؤں نے فیض حاصل کیا۔

ناظمہ کی گواہی:

سابقہ قیمّہ عائشہ منور صاحبہ تحریر کرتی ہیں کہ'' کچھ عرصہ میں ہی مجھے ان کی پرعزم شخصیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ مشکل سے مشکل کام کو انتہائی مستعدی سے کر گزرنے والیوں میں سے تھیں۔ میں نے انھیں اجتماع ارکان سے لے کر مختلف شوراؤں میں دیکھا ہے۔ ان کا وژن بہت بلند تھا اور ان کے مشورے ان کی بلند نظری کے عکاس ہوتے تھے۔ بعض اوقات وہ اتنا اونچا ہدف پیش کرتی تھیں جو اس وقت کے وسائل میں پورا ہونا بہت مشکل ہوتا تھا۔ دیے ہوئے کام سے پیچھے ہٹنا یا کام کو مشکل یا ناممکن جاننا اور اس سے پہلوتہی کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ وہ ہر کام پر لبیک کہنے والوں میں سے تھیں اور ساتھ ساتھ کام کے دوران پیش آنے والے مسائل کو بھی حل کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں۔ کام کے اہداف اور طریقہ کار پر مستقل غور و فکر کرتے ہوئے ہر بات تحریر کر کے پیش کرتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر اقبال کا وہ شعر یاد آ جاتا تھا کہ:

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

ان کی شخصیت کا ایک قابل قدر پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اجتماعی مزاج رکھتی تھیں۔ اپنے ساتھ

چلنے والوں کو بھی کام کی پوری سمجھ دینے کے بعد ٹیم ورک کے ساتھ کام کرتی تھیں۔ جماعتی نظام میں سمع و اطاعت کی اہمیت کا انھیں پورا ادراک تھا۔ اپنے تمام مشوروں کو شوریٰ میں رکھتیں اور وہاں ہونے والے منصوبوں پر مکمل عملدرآمد کرتیں۔ اپنے تمام کاموں سے نظم کو ضرور آگاہ رکھتیں اور اپنے ذہن میں آنے والے خیالات پر مشاورت کے بعد عمل پیرا ہوتیں۔

ان اجتماعی مصروفیات کے ساتھ ساتھ شخصی روابط بھی بہت اچھی طرح نبھاتی تھیں۔ زندگی کے آخری سالوں میں جب وہ خواتین شیلٹر ہوم کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھیں، مجھے ایک دن فون کر کے کہنے لگیں، ''عائشہ میں نے تمہارے لیے ایک سوٹ بنایا ہے مگر مجھ سے وعدہ کرو کہ تم یہ سوٹ ضرور پہنو گی اور کسی اور کو نہیں دو گی''۔ میں نے کہا آپا میرے پاس بہت کپڑے ہیں۔ آپ یہ پریشانی نہ اُٹھائیں لیکن وہ اپنی بات پر مُصر رہیں۔ پھر اُنہوں نے مجھے بڑا خوبصورت سوٹ بھجوایا جو میں نے قدردانی کے جذبے سے بار بار استعمال بھی کیا اور ان کی محبت سے آج بھی آنکھیں نمی محسوس کرتی ہیں۔ تحریک کے لیے ان کی خدمات بے شمار ہیں اور آخری وقت تک وہ اپنے عمل سے تحریک کو فیضیاب کرتی رہیں''۔

بہترین ناظمہ و بہترین کارکن:

تمام تر وسعت نظر اور مستعدی سے کام کرنے کے باوجود ان کے ذہن میں اس ذمہ داری کے لیے اپنے سے اہل فرد کی تلاش کا کام جاری رہتا۔ جونہی انھوں نے ایسے افراد کو جو اس شعبہ کے تعلیم یافتہ اور تجربہ کار تھے، تحریک میں رکنیت کے معیار تک آتے دیکھا تو خود ہی قیمّہ حلقہ خواتین کو اپنی جگہ اس ذمہ داری پر انھیں لانے کی تجویز دی اور خود ٹیم کا حصہ بن کر ممکنہ حد تک تعاون کی یقین دہانی کروائی۔ قیمّہ حلقہ خواتین عائشہ منور صاحبہ کے دور میں مرکزی نشر و اشاعت کی ذمہ داری حمیرا قریشی صاحبہ کے سپرد کر دی گئی اور اُم اکبر خالہ جان ان کی ٹیم کا حصہ بنا دی گئیں۔ حمیرا قریشی بتاتی ہیں کہ'' خالہ جان ناظمہ نشر و اشاعت تھیں تو نظامت کے بہترین اوصاف سے ہمیں مستفید کیا اور جب نظم کے فیصلہ سے میں اس ذمہ داری پر آئی تو وہ بہترین معاون بن گئیں۔ وہ ہر ٹیم ممبر سے بڑھ کر تعاون اور عملی مدد فراہم کرتیں۔ ایک دفعہ انھوں نے ایک اہم موضوع پر مجھے لکھنے کی تجویز دی۔ اگلی میٹنگ میں گاڑی میں ساتھ جاتے

ہوئے انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ تجویز شدہ موضوع پر تم نے لکھا؟ میری جانب سے نفی میں جواب پا کر اپنے ہاتھ میں موجود اخبار کو رول کر کے مجھے دو تین دفعہ مارا اور کہا ''آئندہ کہو گی کہ نہیں لکھا؟'' گاڑی میں موجود باقی لوگ ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے اور میں کہہ رہی تھی کہ اب نہیں کہوں گی۔ کام کے لیے ان کی حساسیت اعلیٰ درجے کی تھی۔ غصہ ہو جاتیں تو پھر فوراً ہی پیار کر کے منا لیتیں۔

پُرعزم و تیز دم:

ایک وقت تھا جب جماعت کے اندر سے ایک گروہ تحریک اسلامی کے نام سے الگ ہو رہا تھا اور تحریکی افراد تذبذب و انتشار کا شکار تھے۔ ایسے وقت میں جب کچھ بزرگوں نے اس سارے قضیے میں گوشہ نشینی اور لاتعلقی کی حکمت عملی اختیار کی تو خالہ جان اُم اکبر نے اپنا ایک واضح اور سوچا سمجھا کردار متعین کیا۔ انھوں نے ہی تجویز دی کہ ارکان کُل پاکستان دورے کر کے کام کو منظّم کریں۔ افراد کے ذہنوں کو سلجھائیں اور کرنے کے کام پر توجہ دلاتے ہوئے انھیں اپنی قوتیں ضائع کرنے سے بچائیں۔ ساتھ ہی ساتھ دستور کا فہم بھی ڈسکشن کے ذریعہ عام کریں۔ انھوں نے دستور کا شق وار ڈسکشن شروع کروایا اور ان کی تجویز کو قبول کرتے ہوئے تمام شہروں کے دورے رکھ کر انھیں اگلے کام کے اہداف دیے گئے جس سے تحریک کے استحکام میں مدد ملی۔

ٹیم میں اکثر لوگ ان کے مقابلہ میں نوعمر تھے لیکن انھوں نے کبھی ان سے فاصلہ محسوس نہیں کیا۔ وہ اُن میں گھلی ملی رہتیں اور اپنے مشوروں سے انھیں سنوارنے کی کوشش کرتی رہتیں۔ ہر ایک کی بے حد حوصلہ افزائی کرتیں۔ کسی کی بھی کوئی اچھی تقریر، اچھی تحریر، اچھی سوچ قدر افزائی کے بغیر نہ رہتی۔ نوعمر ساتھیوں کی کامیابیوں پر وہ اس طرح خوش ہوتیں جیسے کوئی مالی اپنی لگائی ہوئی پنیری کو بڑھتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

بہترین مربّی:

سابقہ نگراں نشر و اشاعت افشاں نوید صاحبہ تحریر کرتی ہیں کہ میرا ان سے تعلق ۱۹۹۰ء کی دہائی میں نشر و اشاعت کی مرکزی ٹیم میں شمولیت کے بعد شروع ہوا۔ وہ اقبال کے الفاظ میں

''دیدہ ور'' تھیں جو ہر آن کام کی نئی نئی جہتیں دریافت کرتیں اور ان پر عمل کے لیے کوشاں ہو جاتیں۔ کہیں شادی میں گئیں ہمیں بتایا فلاں فلاں بیمار ہے اس سے جا کر ملنا ہے۔ فلاں کے حالات تنگ ہیں اس کی مدد کرنی ہے۔ فلاں فرد فارغ ہے اسے کسی کام میں لگانا ہے۔ ''بڑی کھوجی ہیں آپ خالہ جان''۔ کبھی جو میں نے ان سے کہا تو جواب پایا۔ ''بیٹا جی! مومن کی بصیرت ہی اس کا سرمایہ ہے۔''

ایک بات ان کا خاصہ تھی کہ وہ غلطی پر ٹوکتے ہوئے جھجکتی نہیں تھیں۔ آپس کے باہمی مذاق میں بھی وہ ہمارے الفاظ کے استعمال میں چوکنا رہتیں اور سمجھاتیں کہ فلاں لفظ کے غلط معنی نکل سکتے ہیں اس کی جگہ یہ جملہ یوں بولا کرو۔ جب وہ ''بیٹا جی'' کہہ کر پاس آتی تھیں تو کان کھڑے ہو جاتے تھے کہ ضرور ہم سے کوئی ایسی غلطی ہوگئی ہے جس کی سرزنش مطلوب ہے۔ کبھی ان کے قریب جاؤ تو وہ کچھ بولتی نہیں تھیں بس متوجہ ہو کر گہری نظروں سے دیکھتی تھیں۔ لگتا تھا اب کچھ بولیں گی لیکن وہ مسکرا کر نظریں ہٹا لیا کرتی تھیں۔

خوئے دلنوازی ان کی شخصیت کا امتیازی وصف تھا۔ محبتوں کے سمندر تھے ان کے پاس جن سے وہ فیض بانٹتی رہتی تھیں۔ ان کا ہر ایک سے تعلق ہوتا تھا۔ سراپا الفت و محبت تھیں۔ ان کی صحبت میں کوئی کبھی بور نہ ہوتا تھا۔ ان کی صحبت سے کبھی دل نہیں بھرتا تھا۔ ایک مرتبہ بہت دن بعد ملیں میرے چہرے پہ دانے دیکھ کر کہا۔ تمہاری جلد حساس لگتی ہے۔ تمھیں جرسی کا نہیں کاٹن کا اسکارف استعمال کرنا چاہیے۔ میں نے کہا۔ اب کون بنوائے گا؟ چھوڑیں خالہ جان۔ بولیں، خالہ جان زندہ ہیں نا۔ اور چند دنوں بعد ان کا ڈرائیور کاٹن کا ایک اسکارف دے گیا۔ شکریے کے فون پر بولیں کہ ''خود بازار جا کر کپڑا لا کر سلوا کر دیا ہے اب استعمال ضرور کرنا''۔ ایسی کتنی ہی یادیں بے شمار احباب کے دلوں میں زندہ ہوں گی۔

ان کی لاہور منتقلی کے وقت ان کے اعزاز میں دی جانے والی الوداعی تقریب میں، میں ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ساتھی ان سے ملتے وقت مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پا رہے تھے اور وہ سب کو تسلی دے رہی تھیں کہ یہاں ملنے بچھڑنے کا کیا غم۔ میرا یقین ہے کہ ہم سب ابدی جنتوں میں اکھٹے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ خالہ جان اپنے اعمال کو دیکھتے ہوئے یہ یقین کیسے

ہو؟ تو کہا۔ بیٹا جی، میرا تو ایمان ہے کہ وہ غفور ورحیم ہے، ہمارے کاموں کو قبول کرلے گا۔ ہمیں تو وہ ماؤں سے ستّر گنا زیادہ پیار کرتا ہے۔ اپنے اعمال پر تھوڑی اس کی رحمت پر بھروسا ہے میں نے تو اسی یقین سے پوری زندگی گزاری ہے کہ جب اس کی رحمتوں نے پوری زندگی سایہ کیے رکھا تو وہ حشر میں بھی بے سایہ نہ چھوڑے گا۔''

ان کے رہائشی حلقہ کی قرآنی کلاس کی شاگردہ طاہرہ کامران صاحبہ بھی ان کی تربیت کے انداز کے بارے میں بتاتی ہیں کہ جب بھی انھیں دیکھا مسکراتا ہوا پایا۔ وہ ہمہ وقت لوگوں کو خصوصاً خواتین اور بچّیوں کو قرآن سے جوڑنے میں مصروف رہتی تھیں۔ ہر مسئلے کو ٹھنڈے دل اور توجہ سے سنتیں اور قرآن وحدیث سے اس کا حل بتاتیں۔ ترجمہ قرآن پڑھانے کے لیے ہر وقت تیار رہتیں۔ درسِ قرآن اس سوز کے ساتھ دیتیں کہ سننے والیاں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ کچھ کر گزرنے کا عزم لے کر ہی گھروں کو لوٹتیں''۔

دیہی علاقہ جات میں کام:

جب ورکنگ ویمن میں کام کا آغاز کیا گیا تو ابتدا ہی سے دیہی ہنر مند خواتین کو بھی اس کے اہداف میں شامل کیا گیا۔ تحریک نے اُم اکبر خالہ جان کو اس محاذ پر کھڑا کر دیا۔ شعبہ کے مقاصد میں تھا کہ دیہی ہنر مند خواتین کو مانگنے کی عادت سے بچا کر ان کے ہنر کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کے کام کی قدر دانی کی جائے اور جائز اُجرت ادا کی جائے اور اس رابطے کے ذریعے انہیں اپنی دعوت سے بھی آشنا کیا جائے۔ اندرون سندھ موجود بے انتہا غربت، معاشی بدحالی اور جہالت کے باعث یہ کام آسان نہ تھا۔ بے تحاشا گندگی تھی۔ لوگ طہارت کے تصور سے بھی ناواقف تھے۔ ایسے میں دین پھیلانے کا جذبہ لیے اُم اکبر صاحبہ اس کٹھن ذمہ داری پر بھی پورا اُترنے کے لیے کھڑی ہوگئیں۔ سکھر ریلوے اسٹیشن سے علی الصبح دریائے سندھ کے گدلے پانیوں کی روانی کے ساتھ تارکول کی پکی سڑک پر دوڑتی گاڑی بیگم جتوئی صاحبہ اور عائشہ ظہیر صاحبہ کے گھروں پر پہنچتی۔ دورانِ سفر کی اگلی منزلوں، بڑا گھمرو، چھوٹا گھمرو، خیر پور، شکار پور، لاڑکانہ اور کئی گوٹھوں کی منصوبہ بندی مکمل کر لی جاتی۔ گوٹھ میں پہنچنے کے بعد جب تمام خواتین جمع ہو جاتیں تو اللہ اور بندوں کے درمیان تعلق اور اس کے تقاضوں کو

ان کی ذہنی سطح کے مطابق بیان کرتیں، کلمہ، کلمہ کے تقاضے، زندگی کا مقصد، زندگی گزارنے کے آداب، نماز، حیا اور ایسے ہی بنیادی موضوعات پر گفتگو کرتیں۔ اپنی محبت سے ان خواتین کو اتنا گرویدہ کر لیتیں کہ وہ آپا جان، خالہ جان کہتے نہ تھکتیں اور اپنے گھریلو مسائل بھی بلا جھجک بیان کر کے رہنمائی چاہتیں۔ چند ماہ کی محنت کے بعد ماحول میں خُدا شناسی اور خُود آگاہی کی گہری چمک نظر آئی۔

ان کے اس وقت کے سفر کی ایک ساتھی فریحہ اشرف صاحبہ ان یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں کہ ''وہ وقت میرے ذہن کے کینوس پر کسی ہیرے کی طرح جگمگا رہا ہے کہ اجنبی بولیوں اور مختلف رہن سہن رکھنے والی ہر عمر کی خواتین اور بچّیاں ایک گھر کے وسیع صحن میں جمع ہیں اور ہم سب چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ بجلی کا نام ونشان نہیں۔ تاروں کی چھاؤں میں یہ محفل جمی ہوئی ہے۔ لالٹین کی محدود روشنی میں ''بدر النساء'' واقعی عورتوں کا چاند معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ تذکیری گفتگو کے بعد دعا کروا رہی تھیں۔ آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ خواتین گواہی دے رہی تھیں کہ اب تک ہم جہالت کے اندھیروں میں گُم تھے آپ نے ہمیں ایمان سے آشنا کیا ہے۔ اُم اکبر خالہ جان ہمیں بار بار توجہ دلاتیں کہ اللہ ہی نے ہمیں ان لوگوں سے ملوایا ہے اب ہمیں ان کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ ایک سال کے دوران ان دوروں کے نتائج اس طرح سے سامنے آئے کہ پہلے لوگوں کو پہنچنے کے بعد ہم اطلاع دے دے کر بلاتے تھے اب ہمارے آنے کی اطلاع پا کر خواتین اور بچّیاں اپنے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر دور سے آتی ہماری گاڑی کا استقبال کرتیں۔ خالہ جان بڑے صبر اور حوصلے سے بے شمار خواتین سے گلے ملتیں اور ان کی خیریت دریافت کرتیں۔ شور وغُل سے جھنجھلانے کے بجائے وہ سب سے مل کر جلد ہی مجمع کو خاموش کراتیں اور اپنی بات بیان کرنا شروع کر دیتیں۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب اُنھوں نے ابتدائی کلمات کہنے کے بعد اعلان کیا کہ اب فریحہ آپ کو آپ کے حقوق وفرائض کے بارے میں تفصیلات بتائیں گی تو میں اُن کی بتائی ہوئی باتوں کو دہرانے کے علاوہ کچھ نہ بول سکی اور دوبارہ انھیں ہی بولنا پڑا۔ میں دل میں ڈر رہی تھی کہ اب خالہ جان سے ڈانٹ پڑے گی لیکن انھوں نے واپسی کے سفر کے دوران تنہائی میں مجھے

پیارا اور سرزنش دونوں طرح سمجھایا کہ پروگرام کیسے کیا جاتا ہے۔

ان کے ساتھ نومبر کی سخت سردی کے دوران کیے جانے والے سفر کی واپسی کی وہ رات بھی یاد آتی ہے جب سکھر سے واپسی پر ٹکٹوں کے مسائل کے سبب ہم سب کو مناسب جگہ نہ مل سکی تو اُنھوں نے چار ساتھیوں کو تو فرسٹ کلاس والے حصّے میں نشستوں پر بٹھا دیا اور خود میرے ساتھ باتھ روم کے آگے رکھی ایک بڑی سی گٹھڑی پر بیٹھ گئیں۔ مجھے تسلّی دیتی رہیں کہ ''تم سو جاؤ۔ میں جاگ رہی ہوں۔'' اسی دوران خودان کی آنکھ لگ گئی۔ اس گٹھڑی کے قریب ایک سوراخ تھا جہاں سے آنے والی یخ بستہ ہوا سے ہڈیوں تک میں کپکپاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ میں بار بار اپنا ہاتھ رکھ کر اس سوراخ کو بند کرنے کی کوشش کرتی۔ اسی دوران خالہ جان کی آنکھ کُھل گئی تو وہ میری اس تنہا کوشش کو دیکھ کر ناراض ہوئیں کہ مجھے بتایا کیوں نہیں؟ پھر میرے ساتھ مل کر اس سوراخ میں کچھ کپڑا ٹھونس کر اسے بند کر دیا۔ اور ساتھیوں کو راحت پہنچانے کی خاطر خود صبح تک اسی جگہ بیٹھی رہیں''۔

گوشۂ عافیت کا محاذ:

بے سہارا اور مستحق خواتین کی رہائش کے لیے قائم کیا جانے والا یہ ادارہ اپنے اہداف اور مسائل کے حوالے سے ایک نیا چیلنج تھا جو پیرانہ سالی میں خالہ جان کے سامنے آیا تھا۔ اطاعت نظم کے جذبہ سے سرشار اُم اکبر خالہ جان نے بسر و چشم اس ذمہ داری کو بھی قبول کر لیا۔ اس کام میں بیگم جہاں آراء مظفر ان کی معاون بنائی گئیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ''ان کے پاس جمال بھی تھا اور جلال بھی۔ پہلی میٹنگ کے بعد ہی ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اور ادارے کے لیے مکان کی تلاش، تعمیر، تزئین، انتظام، وسائل کی تلاش کے سبب کام ساتھ ساتھ انجام دیے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو آپا کہتیں۔ ''اے بی بی۔ میٹنگ بلالو'' اور پھر سب مل کر مسئلے کا حل تلاش کر لیتے۔ پہلے کرائے کے مکانوں میں اس ادارہ کو چلایا جاتا رہا لیکن اس میں بے شمار مسائل کے بعد پھر اپنی عمارت خرید کر اس میں ادارے کو قائم کیا گیا۔ یہاں آپا کو شعبہ تربیت کی نگرانی دی گئی۔ وہ ہر ہفتہ قرآن تفسیر سے پڑھاتی تھیں۔ وہ جہاں ادارے کی ہر بچّی سے خصوصی محبت رکھتی تھیں وہیں لڑکیوں پر کڑی نظر بھی رکھتی تھیں۔ قصّہ کہانی سناتیں مگر اس میں بھی سبق

ضرور دیتیں۔ گوشۂ عافیت سے انھیں ایسی محبت تھی جیسی کسی ماں کو کسی بچّے سے ہوتی ہے اور یہاں کے مکینوں سے جدائی نے آپا کو بہت مغموم کر دیا تھا۔''

ایک ایسے ادارے کا نظام چلانا آسان بات نہ تھی جہاں آنے والی خواتین کے مسائل سے نمٹنے کے لیے کبھی دارالامان، کبھی تھانے اور کبھی جیل سے بھی رابطہ کرنا پڑتا۔ جہاں عورتیں تحفظ کی تلاش میں آتی تھیں اور بعض مرتبہ انھیں اپنوں ہی سے جان و عزت کا خطرہ بھی ہوتا تھا۔ آنے والی کتنی ہی غریب، پسماندہ، بیمار، میلی کچیلی ہی کیوں نہ ہو اُم اکبر خالہ جان اسے بھی ماتھا چوم کر دعائیں دیتیں۔ خود کہتی تھیں کہ ''کوئی کتنا ہی گندا یا غریب ہو محبت سب کی ضرورت ہے۔ محبت ہی سے اعتماد پیدا ہوتا ہے اور محبت ہی سے فرد بات سننے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ روزانہ ادارہ میں پہنچنے والی وہ سب سے پہلی فرد ہوتیں۔ تاخیر سے آنے والے کو سخت ناپسند کرتی تھیں۔ گوشۂ عافیت کو وہ اللہ کا گھر کہتی تھیں اور ہر ممکن کوشش کرتی تھیں کہ یہاں کوئی بات ایسی نہ ہو جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہو۔ کہتی تھیں کہ ''میرا ارمان ہے کہ گوشۂ عافیت میں مخلوقِ خدا کی خدمت انجام دیتے دیتے ہی رب کے حضور پہنچ جاؤں۔ تحریک کی دیگر ساتھیوں کو یہاں آنے اور شکر کا جذبہ سیکھنے کی تلقین کرتی تھیں''۔

محبت فاتح عالم:

تحریک کی مختلف ذمہ داریوں کو نبھانے میں ان کا رابطہ بہت سے تحریکی اور غیر تحریکی خواتین سے رہا اور ہر ایک نے اس بات کی گواہی دی کہ وہ ہم سے محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہنے والے گواہی دیتے ہیں کہ ان کا تعلق بڑا گہرا ہوتا تھا وہ نہ صرف مخاطب کی ذات بلکہ اس کے بچّوں اور ان کے بھی بچّوں کی خیریت دریافت کرتیں۔ ان کی تربیت کے لیے قیمتی مشورے دیتیں۔ دوسروں کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھتیں۔ ان کا حل دیتیں۔ ان کے حل کے لیے دعائیں کرتیں۔

محترمہ ریحانہ افروز ان کے بارے میں اپنے تاثرات تحریر کرتی ہیں کہ ''اپریل ۱۹۹۷ء میں جب مجھے ہیپاٹائٹس کا مرض لاحق ہوا تو خالہ جان اسپتال آتیں اور میرے سرہانے کھڑے ہو کر طویل دعا کرتیں۔ دم کرتیں اور کہتیں۔ میری بیٹی۔ دیکھنا تم کیسے ٹھیک ہو گی، بالکل

تندرست ہوجاؤ گی اور اللہ تم سے بڑے کام لے گا۔ بعد میں جب سٹی گورنمنٹ کا حصّہ بن کر دن رات مختلف ذمہ داریاں نبھانی پڑیں تو مجھے ہمیشہ خالہ جان کی دعا یاد آجاتی۔ جہاز میں ان کے ساتھ سفر کیا تو کہنے لگیں۔ دیکھو بیٹا۔ یہ جہاز بادلوں میں سے گزر رہا ہے۔ نہ جانے کن کن شہروں پر سے گزر رہا ہے۔ ان بادلوں کو گواہ بنالو کہ یہ سفر اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہے۔ چپّہ چپّہ ہماری گواہی دے کہ تحریک نے ہمارے سپرد جو ذمہ داری کی تھی اسے ہم نے پوری جانفشانی کے ساتھ نبھایا۔ ہم جب بھی گھبرا کر وطن عزیز کے حالات اور اُمت کے مستقبل کی بات کرتے تو وہ بہت یقین کے ساتھ کہتیں کہ ''آزمائش تو آگے آئے گی۔ ہم نے راستہ ہی ایسا چُنا ہے۔ پھر کامیابی بھی تو کتنی بڑی ہے۔ فوزِعظیم۔'' قرطبہ میں ہونے والے اجتماع عام میں ناہموار زمین پر سخت سردی میں زمین پر بچھے بستر میں بیماری کے ساتھ لیٹی خالہ جان مجھے پُکار رہی تھیں کہ ادھر آجاؤ۔ میرا کمبل بڑا ہے اور بچّے تمھارے ساتھ ہیں''۔ ایسے ہوتے ہیں وہ لوگ جو گھپ اندھیرے میں بھی جگمگاتے ہیں۔

روبینہ فرید نے ان سے وابستہ یادوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''میرے لیے وہ ماں کی مانند تھیں۔ ان کی محبت میں ہمیشہ ماں کی شفقت محسوس ہوتی تھی۔ وہ ان افراد میں سے تھیں جن کے نزدیک فرد اور اس سے جُڑے تمام رشتے دار اہم ہوتے ہیں۔ وہ جب خیریت پوچھتیں تو اس کا دائرہ میرے ساتھ ساتھ میرے شوہر، بچّوں، ساس اور نندوں تک محیط ہوتا۔ فون بھی کرتیں تو کہتیں۔ بچّوں کو ماتھا چوم کر میرا پیار دینا اور اپنے شوہر کو میری دعائیں کہنا۔ یوں ان کا رشتہ پورے گھرانے سے جُڑ جاتا۔ میرے بچّے ان کے سامنے چھوٹے سے بڑے ہوئے۔ ان کی تربیت کے لیے خالہ جان کے مشورے ساتھ ساتھ رہتے۔ بچّوں کے ہاتھ میں ٹافیاں دیکھ کر کہتیں۔ انھیں اس کا عادی نہ بناؤ۔ ان کی بھوک ختم ہوجائے گی۔ کبھی بچّوں کے ساتھ اجتماعات میں جانے میں اُلجھن کا شکار ہوتی تو حوصلہ بڑھاتیں۔ ''انھیں ساتھ رکھا کرو۔ شروع سے یہ اجتماعیت کا سبق لیں گے تو بڑے ہوکر تمھارا ساتھ دیں گے''۔

پُراُمیدی:

اُم اکبر خالہ جان کا ایک بڑا وصف یہ بھی تھا کہ وہ برے سے برے حالات میں بھی پُراُمید

رہتی تھیں۔ کوئی اپنے انفرادی مسائل کا غم کھائے یا اجتماعی حالات کی خرابی کی بات کرے وہ ہمیشہ آیاتِ قرآنی اور اُسوۂ رسول ﷺ کی مثالیں دے کر ہمت بندھاتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انفرادی مسائل کا شکار بہنوں کے آگے اجتماعی مسائل کی اہمیت کو شدّت سے اجاگر کر کے ذاتی مسائل کو چھوٹا بنا دینے کے ہنر سے بھی واقف تھیں۔ ان کی عدّت کے زمانے میں شعبہ نشر و اشاعت کی ہفتہ وار میٹنگ ان کے گھر پر منعقد ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ گاڑی نہ آنے اور ٹیم کے ارکان کے مختلف ذاتی مسائل کے سبب وہ میٹنگ ملتوی کر دی گئی۔ اگلے ہفتہ جب وہ میٹنگ منعقد ہوئی تو انھوں نے اتنے پُرسوز انداز میں ملکی حالات، بین الاقوامی حالات، جماعت اسلامی کے کام کی اہمیت، وقت اور تنظیم کے تقاضوں کو بیان کیا کہ شرکاءِ نشست کو محسوس ہوا کہ میٹنگ ملتوی کرنا انتہائی سنگین غلطی تھی۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ ''جو اللہ کی چاہت کا مزہ چکھ لے اس کے لیے ہر دوسرا مزہ بے معنی اور ہر مشقت گوارا ہوجاتی ہے''۔

انفاق فی سبیل اللہ:

انفاق فی سبیل اللہ پر بہت زور دیتیں۔ ان کی پوری کوشش ہوتی کہ ہر قسم کی رسید بُک کا آغاز ذاتی انفاق سے کریں۔ تحریک کی ابتدائی زندگی میں وسائل اور اختیارات ہاتھ میں نہ ہونے کی وجہ سے آپ نے ردّی بیچ کر بھی اس عمل کو جاری رکھا۔ ہر ملنے جُلنے والی کو اس کارِخیر میں حصّہ ڈالنے پر آمادہ کرتی رہتیں۔ جب شعبہ ورکنگ ویمن کے تحت دیہی علاقہ جات کی ہنر مند خواتین سے کشیدہ کاری کا کام کروا کے لاتیں تو ہر رابطے میں آنے والے فرد کو ان کے ہنر کی قدردانی کرنے پر اکساتیں تاکہ انھیں اپنی حاجات کے لیے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ ایک دن یومِ خواتین پر آرٹس کونسل میں دیہی خواتین کی تیار کردہ مصنوعات کا اسٹال نمائش میں لگایا گیا جس کا دورہ گورنر سندھ نے بھی کیا۔ تو انھیں بھی ان عورتوں کے ہنر کی ہمت افزائی کرنے پر اس طرح اُبھارا کہ وہ بھی اپنے اہل خانہ کے لیے ملبوسات خرید کر لے گئے۔ گوشۂ عافیت کی ذمہ داری کے دوران وہ ہر خاص و عام کو مستحق و مجبور خواتین کی مدد میں اپنا حصّہ ڈالنے پر آمادہ کرتی رہتیں۔

پُراعتمادی:

ان کی ایک بہت بڑی خوبی ان کا پُراعتماد ہونا تھا۔ اللہ پر توکّل اور دعوت الی اللہ کی کامیابی پر یقین نے انھیں اتنا بااعتماد بنادیا تھا کہ کسی ادارہ کے سربراہ سے ملاقات ہو، ٹی وی اسٹیشن جانا ہو یا کسی وزیر سے ملاقات ہو۔ انھیں اپنی بات کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ پیش نہ آتی تھی۔ وہ کسی بڑی سے بڑی ہستی سے نہ مرعوب ہوتی تھیں اور نہ بُرے سے بُرے حالات میں حوصلہ ہارتی تھیں۔ ۱۹۷۷ء میں جب تحریک نظامِ مصطفیٰؐ کے دوران وہ لیاقت آباد میں رہتی تھیں۔ جہاں صبح شام کرفیو کے دوران آنسوگیس اور فائرنگ معمول کی بات بن گئی تھی۔ ان مشکل حالات میں بھی گلی گلی درسِ قرآن رکھتیں۔ گرفتار اور شہید ہوجانے والوں کے گھروں میں جاکر ان کے اہل خانہ کو تسلّی اور خوشخبری دیتیں اور ان کا حوصلہ بندھاتیں۔

گاڑیوں کے ڈرائیورز بھی توجہ کا حصّہ تھے۔ ایک ڈرائیور کو گھٹیا ڈائجسٹ پڑھتے دیکھا تو اسے مختلف پمفلٹس اور کتب لاکر دیں کہ ''انھیں پڑھا کرو۔ اس سے اچھی باتیں سیکھو گے۔'' ایک ڈرائیور کا نام تھا رسول بخش تو اسے سمجھایا کہ ہر چیز دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔ تم اپنا نام غلام رسول رکھ لو اور پھر اسے اسی نام سے پکارا جانے لگا۔ ڈرائیورز کے آرام اور دلجوئی کا بھی خیال رکھتیں۔

اپنی شخصیت کے جلال سے وہ خود بھی بخوبی آگاہ تھیں۔ ایک دفعہ انھیں ارکان کی تربیت گاہ کی ناظمۂ اجتماع مقرر کیا گیا تو قیمتہ حلقہ خواتین نیر بانو صاحبہ کو خط لکھ کر اپنی سختی کے باعث معذرت کی۔ جواب ملا کہ جب اپنی کمی پتا ہے تو خود اس کو دور بھی کرلیں۔ یہ اجتماع اس کا اچھا ذریعہ بن سکتا ہے۔

حوصلہ مندی:

مختلف تحریکی مراحل سے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ذاتی زندگی میں بھی مختلف حالات وعوامل پیش آتے رہے۔ بچے بڑے ہوئے۔ شادیاں ہوئیں۔ ہر ایک کے الگ حالات۔ کوئی ملک سے باہر چلا گیا۔ کسی کو بیماری نے آلیا۔ شوہر کا انتقال ہوگیا۔ خود انہیں دل کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ انہوں نے ہر غم کو پُروقار انداز میں برداشت کیا اور سکینت کی چادر

اوڑھے رکھی۔ پھر پیرانہ سالی میں شہر تبدیل کرنے کی آزمائش بھی آئی۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کراچی سے لاہور منتقل ہوئیں اور وہاں سے اسلام آباد سکونت اختیار کرلی۔ جاتے ہوئے سب سے کہتیں، میری اطلاع آئے تو مغفرت کی دعا ضرور کرنا۔ چہرے سے ان کے دکھ کا اندازہ ہوتا تھا لیکن زبان سے یہی عزم سننے کو ملتا تھا کہ ''میں وہاں جاکر بچّوں کو قرآن پڑھاؤں گی''۔ قرآن پڑھنا اور پڑھانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ عدّت کے دوران بھی جب خواتین ان سے ملنے آتیں تو وہ چند باتوں کے بعد انہیں قرآن پڑھانے لگتیں۔ ان کی بڑی بہو روبینہ اکبر بتاتی ہیں کہ انہیں جب بھی موقع ملتا وہ بچّوں سے ضرور ان کا قرآن سنتیں اور ہمیں بھی اس کی تاکید کرتیں۔

نیا شہر، نئے عزائم

۲۰۱۱ء میں وہ اسلام آباد کی مٹی کو اپنے حق میں حجت بنانے کے لیے وہاں منتقل ہوگئیں اور جاتے ہی انھوں نے بچّوں کو قرآن پڑھانے کی ابتدا کردی اور اس غرض کے لیے مدرسے کا بورڈ بنوانے کا بھی انتظام کیا۔ پنڈی کے مقامی نظم نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے تجربے کی روشنی میں مقامی قرآن انسٹی ٹیوٹ کی بہتری کے لیے اپنی تجاویز اور رہنمائی سے نوازیں تو وہ بے حد خوش ہوئیں کہ اللہ نے مجھے اس سعادت میں حصّہ ڈالنے کا موقع فراہم کیا۔ اس پر ہر دم اللہ کا شکر کرتیں اور جس دن گاڑی لینے آتی تو چاہے طبیعت کتنی ہی خراب ہو، ضرور جاتیں۔ اگر کبھی کسی پریشانی میں کوئی ان سے کہتا کہ آج اجتماع میں نہ جائیں تو وہ کبھی اس پر راضی نہ ہوتیں بلکہ کہتیں کہ ''اب تو جانا بہت ضروری ہے۔ میں اللہ کا کام کروں گی تو اللہ میرا کام کرے گا''۔

پنڈی میں بھی کراچی کی طرح ''گوشۂ عافیت'' کا ایک ادارہ کھولنے کے لیے نظم نے منصوبہ بندی کی اور رہنمائی کے لیے اُم اکبر خالہ جان سے درخواست کی گئی۔ انہوں نے اس کام میں بھی اپنا حصّہ ڈالنے کی رضامندی ظاہر کی۔ نئی جگہوں پر کام میں حصّہ دار بنتے ہوئے جب پُرانے تعلقات کی یادیں بےتاب کرتیں تو خالہ جان سب کو فون کرکے خیریت دریافت کرتیں اور اپنی دعائیں پہنچاتیں خصوصاً گوشہ عافیت کے مکینوں سے رابطہ برقرار رہتا۔

دمِ واپسیں

یکم ستمبر ۲۰۱۳ء کی شب اپنے امریکا میں مقیم بیٹے سے انٹرنیٹ پر بات چیت کی۔ عشاء کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد باتھ روم سے جا کر واپس آئیں تو پوتے نے ان کے چہرے پر غیر معمولی تاثرات دیکھ کر انھیں پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔ آنکھیں اوپر کچھ دیکھ رہی تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ گھر والے جمع ہو کر پوچھ رہے تھے کہ آپ کو کیا ہوا؟ مگر وہ تو آنے والوں کے ساتھ جا چکی تھیں بس خاکی پنجرہ باقی رہ گیا تھا۔ آسانیاں بانٹنے والی بندی کو رب رحیم نے آسانی کے ساتھ اپنے پاس بُلا لیا۔ قرآنی مدرسہ کا بورڈ بن کر آ چُکا تھا لیکن قرآن پڑھانے کا عزم رکھنے والی بندی قرآن نازل کرنے والے کے حضور پہنچ چُکی تھی۔ تیار کفن الماری میں کپڑوں کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ مرنے کے بعد محض نو جوڑے الماری میں جو روز مرّہ اور تقریبات دونوں کے لیے تھے۔ اور ۳۳ ہزار روپے نقد کہ اگر ضرورت پڑے تو میرے کفن دفن میں استعمال کر لینا، ورنہ جماعت کے بیت المال میں جمع کرا دینا۔ وصیت کی تھی کہ میری تدفین جلدی کر دینا، کسی کے انتظار میں نہ روکنا اگلے دن صبح ہی صبح نماز جنازہ ہونے کے باوجود غمگساروں کی ایک بڑی تعداد اکٹھی ہو چُکی تھی اور یہاں کراچی میں جس نے بھی اس خبر کو سنا دل تھام کر رہ گیا۔ انفرادی و اجتماعی دعاؤں کے کثیر تحفے روانہ کیے گئے۔

صاحبزادی صبیحہ شاہد بیان کرتی ہیں کہ ''امی جی آخری دنوں میں بار بار مستقبل کے بارے میں سوچا ہوا اپنا خواب ہم سے بیان کرتی تھیں کہ ''میں دیکھتی ہوں کہ دور دور تک بہت خوبصورت ایک باغ ہے، اس میں تخت بچھے ہیں، خوبصورت دبیز قالین موجود ہیں۔ اس باغ میں پھل ہی پھل ہیں۔ میرے بچّے اور میری ساتھی بہنیں بھی ارد گرد موجود ہیں اور میں ہاتھ بڑھا کر درختوں سے آم اور پھل توڑ کر کاٹ کاٹ کر انھیں کھلا رہی ہوں۔ ایسا ہوگا تو کتنا مزہ آئے گا!! بس میرے اللہ۔ ہم سب کو جنت میں اکٹھا کر دینا''۔ یہ کہانی دن میں بار بار ہر ایک کو سنائی اور دھرائی جاتی۔ رب رحیم سے دعا ہے کہ ان کی اس دعا کو شرفِ قبولیت بخشے''۔

اپنی زندگی میں دیے گئے ایک انٹرویو میں کارکنان جماعت کو پیغام دیا کہ ''یہ راستہ آسان نہیں ہے۔ اس راستہ میں تو خود نبی کریم ﷺ نے بہت مشکلات اُٹھائی ہیں۔ اس لیے مشکلات

برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا۔ مطالعہ پر توجہ بہت ضروری ہے۔ تحریکی لٹریچر کا مطالعہ کیے بغیر کام کا فہم اور جذبہ حاصل ہونا ممکن نہیں کارکنان کو ہر دوسرے تیسرے ماہ روداد جماعت اسلامی کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ جب تک قرآن کا گہرا مطالعہ نہیں ہوگا تڑپ نہیں ہوگی اور تڑپ کے بغیر رضائے الٰہی حاصل نہیں ہوسکتی۔ جنت کا سودا سستا نہیں ہے۔ اسے پانے کے لیے بڑی محنت کرنا ہوگی۔'' اللہ ہم سب کو اس راستے پر چلنے والا بنا دے۔ آمین!

ماخذات

۱۔ عائشہ منور صاحبہ۔ سابقہ قیمّہ حلقہ خواتین
۲۔ حمیرا قریشی صاحبہ۔ سابقہ نگراں مرکزی شعبہ نشر و اشاعت
۳۔ روبینہ فرید صاحبہ۔ سابقہ نگراں مرکزی شعبہ نشر و اشاعت
۴۔ افشاں نوید صاحبہ۔ سابقہ نگراں مرکزی شعبہ نشر و اشاعت
۵۔ ریحانہ افروز صاحبہ۔ سابقہ سٹی کونسلر
۶۔ فریحہ اشرف صاحبہ۔ ممبر مرکزی شعبہ نشر و اشاعت
۷۔ جہاں آرا مظفر صاحبہ۔ نگراں گوشہ عافیت
۸۔ صبیحہ شاہد صاحبہ۔ بیٹی
۹۔ حمیرا جاوید صاحبہ۔ بیٹی
۱۰۔ زیبا جمال صاحبہ۔ بیٹی
۱۱۔ روبینہ اکبر صاحبہ۔ بہو

&

زبیدہ صلاح الدین

۱۹۳۱ء تا ۲۰۱۳ء

)

4

ہم بچپن سے اپنی امی کے ساتھ ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ ان کے زیر سایہ تربیت پاتے ہوئے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے جوہرآباد کی ناظمہ بنا دیا گیا۔ میں نے خالہ جان کو اپنی مشاورتی ٹیم میں رکھا اور ان سے ہر آن رہنمائی حاصل کی۔ میں ان کی اس بات سے بے حد متاثر ہوئی کہ وہ بچی جس کی تربیت خود انہوں نے کی تھی، جب ناظمہ بنادی گئی تو انہوں نے بالکل اسی طرح اس کی اطاعت کی جیسے نظم کی کرنی چاہیے۔ اور کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ہم سے زیادہ جانتی اور فہم رکھتی ہیں، اور اس لیے صرف انہی کی رائے ماننی چاہیے۔ ایک دفعہ ان کے گھر کی کوئی بات تھی، وہ اسے بھی میرے علم میں لائیں تا کہ مجھے یہ سکھا سکیں کہ ناظمہ کو کارکن کی مکمل آگاہی ہونی چاہیے۔

4

۲۱ فروری ۱۹۹۱ء ادارہ نورحق میں سہ روزہ اجتماع ارکان کا آخری دن تھا۔ امیر جماعت کراچی کی جانب سے اجتماع میں شریک ایک خاتون کو پیغام پہنچایا جاتا ہے کہ ''آپ کے گھر میں ایمرجنسی ہوگئی ہے آپ گھر چلی جائیں''۔ وہ خاتون کہتی ہیں کہ بس اب تھوڑی دیر میں اختتامی دعا ہونے والی ہے اس کے بعد چلی جاؤں گی لیکن دوبارہ پیغام ملتا ہے کہ آپ ابھی چلی جائیں۔ وہ خاتون اجتماع گاہ سے باہر آتی ہیں تو گاڑی میں اپنی بیٹی اور داماد کو بیٹھے ہوئے پاتی ہیں جو انھیں بتاتے ہیں کہ ''سعد کو گولی لگ گئی ہے آپ چلیں''۔ وہ خاتون بھی گاڑی میں بیٹھ جاتی ہیں لیکن جب گاڑی کو اسپتال کے بجائے گھر کی جانب رواں دیکھتی ہیں تو پوچھتی ہیں کہ تم اسپتال کیوں نہیں لے جارہے؟'' اس پر بیٹی جواب دیتی ہے کہ ''امی ۔۔ سعد کے سر میں گولی لگی ہے''۔ اس جملے سے وہ خاتون اس حقیقت کو پاجاتی ہیں کہ اللہ نے ان کے بیٹے کو شہادت کے تمغے سے نواز دیا ہے۔ اس وقت وہ خاتون اپنے رب کے حضور دعا گو ہوجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ''یا اللہ جب تو نے مجھے اس آزمائش میں ڈالا ہے تو مجھے صبر جمیل بھی عطا فرمانا، میں دل سے اس بلند مرتبے کو قبول کروں اور میری آنکھیں آنسو نہ بہائیں''۔ رب نے ان کی اس دعا کو قبول کیا کہ لوگ سعد کی شہادت کی خبر سن کر روتے ہوئے آتے تھے۔ خواتین ان کے گلے لگ کر روتی تھیں اور وہ انہیں تسلی دے کر چپ کراتی تھیں اور پھر زمانے نے یہ منظر بھی دیکھا کہ جوان بیٹے کی لاش کفن میں لپٹی گھر میں رکھی ہے اور اس کی ماں صبر وشکر کی فضیلت پر درس دے رہی ہے اور راہ عزیمت کی دشوار گزار گھاٹیوں کا تذکرہ کر رہی ہے اور درس کے اختتام پر شرکا سے کہتی ہے آپ سب شکرانے کے نفل پڑھ کر دعا کریں کہ ''اللہ ان شہادتوں کو قبول فرمائے اور ہمیں اپنی راہ میں استقامت نصیب فرمائے۔''

چٹانوں کی مانند حوصلہ رکھنے والی یہ خاتون اور یہ عظیم ماں زبیدہ صلاح الدین تھیں اور شہید ہونے والا ان کا سب سے چھوٹا بیٹا سعد بن صلاح تھا جسے گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی میں ایک لسانی تنظیم (ایم کیو ایم) نے گولی کا نشانہ بنایا تھا۔

وہ بڑے فخر سے اپنے بیٹے کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے بتاتی تھیں کہ ''اس شہید کی

قربانی سے آج اس کالج میں جمعیت کا راج ہے۔ اس نے مجھے ذہنی طور پر اپنی شہادت کے لیے تیار کیا ہوا تھا۔ ایک دن کالج سے آکر بتانے لگا کہ ''امی آج میرے شہید ہونے میں ذرا سی کسر رہ گئی۔ گولی میرے کان کے قریب سے گزر گئی اور میں نے اس کی ہوا تک کو محسوس کیا''۔ جب وہ شہید ہوا تو اس سے قبل اس کے راولپنڈی کے ایک ساتھی کو گولی ماری گئی۔ سعد نے بقیہ افراد کو مطلع کرنے کے لیے زور سے نعرۂ تکبیر لگایا جس کی آواز دور دور تک گونجی۔ ابھی اس کے بلند کیے ہوئے ہاتھ نیچے بھی نہ آپائے تھے کہ اس کے سر میں گولی ماردی گئی اور اسی وقت اس کی روح اپنے رب کے پاس چلی گئی اور وہ سینہ جو نعرہ لگاتے ہوئے چوڑا ہوگیا تھا، واپس اپنی اصلی حالت میں بھی نہ آسکا۔ اس کی میت گھر آنے کے بعد میں رات بھر اس کے سرہانے بیٹھی قرآن پاک پڑھتی رہی۔ جب بھی میں اس کی طرف دیکھتی تو ایسا لگتا جیسے شہید مسکرا رہا ہو''۔

مثالی صبر:

سابقہ قیمہ عائشہ منور صاحبہ بیان کرتی ہیں کہ ''جب ہم اس اطلاع پر اجتماع گاہ سے ان کے گھر پہنچے تو گھر کے باہر شامیانہ لگ چکا تھا۔ خواتین چلی آرہی تھیں۔ زبیدہ آپا کو گاڑی سے اتار کر تخت پر بٹھا دیا گیا تھا اور میں اس بات پر آج تک حیران ہوں کہ ان کی آنکھوں میں ایک آنسو نہ تھا، وہ مستقل شکر ادا کیے جارہی تھیں۔ حالانکہ میری نگاہوں میں بار بار سعد کی شبیہ گھومتی تھی، جب ہم ان کے گھر جاتے تھے تو اکثر دروازہ وہی کھولتا تھا۔ وہ بہت صحت مند اور خوبصورت بچہ تھا اور سب سے چھوٹا ہونے کے باعث یقیناً ان کا چہیتا بھی ہوگا لیکن ان کا صبر مثالی تھا''۔

ابتدائی تعارف:

آپ نے ۱۹۳۱ء میں وسطی ہندوستان کے شہر اندور میں آنکھ کھولی۔ آپ کے چار بھائی اور ایک بہن تھیں۔ آپ کا خاندان آزادی کے بعد ہجرت کرکے پاکستان آگیا۔ ۱۹۵۱ء میں آپ کی شادی ہوگئی۔ اللہ نے آپ کو چار بیٹیوں اور تین بیٹوں سے نوازا۔ آپ کے شوہر صلاح

الدین صاحب جو آپ کے پھوپھی زاد تھے، جماعت اسلامی سے وابستگی رکھتے تھے اور رسالہ ''ترجمان القرآن'' کے پرانے قاری تھے۔ ۱۹۷۰ء میں قومی انتخابات ہوئے تو نظم نے انھیں الیکشن کیمپ کا انچارج بنا دیا۔ شوہر کی وساطت سے آپ بھی جماعت اسلامی خواتین کی سرگرمیوں میں شریک ہوتی تھیں۔ کام میں آسانی کے لیے خواتین نظم نے آپ کو الیکشن میں خواتین کیمپ کا ذمہ دار بنایا۔ آپ نے انتہائی مستعدی اور محنت سے اس ذمہ داری کو انجام دیا جبکہ ابھی سعد بن صلاح چند ماہ کا تھا بڑی بہنیں اسے لے کر کیمپ میں جاتیں اور دودھ پلوا کر واپس لے آتیں اور آپ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں مصروف رہتیں۔ اس ذمہ داری کے بعد آپ کراچی جماعت کی بنیادی اینٹوں میں شامل ہوگئیں اور ہر ذمہ داری کو انتھک محنت، لگن اور جذبے سے سرانجام دیتی رہیں۔

حصول علم کی لگن:

آپ کے اندر قرآن سے محبت کا انتہائی جذبہ موجود تھا۔ ابھی آپ جماعت اسلامی میں پوری طرح شامل نہیں ہوئی تھیں لیکن حصول علم کے لیے سرگرداں تھیں۔ ایسے میں جب انھیں ناظم آباد میں واقع اپنی نند کے ہاں قرآن کے لفظی ترجمے کی کلاس کے شروع ہونے کا علم ہوا تو انھوں نے اس میں شرکت کا عزم کر لیا۔ دستگیر سے ناظم آباد کے لیے دو بسیں بدلنا پڑتی تھیں اور اسٹاپ سے گھر تک پیدل مسافت بھی اچھی خاصی تھی لیکن ان کے شوق نے ہر رکاوٹ کو عبور کر لیا۔ ہر ہفتہ وہ کسی بچے کو ساتھ لے کر اس سفر پر روانہ ہو جاتیں۔ سعد کی ولادت کے موقع پر آپ کی طبیعت اتنی خراب ہوگئی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ آپ نے اس موقع پر اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ آپ نے مجھے زندگی دی تو اس باقی زندگی کو میں آپ کی راہ میں ہی خرچ کروں گی۔ اللہ تعالی نے آپ کو صحت عطا کی تو آپ نے اپنے رب سے کیے گئے اس وعدے کو زندگی کی آخری سانس تک نبھایا۔

مدرسہ کا قیام:

قرآن سیکھنے کے بعد آپ نے اپنی استانی کی اجازت سے اپنے گھر میں مدرسہ قائم

کر لیا۔ صبح نو بجے سے شام تک قرآن کا یہ مدرسہ کھلا رہتا۔ خواتین اپنی سہولت سے آتیں اور قرآن پڑھتیں۔ ناظرہ قرآن پڑھنے والے بچے بھی آتے۔ آپ کو جو فرد بھی جس عمر کا بھی ملتا اسے قرآن ترجمے سے پڑھنے کی تلقین کرتیں۔ اپنی بچیوں، ان کی سہیلیوں اور ان کی ماؤں کو قرآن پڑھایا۔ گھر کی ماسیوں اور ان کی بچیوں کو قرآن پڑھایا۔ گرمیوں کی تعطیلات سے قبل قریبی اسکولوں میں جا کر اسمبلی میں پرنسپل کی اجازت سے اعلان کروا دیتی تھیں کہ یہ میرے گھر کا پتا ہے۔ بچے چھٹیوں میں آ کر قرآن ترجمے سے پڑھیں۔ اکثر بچوں کو اس عرصے میں تیسواں پارہ یاد کروا دیا کرتیں۔ اس ضمن میں ان کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ کہتی تھیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ گھر کے دروازے پر کھڑی ہو جاؤں اور ہر ایک سے کہوں کہ ''لوگوں قرآن کی طرف آؤ''۔

گھریلو مجاہدہ:

آپ کی بیٹی نجیبہ نذیر بتاتی ہیں کہ امی گھر کا سارا کام بغیر ماسیوں کی مدد کے کرتیں، چاہے وہ کپڑے سینا ہو، کھانا پکانا یا برتن و کپڑے دھونا۔ ہمارے والد آفس جاتے ہوئے دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر جاتے تھے، فرج کی سہولت بھی نہیں تھی، اس لیے آٹا گوندھنے سے لے کر سبزی، دال سالن جو بھی بنانا ہو صبح ہی کرنا ہوتا تھا۔ والد صاحب صبح آفس جانے سے پہلے نہانے کے بعد سر میں تیل امی سے ڈلواتے تھے اور امی اپنے مخصوص مالش کے سے انداز میں یہ کام ضرور کرتیں، چاہے انھیں روٹی پکاتے پکاتے اٹھ کر ہاتھ دھو کر یہ کام کرنا پڑے۔ سلیقہ امی پہ ختم تھا۔ ہاتھ میں بے حد ذائقہ تھا جو پکاتیں بے حد لذیذ ہوتا۔ والد کو آٹھ بجے آفس بھیجنے کے ساتھ ساتھ ہم بچوں کی اسکول کی تیاری اور ناشتہ بھی چل رہا ہوتا۔ ہمارے جانے کے بعد امی دوپہر کی روٹی اسی وقت پکا لیا کرتی تھیں اور ساتھ چھوٹے سعد کے لیے میٹھی ٹکیہ بھی بنا کر رکھ لیتیں۔ اس کے بعد بقیہ کام برتن دھونا، گھر کی صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر نو ساڑھے نو بجے تک فارغ ہو جاتیں پھر اس وقت سے مستقل قرآن ترجمے سے پڑھنے والوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ چھوٹا سعد وہیں امی کے پاس بیٹھا کھیلتا رہتا اور وہ اسے میٹھی ٹکیہ توڑ توڑ کر کھلاتی رہتیں۔ یہ سلسلہ ہم

لوگوں کے اسکول سے آنے تک چلتا رہتا۔ ہم آجاتے تو سب کو دوپہر کا کھانا کھلا کر ظہر کی نماز کے بعد مختلف کلاسز لینے یا ملاقاتوں کے لیے چلی جاتیں۔ بلا مبالغہ میلوں چلتیں اور خالی ہاتھ نہیں ساتھ میں کتابوں کے وزنی تھیلے بھی ہوتے۔ تقریباً عصر کے وقت امی کی واپسی ہوتی تو شام کے کھانے کی تیاری، بچوں کو ہوم ورک کروانا جیسے بے شمار کام ان کے منتظر ہوتے۔ پانی اس زمانے میں رات کو گھروں میں آتا تھا تو رات کو جاگ کر کپڑے دھوتیں۔ ہم نے ان کو کبھی آرام کرتے نہیں دیکھا۔ انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ تھکن کس چیز کا نام ہے۔ ایک ساتھ دو دو تین تین کام کر لیتیں۔ گھر میں خوب پودے بھی رکھے ہوئے تھے اور پودوں کی صفائی، گدرائی اور ایک پودے سے کئی پودے بنانے کا ہنر جانتی تھیں۔

بچوں کی تربیت:

آپ نے اسکول کی چند کلاسز کانوینٹ سے پڑھی تھیں اس کے بعد اس زمانے کا ادیب کا امتحان جو گیارہ سالہ تعلیم کے بعد ہوتا تھا، پاس کیا تھا، اس لیے اردو اور انگریزی دونوں ہی اچھی تھیں۔ اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ خاندان بھر کے بچوں کو پڑھاتیں۔ اپنے بچوں کی تعلیم کے بارے میں متفکر رہتیں اور اسکول جا کر پرنسپل سے ان کی کارکردگی دریافت کرتی رہتیں۔

ان کی بیٹی بتاتی ہیں کہ وہ غیر محسوس طریقے سے اپنے بچوں کی تربیت کرتی تھیں۔ ہمارے بچپن میں انھوں نے ''نو باتوں کا حکم'' والی حدیث ایک بڑے پوسٹر پر بہت نمایاں جگہ لگا رکھی تھی۔ ہم سب نے خود ہی دیکھ دیکھ کر اسے یاد کر لیا۔ سعد نے جب بولنا شروع کیا تو اسے یہ حدیث یاد کروائی۔ جب کوئی مہمان آتا تو وہ امی کے کہنے پر یہ حدیث سناتا اس طرح بچے کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ سب کی یاددہانی بھی ہو جاتی۔

اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ہماری خواہشات کا بھی خیال رکھتیں اور ہمارے لیے کبھی بیسنی روٹی، کبھی بیسن کا حلوہ، کبھی آلو پوری بناتیں لیکن ساتھ ہی انھوں نے ہماری ایسی تربیت کی تھی کہ جو بھی دسترخوان پر ہو، وہ چاہے پسند ہو یا نہ ہو، بغیر اعتراض کے اسے کھائیں اور اللہ کا شکر ادا کریں۔ ہم چھوٹے تھے تو دو دو بچوں کو ایک ایک پلیٹ میں کھانا دیتیں تاکہ

آپس میں محبت پیدا ہو۔

خاندان بھر کے بچوں سے ان کی دوستی تھی۔ سب کے مشاغل ان کے علم میں ہوتے اور ان سے متعلق وہ ان سے گفتگو کرتیں اور رہنمائی دیتیں۔ اپنی نواسی کو جومیڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے، مخلوط نظام تعلیم میں تعلیم حاصل کرنے کے آداب سکھائے۔ لڑکوں سے جمعیت کے کام کے پھیلاؤ پر بات کرتیں۔ جمعیت کے بچوں کے لیے ان کے دل میں خصوصی محبت تھی۔ آخر عمر میں بھی بیٹیاں اپنے بچوں کے ساتھ ان کے پاس جمع ہوتیں تو وہ علم تجوید سے آشنا نواسی کو پاس بٹھاتیں اور کہتیں چلو میں قرآن سناتی ہوں، جہاں غلطی ہو مجھے بتاؤ۔

چار بیٹیاں تھیں جن کی تعلیم و تربیت کا بھرپور خیال رکھا اور کبھی کوئی ایسا تاثر نہیں دیا جس سے وہ اپنے آپ کو بوجھ تصور کریں۔ خوشدلی سے ان کے سارے فرائض نبھائے۔

خاندان سے معاملات:

وہ محبت کا ایسا شجر سایہ دار تھیں جس کی چھاؤں اپنے غیر چھوٹے بڑے سب کے لیے تھی۔ اپنے میکے اور سسرالی دونوں طرح کے رشتہ داروں سے یکساں محبت کا سلوک کرتی تھیں۔ سسرال میں سب سے بڑی تھیں۔ صرف رشتے میں نہیں بلکہ تعلقات اور معاملات میں بھی، سب کو بہت خوش اسلوبی سے نبھایا۔ ہر سال عید بقرعید پر سب کی دعوت لازمی تھی۔ ان کی پرخلوص محبت تھی جو سب کو ان کے پاس کھینچ کر لاتی تھی۔ یہ سلسلہ پینتیس سال ان کی وفات کے وقت تک جاری رہا۔ خاندان کی شادیوں کے موقع پر وہ تفہیم القرآن کا سیٹ تحفہ میں دیتیں خواہ گھرانہ دیندار ہو یا دنیادار۔ خاندانی معاملات میں عیب جوئی انہیں سخت ناپسند تھی، دوسروں کو بھی اس سے منع کرتی تھیں۔

مہمانداری:

مہمان نواز وہ سدا کی تھیں، چاہے ہاتھ میں بہت محدود وسائل ہوں خواہ بچوں کی ضروریات کو پس پشت ڈالنا پڑے وہ مہمان نوازی میں کمی نہ آنے دیتی تھیں نہ تحفوں کے لین دین میں۔ لیکن ان سب میں سادگی ہمیشہ نمایاں رہتی۔ عین کھانے کے وقت بھی اگر کوئی آجاتا

وہ خاندان کا کوئی فرد ہو یا کوئی ضرورت مند، تو اسے کھانا ضرور کھلاتیں خواہ دستر خوان سے اٹھ کر ہی دوبارہ اس کا انتظام کرنا پڑے۔

نصب العین سے محبت:

وہ ہمہ وقت داعی الی اللہ تھیں۔ فرد اور وقت کی تخصیص کیے بغیر ان کا کام ہر آن جاری رہا کرتا تھا۔ اس ضمن میں قرآن پڑھانے کے علاوہ جس کام کو وہ خصوصیت سے سرانجام دیا کرتی تھیں وہ تقسیم لٹریچر کا کام تھا۔ ان کے شوہر انھیں گھر کے خرچ کے لیے جو پیسے انھیں دیتے وہ اس میں سے گھر کا راشن خریدنے کے بعد بقیہ پیسوں سے کتابیں خرید لاتیں۔ پھر ہر جگہ وہ ان کتب کو پھیلاتیں۔ لوگ کتابیں خریدتے تو جو پیسے واپس آتے ان سے گھر کا خرچ چلتا رہتا۔ انھوں نے اس بات کی کبھی پروا نہیں کی کہ اگر کتابیں نہ بکیں اور پیسے پھنس گئے تو کیا ہوگا؟ ان کا ایمان بڑا مضبوط تھا اور وہ اللہ کی راہ میں تجارت پر پختہ یقین رکھتی تھیں۔

مختلف اسکولز سے رابطہ کر کے وہ وہاں وقتاً فوقتاً بک اسٹالز لگایا کرتی تھیں جس میں ٹیچرز اور بچوں دونوں کے لیے بہترین اصلاحی اور تفریحی کتب رکھی جاتیں جنھیں بڑے اور بچے شوق سے خریدتے۔ بچوں میں رسالہ ''نور'' بھی کثرت سے تقسیم کیا کرتی تھیں۔

تحریک نے انھیں جس ذمہ داری پر کھڑا کر دیا وہ اس کو نبھانے میں مصروف ہوگئیں۔ ایک عرصے تک نائب ناظمہ کراچی کی ذمہ داری بھی انجام دیتی رہیں۔ جب بلدیاتی الیکشن میں کھڑا کیا گیا تو کونسلر شپ کی ذمہ داری قبول کی۔ جب الخدمت کی ذمہ داری دی گئی تو اس کو نبھانے میں لگ گئیں۔ ان کا تحریک سے تعلق محض جذباتی نہیں شعوری تھا۔ انھوں نے ہمیشہ رخصت کی بجائے عزیمت کی راہ اختیار کی۔

ایک دفعہ کمر کے مہروں میں شدید تکلیف تھی جس کے باعث بیٹھنے سے قاصر تھیں۔ اس حالت میں مرکزی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے خط آیا تو آپ نے اسی حالت میں لاہور تک کا ٹرین کا سفر کیا اور پورے اجلاس میں لیٹ کر شرکت کی۔

مالی تنگی کے وقت بھی تحریک کے لیے آپ کا ایثار بے مثل تھا۔ ''جسارت'' کی ترویج کے

لیے اپنی چوڑیاں بیچ دیں۔ الخدمت کے کاموں میں ضرورت ہوتی تو اچار، مربے وغیرہ بنا کر فروخت کرتیں۔

فرض کی پکار۔ اولین ترجیح:

اُن کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آئے جو ان کی ممتا کے لیے سخت امتحان تھے لیکن آپ ثابت قدمی سے ان امتحانوں سے گزر گئیں۔ سعد کی شہادت سے قبل بڑے بیٹے کا شدید ایکسیڈنٹ ہوا جس میں دونوں رانوں اور پنڈلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ تین سال اس کے اسپتالوں میں گزر گئے۔ جس دن اس کی ٹانگ کا آپریشن ہونا تھا اُن کے سپرد کوئی بہت اہم ذمہ داری لگائی گئی تھی۔ انہوں نے بیٹے کے آپریشن کے دوران جا کر اس ڈیوٹی کو انجام دیا۔ اللہ نے اس جذبے کی اس طرح قدردانی کی کہ بیٹے کا آپریشن انتہائی کامیاب رہا۔

جس وقت وہ پہلی مرتبہ نانی بننے والی تھیں بلدیاتی انتخابات ہو رہے تھے اور آپ کو اپنی ذمہ داری ادا کرنی تھی، آپ اپنی نند کو بیٹی کے پاس بٹھا کر وہ ذمہ داری ادا کر کے واپس آئیں لوگ ایسے مواقع پر حیران ہوتے تو کہتیں میں اللہ کا کام کر رہی ہوں اللہ میرے تمام کاموں کے لیے کافی ہو جائے گا۔

کارکنان سے محبت:

تحریکی ساتھیوں سے انھیں بہت محبت تھی۔ کسی کو کوئی تکلیف ہو تو بے چین ہو جاتی تھیں۔ ایک دفعہ تحریکی ساتھی کے گھر میں کئی لوگ بیمار تھے تو ان کے گھر سے میلے کپڑوں کا بہت بڑا بیگ بھر کر لے آئیں کہ میں اپنی بچیوں سے دھلوا دوں گی۔ پھر پورا دن بچیوں کے ساتھ مل کر وہ کپڑے دھوئے۔

ساتھیوں کے بچوں کے لیے ان کے پرس میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ رہتا تھا۔ ناظمہ خواتین سندھ عطیہ نثار صاحبہ اس وقت کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ ''میں درس دے رہی ہوتی تھی اور وہ میرے بچوں کو بہلا رہی ہوتی تھیں۔ ہر بچے کے لیے ان کے پرس میں سے کوئی نہ کوئی دل پسند چیز برآمد ہو جاتی۔ عید کے موقع پر وہ ہمارے بچوں کو عیدی ضرور دیتیں۔ یہاں

تک کہ بچے بھی انھیں اس حوالے سے پہچانتے تھے کہ یہ وہ نانی ہیں جو ہمارے لیے پرس میں کچھ نہ کچھ ضرور رکھتی ہیں‘‘۔ زہرہ افتخار زبیری صاحبہ بیان کرتی ہیں کہ ’’ایک دفعہ میں بہت بیمار ہوگئی تو دل سوزی کے ساتھ میری صحت کی دعا کرتیں۔ ہر ساتھی مجھے بتاتی کہ وہ تمہارے لیے بہت پریشان ہیں، شاید انہی کی دعاؤں کے طفیل اللہ نے مجھے دوبارہ کھڑا کر دیا‘‘۔

ساتھیوں کی خوشی اور غمی میں بھی شرکت کی بھرپور فکر رہتی تھی۔ انتقال سے تین ہفتے پہلے عائشہ منور صاحبہ کے بیٹے کے ولیمہ کا بلاوا آیا تو شرکت کے لیے گئیں اور سیڑھیاں ہونے کے باوجود سہارا لے کر اوپر چلی گئیں اور واپس آ کر انتہائی خوشی سے گھر والوں کو تفصیلات بتاتی رہیں۔

مثالی ناظمہ، مثالی کارکن:

بحیثیت ناظمہ ان کی توجہ نہ صرف فرد کی تعلیم و رہنمائی پر مرکوز ہوتی تھی بلکہ ساتھ ساتھ وہ اس کی تربیت پر بھی رکھتی تھیں۔ ہر ایک سے موثر رابطے اور مضبوط تعلقات بنانا ان کا خاصہ تھا۔ کارکنان کے ساتھ مل کر منصوبے بنائے جاتے، جائزے لیے جاتے اور نئے نئے انداز سے کام کو آگے بڑھانے کے طریقے سوچے جاتے۔ اُن کے لگائے ہوئے پودے جب پروان چڑھے تو حلقے کی نظامتیں سنبھالیں اور وہ ان کی بہترین معاون بن گئیں۔ رکن جماعت ہنیزہ قادر صاحبہ بتاتی ہیں کہ ہم بچپن سے اپنی امی کے ساتھ ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ ان کے زیر سایہ تربیت پاتے ہوئے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے جو ہر آباد کی ناظمہ بنا دیا گیا۔ میں نے خالہ جان کو اپنی مشاورتی ٹیم میں رکھا اور ان سے ہر آن رہنمائی حاصل کی۔ میں ان کی اس بات سے بے حد متاثر ہوئی کہ وہ بچی جس کی تربیت خود انہوں نے کی تھی جب ناظمہ بنا دی گئی تو انہوں نے بالکل اسی طرح اس کی اطاعت کی جیسے نظم کی کرنی چاہیے اور کبھی اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ ہم سے زیادہ جانتی اور فہم رکھتی ہیں۔ اس لیے صرف انہی کی رائے ماننی چاہیے۔ ایک دفعہ ان کے گھر کی کوئی بات تھی تو وہ اسے بھی میرے علم میں لائیں تاکہ مجھے یہ سکھا سکیں کہ ناظمہ کو کارکن کی مکمل آگاہی ہونی چاہیے۔

کونسلرشپ:

۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۷ء تک بلدیہ کراچی میں کونسلر شپ کے فرائض انجام دیتی رہیں۔ جماعت اسلامی کی خواتین ممبران تعلیم وصحت کی کمیٹیوں میں شامل تھیں۔ وہ تعلیمی کمیٹی کی ممبر تھیں اور اس ذمہ داری کی تحت اپنی حدود میں آنے والے تمام اسکولز کا باقاعدگی سے دورہ کیا کرتیں۔ اسکولز کے مسائل کا جائزہ لے کر ان کے حل کے لیے کاروائی انجام دیتیں۔ اساتذہ سے تعلقات قائم کرتیں۔ اسمبلی کے وقت اسکول پہنچ جانے سے اسٹاف بھی بروقت آنے لگا۔ اسمبلی میں بچوں کی تربیت کے لیے ہلکا پھلکا پروگرام رکھا جاتا جس کے بعد ٹیچرز کے ساتھ مختلف نشستیں ہوتیں۔ ہنیزہ قادر صاحبہ نے بتایا کہ ’’میں دستگیر اسکول میں زیر تعلیم تھی۔ ہم اکثر بریک میں اسٹاف روم جاتے تو خالہ جان ٹیچرز کی قرآن ترجمے کی کلاس لے رہی ہوتیں۔ ان میں سے ایک ٹیچر تو بعد میں جماعت کی رکن بھی بنیں اور بہت سی ٹیچرز اس طرح جماعت کی دعوت سے متعارف ہوئیں‘‘۔

خدمت سے الخدمت تک:

اِن کی ذات میں لوگوں کے کام آنے کا جذبہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ گھر کے دروازے اپنے اور غیروں سب کے لیے ہر وقت کھلے رہتے۔ کسی کا انتقال ہو جاتا تو وقت بے وقت لوگ آپ کو مردے نہلانے کے لیے بلاتے تو خواہ کیسی ہی بیماری کی مریضہ ہو آپ کو جانے میں ہچکچاہٹ نہ ہوتی تھی۔ جب تک ہمت رہی خود یہ کام کرتی رہیں، بعد میں اپنی نگرانی میں لڑکیوں سے یہ کام کرواتیں تاکہ وہ بھی سیکھ سکیں۔

بوسنیا میں ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے تو کراچی حلقہ خواتین نے وہاں کے مسلمانوں کی مالی امداد کے لیے ایک بازار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا جس کے لیے کارکنان سے اپنے اپنے گھروں کی اضافی اشیا دینے کی اپیل کی گئی۔ ان اشیا کو جمع کرنے اور معیار کے لحاظ سے ان کی قیمت مقرر کرنے اور فروخت کرنے کے لیے ان کو نگران بنایا گیا۔ سارا سارا دن آپ پیرانہ سالی کے باوجود اپنی ٹیم کے ساتھ اس کام میں مصروف رہتیں، یہاں تک کہ یہ کام بخیر وخوبی

تکمیل تک پہنچااوراس کی مدد سے فنڈ کی ایک بڑی مقدار جمع کرنے میں مدد ملی۔

طاقت وتوانائی کے دور میں ہرآن اللہ کی راہ میں محوسفر رہیں۔ جب بڑھاپے کا دور آیا اور سفر سے گردن کے مہروں میں تکلیف ہونے لگی تو اُن کی درخواست پر نظم نے شعبہ الخدمت کی ذمہ داری سپرد کر دی۔ اس شعبہ کے تحت آپ نے جہاں راشن، جہیز بکس، بچوں کی اسکولز کی کتابوں اور فیسوں، بیماروں کے علاج اور قرض کی ادائیگی کا انتظام شروع کیا، وہیں الخدمت کے تحت غریب عورتوں کے روزگار کے لیے انڈسٹریل ہوم بھی کھولا۔ پہلے یہ کرائے کے گھر میں کھولا گیا لیکن بار بار گھر خالی کرنے کی پریشانی سے بچنے کے لیے انہوں نے اس کام کے لیے مستقل جگہ خریدنے کا پروگرام بنایا۔ بیٹی نجیبہ بتاتی ہیں کہ امی میرے پاس سعودی عرب آئیں تو مختلف لوگ انھیں درس کے لیے بلاتے۔ وہ جہاں جاتیں لوگوں کو انفاق کے لیے ابھارتیں اوراس مقصد کے لیے بھی فنڈ کی اپیل کرتیں۔لوگ ان کی دلسوزی سے کہی بات سے متاثر ہوکر رقوم اورزیورات فنڈ کے لیے دیتے۔واپس آکر بھی وہ اپنی انہی کوششوں میں لگی رہیں یہاں تک کہ دوسال کی مدت میں چودہ لاکھ روپے جمع کرکے نظم کو دیے جس سے الخدمت انڈسٹریل ہوم کے لیے مکان خریدا گیا۔

انڈسٹریل ہوم کے قیام کے بعد پورا ہفتہ وہیں گزارتیں اوراتوار کے علاوہ کبھی اسے بند نہ کرتیں۔ اپنے گھر کے علاوہ کہیں اور جاکر رہنے سے بھی گریز کرتیں تاکہ اس ذمہ داری میں خلل نہ آنے پائے۔ وہاں کی ہر چیز کوامانت سمجھتیں اوراس کا بہترین استعمال کرتیں۔ایک دفعہ کسی نے ڈھیروں ٹائیاں بھیج دیں تو بہت سوچ کر انہوں نے اس سے بٹوے بنوائے اور فروخت کیے۔سلائی کے کپڑوں کی کترنوں کو بھی ضائع نہیں کرتی تھیں بلکہ انھیں جمع کرکے ان سے بھرکر تکیے بنواتیں۔ ان چیزوں کی فروخت سے حاصل شدہ رقم سے کسی ضرورتمند کوٹھیلا لگوا دیا جاتا، کسی کو سلائی مشین لے کردی جاتی، کسی کو دکان سیٹ کروا دی جاتی۔ ساتھ ہی ساتھ یہاں دعوت کا کام بھی جاری رہتا۔ روزانہ ترجمہ قرآن پڑھاتیں۔ ماہانہ درس ہوتا۔ ناظرہ قرآن وتجوید کے لیے مدرسہ بھی شروع کیا گیا۔

رسوم ورواج کی اصلاح:

خوشی غمی کی تقریبات میں شرکت کرتیں تو ساتھ ہی ساتھ معاشرے میں رائج رسومات کی اصلاح کی بھی کوشش کرتیں۔اس ضمن میں جائز اور ناجائز کاموں کوآسان مثالوں اورقرآن و حدیث سے واضح انداز میں لوگوں کے سامنے رکھتیں۔زہرہ افتخار زبیری صاحبہ بتاتی ہیں کہ ایک دفعہ ربیع الاوّل کے مہینے میں میلاد میں درس کے لیے بلایا گیا جس میں آپ نے التحیات کے ترجمے کو بڑے واضح انداز میں سمجھایا کہ اللہ نے ہمیں نماز میں بیٹھ کر پڑھی جانے والی التحیات میں اپنے نبی ﷺ پر درود وسلام بھیجنے کا طریقہ سکھایا ہے تو یہی طریقہ سب سے افضل ہے۔ بات تمام خواتین کو بہت اچھی طرح سمجھ میں آ گئی۔

آخری وقت تک اجتماعات میں شرکت:

زندگی کے آخری سالوں میں ان کے لیے چلنا بالخصوص سیڑھیاں چڑھنا بے حد دشوار ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے مظاہروں، اجتماعات اور دیگر سرگرمیوں میں خود کو حاضر وموجود رکھا۔ بہت آہستہ خرامی سے اسٹک کے سہارے چلتی ہوئی آتیں اور کرسی پر بیٹھ جاتیں۔ لوگ ان سے وہیں ملاقاتیں کرتے۔ وہ خندہ پیشانی سے ہرایک کی خیریت دریافت کرتیں۔ کبھی الخدمت بچت بازار میں پورا اسٹال سنبھالے بیٹھی رہتیں۔ بات کرنا بھی دشوار ہوتا تو اشاروں سے سمجھاتیں اورانڈسٹریل ہوم کی اشیا کی خریداری پر آمادہ کرتیں۔

حکیم محمود برکاتی صاحب کی شہادت پران کے گھر تعزیت کے لیے گئیں۔ قاضی حسین احمد صاحب اور پروفیسر غفور احمد صاحب کے انتقال پر ازحد غمگین تھیں۔ بیگم قاضی حسین احمد سے فون پر بات کرنے کی آخر وقت تک کوشش کرتی رہیں۔دس جنوری کو جماعت کی طرف سے دونوں مرحومین کے لیے جو تعزیتی پروگرام رکھا گیا، اس میں شریک ہوئیں اور بیس جنوری کو خود بھی ان مرحومین سے جاملیں۔

اس ضمن میں ایک حیرت انگیز واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ھنیزہ قادر نے بتایا کہ ''ہماری امی انتقال سے قبل کچھ عرصے اس حال میں رہیں کہ کسی کو پہچان نہیں رہی تھیں اور نہ ہی بات کر

رہی تھیں۔ زبیدہ خالہ کو امی کی بیماری کی اطلاع نہیں تھی کیونکہ ۸/ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو آنے والے زلزلہ میں ان کے بھائی اور بھابھی انتقال کر گئے تھے اور زبیدہ خالہ اسلام آباد گئی ہوئی تھیں۔ اس رات جب انہیں پتا چلا اور انہوں نے امی سے بات کرنے کے لیے مجھے فون کیا تو میں نے امی کی حالت بتاتے ہوئے کہا کہ میں فون امی کے کان پر لگا دیتی ہوں۔ آپ کی آواز وہ شاید سن لیں لیکن جواب نہیں دے سکیں گی۔ میں نے موبائل امی کے کان پر لگا دیا تو تھوڑی دیر میں امی کو بولتے سنا کہ آپا جان۔ السلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ؟ آپ کے بھائی بھابھی کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ میں حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ یہ کیسا تعلق ہے جو خونی تعلق سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس کے بعد امی نے کوئی بات نہیں کی بس وقتِ آخر ہمیں خدا حافظ کہا۔

بیماری میں صبر:

آپ نے زندگی کے مختلف ادوار میں کئی بیماریوں کو اللہ کی مدد اور اپنی قوت ارادی کے بل پر زیر کیا۔ کچھ بیماریاں تو آخر تک رہیں شوگر، بلڈ پریشر، دل کی تکلیف، گھٹنوں کا درد، سانس کی تکلیف۔ یہ ساری تکلیفیں ایک دو برس نہیں پچیس تیس برس ساتھ رہیں۔ وہ دوائیں کھاتی تھیں مگر خود پر بیماریوں کو کبھی حاوی نہیں ہونے دیا اور نہ کسی بیماری کو عذر بنایا۔

یہ سب بیماریاں بھی ان کے شوق عبادت کو کم نہ کر سکیں۔ رات کتنی ہی دیر سے سوتیں تہجد کے لیے اٹھ جاتیں۔ تیرہ چودہ پندرہ تاریخ کے روزے پابندی سے رکھتیں۔ شوال کے روزے، ذی الحج کے روزے اور محرم کے روزے آخر تک رکھے۔ سحری کے لیے خود انتظام کر لیتیں۔ آخر میں جب اس کی ہمت نہیں رہی تو رات میں سرہانے کھانے کی کوئی چیز رکھوا لیتیں اور اسی سے سحری کر کے نیت کر لیتیں۔ کسی کو تکلیف نہ دینے کا جذبہ ان پر حاوی رہتا۔ رات کو جب انجائنا کی تکلیف ہو جاتی تو خود ہی گولی زبان کے نیچے رکھ لیتیں کسی کو نہ اٹھاتیں۔ دوسروں کو اپنی وجہ سے پریشان کرنا انھیں سخت ناپسند تھا۔

سفرِ آخرت:

ہمیشہ کہتیں کہ دعا کیا کرو کہ ''اللہ آخر وقت تک مجھ سے اپنے دین کا کام لے'' اللہ نے اس

دعا کو اس طرح قبول کیا کہ آپ اسپتال جانے سے پہلے تک اپنی ذمہ داری نبھاتی رہیں۔ مختصر سی علالت کے بعد آپ ۲۰ جنوری ۲۰۱۳ء کو اس رب سے جا ملیں جس کی رضا کے لیے آخر وقت تک کوشاں رہیں۔

اتوار کا دن تھا۔ زندگی میں لوگوں کو تکلیف دینا ناپسند تھا تو اللہ نے جنازے میں آنے والوں کو بھی چھٹی کرنے کی تکلیف سے بچا لیا۔ بائیس سالہ جوان بیٹے کی شہادت پہ آنسو نہ بہانے والی بہادر ماں جب دنیا سے گئی تو اس کی اپنی بیٹیوں کے ساتھ بے شمار روحانی بیٹیاں غمزدہ تھیں۔ اللہ آپ کو اپنے شہید بیٹے کے ساتھ اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے۔ آمین

ماخذات

۱۔ انٹرویو بسلسلہ تاریخ جماعت۔ روبینہ فرید صاحبہ
۲۔ نحیہ نذیر صاحبہ۔ بیٹی
۳۔ عائشہ منور صاحبہ۔ سابقہ قیمہ حلقہ خواتین
۴۔ رقیہ فردوس صاحبہ۔ سابقہ نائب قیمہ حلقہ خواتین
۵۔ انجم خالق صاحبہ۔ بیٹھک اسکول
۶۔ فرحت طاہر صاحبہ۔ صدر حریم ادب
۷۔ زہرہ افتخار زبیری صاحبہ۔ کارکن جماعت اسلامی
۸۔ ہنیرہ قادر صاحبہ۔ رکن جماعت اسلامی

عذرا جمال

۱۹۳۳ء تا ۱۹۹۶ء

عذرا آپا کی دعوت کا دائرہ بہت وسیع تھا، جس میں تمام خواتین اور بچے شامل تھے۔ وہ جس بہو پر کام کرتیں اس کی ساس سے دوستی کر لیتیں، اور جس ساس پر کام کرتیں اس کی بہو، بیٹیوں پر خاص توجہ دیتیں۔ دعوت کے نتیجے میں افراد کو متعین کر کے ان پر کام کرتیں، پھر انہیں جماعت کا حصہ بنا دیتیں۔ ایک مستقل دعوتی سرگرمی یہ تھی کہ گھر میں نئی دلہنوں کی دعوت رکھی جاتی اور دعوت کے اس ماحول میں ہلکے پھلکے پروگرامات کے ذریعے گھر کو برتنے کا سلیقہ، بہو اور ساس کے آپس میں کیسے تعلقات ہوں؟ اور شوہر کے ساتھ کامیاب زندگی گزارنے کے اصول بتائے جاتے۔ اس پروگرام کا مقصد کردار سازی کرنا اور ان افراد کو متعین بنانا تھا۔ اس وقت جماعتِ اسلامی میں متعین افراد کی اصطلاح عام نہ تھی، آپ نے اس کی بنیاد رکھی۔

ڈرائیور کریم صاحب نے نارتھ ناظم آباد کے ایک گھر کی اطلاعی گھنٹی بجائی تو چند لمحات گزرنے کے بعد ایک سن رسیدہ خاتون کا ہولے ہولے لرزتا ہوا وجود دروازے پر نمودار ہوا جن کے پیچھے ایک بھاری اٹیچی کیس موجود تھا۔ اس اٹیچی کیس میں ان کی ہفتہ بھر کی جستجو کے بعد جمع شُدہ کتب موجود تھیں۔ انھوں نے ڈرائیور کو اٹیچی کیس گاڑی میں رکھنے کی ہدایت کی اور ان سے اتنا وزن اُٹھوانے پر معذرت بھی کی۔ پھر خود بھی آہستہ آہستہ چل کر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ اس حالت میں کہ بخار کی گرمی سے چہرہ تمتما رہا تھا اور ایک پاؤں فیل پا کے مرض کے باعث سوج کر بھاری ہوگیا تھا۔ دو گھنٹے پر محیط سفر میں انھوں نے مختلف گھروں سے قلمکار خواتین کو جمع کیا اور پھر اس قافلے کے ہمراہ اس مقام تک پہنچیں جہاں آج ''حریمِ ادب'' کی محفل سجائی جانی تھی۔ اپنی بیماری کو پسِ پُشت ڈال کر ہر تحریر کی حوصلہ افزائی کرنے اور اس کی اصلاح کے لیے مفید مشورے دینے والی یہ خاتون عذرا جمال تھیں جو کراچی حریم ادب کی نگراں تھیں اور ہر ہفتے اس ادبی محفل کے انعقاد کے لیے یہ پُرمشقّت سفر اختیار کر کے ادب کے پھولوں کا گلدستہ بنانے کی کوشش میں مگن رہتی تھیں۔ انہیں جب اس ذمہ داری پر کھڑا کر دیا گیا تو اُنھوں نے بے پناہ داعیانہ جذبے کے تحت قلم کے سپاہیوں کی تیاری کا اہم فریضہ عبادت اور امانت جان کر ادا کیا۔

ابتدائی تعارف:

سیدہ عذرا جمال کی زندگی کا ابتدائی سفر پُر وقار خاندانی روایات، تربیت و محنت اور جانفشانی کا ایک دلفریب منظر نامہ ہے۔ ان کی پیدائش کانپور انڈیا میں ہوئی۔ چھ سال کی عمر میں مدرسے سے قرآن پاک ختم کیا۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ قیام پاکستان کی تحریک میں مسلم لیگ کے جلسوں میں تقریریں کرتیں اور نظمیں پڑھا کرتی تھیں۔ ان کے والد کا تعلق خاکسار تحریک سے تھا اور والدہ کا جماعت اسلامی سے تعلق رہا۔ قیام پاکستان کے ایک سال بعد پندرہ برس کی عمر میں شادی ہوگئی۔ سسرال بریلی کا جاگیردار گھرانہ تھا اور شوہر فوج میں ملازم تھے۔

جب وہ شادی ہو کر سسرال آئیں تو وہاں کا ماحول ان کے میکے کے ماحول سے بالکُل مختلف تھا جہاں مختلف رسومات و توہمات کی بہتات تھی۔ ان کے سسرالی رشتہ داران کی دعوت کا خاص محور تھے۔ اپنی خوش خلقی کی بنا پر انہیں سسرال میں حد درجہ احترام اور بے پناہ محبت ملی،

بھاوج کے بجائے بہن کا درجہ ملا۔ خصوصاً ان کے جیٹھ بہت احترام سے پیش آتے تھے۔

رشتوں کو جوڑ کر رکھنا اور رب کے سوا کسی سے صلے کی اُمید نہ رکھنا ان کے کردار کا نمایاں پہلو تھا۔ وہ اس بات پر یقین کا اظہار کرتی تھیں کہ جو مقدر میں ہے، وہ ضرور مل کر رہے گا اور جو مقدر میں نہیں ہے، وہ باوجود کوشش کے نہیں ملے گا۔

اُنہوں نے اپنی اولاد، خاص طور پر بیٹوں کو یہ احساس دلایا کہ تمہارے تایا تمہارے والد کی طرح محترم ہیں اور ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ لیکن تم ان کے بیٹے کی کمی کو پورا کرو گے۔ الحمدللہ! ان کی اولاد نے خصوصاً بیٹوں نے اپنی والدہ کے انتقال کے بعد بھی اپنے تایا اور تائی کی دیکھ بھال اور خدمت میں کسی طرح کی کوئی کمی نہ آنے دی۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کی اور سیالکوٹ ان کا مسکن بنا۔ چار بچّوں کی پیدائش سیالکوٹ میں ہی ہوئی۔ وہاں کی معاشرت اور زبان کے مختلف ہونے کے باوجود اجنبی ماحول میں اپنے مشفقانہ رویے کے ذریعے آپا جی کی حیثیت سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی۔

داعیانہ حکمت:

ان کا داعیانہ کردار کم عمری سے ہی نمایاں تھا۔ انھوں نے بچّوں کے ذریعے کام کی ابتدا کی۔ انہوں نے اپنے اطراف کے لوگوں کی بچیوں کو قرآن پڑھنے کی طرف متوجہ کیا اور خود قرآن پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے کھیل کود میں بھی ان کی ساتھی بنیں۔ جس میں گڑیاں بنانا اور ان کے لباس تیار کرنا شامل تھا۔ اس کے ذریعے انہوں نے ان بچیوں کو اردو سکھانے اور خود ان سے پنجابی سیکھنے میں کامیابی حاصل کی اور اس طرح اس معاشرت اور تہذیب سے شناسائی حاصل کی۔ گڑیوں کی شادی جیسے کھیل کے ذریعے انہوں نے بچوں کو کھیل کود کے آداب، مہمان نوازی کے آداب اور بری رسموں سے اجتناب برتنا سکھایا۔ یہ سارا عمل بچیوں کے والدین تک موثر پیغام پہنچانے کا سبب بنا۔

جہاں ان تمام معاملات و روابط کے ذریعے لوگوں کو خود سے قریب کیا، وہیں انھیں یہ کمی بھی محسوس ہوتی تھی کہ یہاں ایسی اسلامی اجتماعیت ہو جو لوگوں کو سمیٹے اور ان کی رہنمائی کرے۔ یہ خواہش ان کے دل میں ہی تھی کہ اپنے والدین سے ملنے ان کا انڈیا جانے کا پروگرام طے پایا۔ چونکہ ان کی والدہ انڈیا میں جماعت اسلامی سے تعلق رکھتی تھیں، اس طرح

انہوں نے اپنی والدہ کے ذریعے ناظمہ ہند سے ملاقات کی اور سیالکوٹ کے ایک رکن جماعت کا پتا حاصل کیا جو مقامی شفا خانے کے منتظم تھے۔

سیالکوٹ واپسی کے بعد ان کے شوہر نے اس شفا خانے کے منتظم صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اسی دوران آپا جی کو شدید بخار آیا۔ وہ علاج کی غرض سے اسی شفا خانے گئیں۔ اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ ہجرت کے دوران ایک کیڑے کے کاٹنے کے باعث فیل پا کی بیماری ہوگئی ہے جس کی وجہ سے ایک پیر بے حد بھاری اور متورم ہوگیا ہے مگر انہوں نے اس تکلیف کو کبھی اپنے کام کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیا۔ انہوں نے شفا خانے سے ہی آپا نیر بانو کا پتا حاصل کیا اور پھر ان سے رابطہ کیا۔

حصولِ علم:

آپا نیر بانو سے رابطہ کے بعد ان کی تربیتی و تنظیمی زندگی کا آغاز ہوا۔ اُنہوں نے آپا نیر بانو سے قرآن کو ترجمے اور تفہیم کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے لڑکیوں کو بھی قرآن ترجمے کے ساتھ پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آپا جی کے بیٹے مجاہد نبی ان کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ''میں نے جب سے ہوش سنبھالا اپنی ماں کو انتہائی مدّبر شخصیت، بہترین طالب علم اور استاد پایا۔ میں اس وقت چھوٹا تھا اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گھر کا خیال رکھتا تھا۔ امی قرآن کو ترجمے وتشریح سے پڑھنے کے لیے گھر سے تقریباً تین کلومیٹر دور آپا نیر کے پاس کبھی تانگے سے اور کبھی پیدل جاتی تھیں، انہوں نے یہ تعلیم ایک سال کے دوران مکمل کی۔ پوری زندگی انہوں نے سیکھنے اور سکھانے کا عمل جاری رکھا۔ یہ ان کی شخصیت کا ایسا پہلو ہے جسے نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ دوران تعلیم امی گاؤں کے بچّوں کو خود بھی قرآن پڑھایا کرتی تھیں۔ آپا نیر بانو بھی اکثر گاؤں آ کر امی کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں''۔

توسیع دعوت:

نیر بانو سے ملاقات اور لٹریچر کے مطالعہ نے ان کے لیے کاموں کی سمت متعیّن کر دی جس کے بعد وہ دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں آپا نیر بانو کی معاون و مددگار بن گئیں۔ قرب و جوار کے دیہاتوں میں دعوتی سرگرمیاں رکھی جاتیں جو بظاہر تفریحی پروگرام ہوتے مگر ان کے ایجنڈے دعوتی اور تنظیمی نقطۂ نظر سے مرتب کیے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی توجہ اس معاشرے کی ایک بنیادی خرابی ''شرک''

کی طرف خصوصی طور پر مرکوز رکھی جو گُھن کی طرح معاشرے کی جڑوں میں سرائیت کر رہا تھا۔ انہوں نے توحید پر یقین کی بار بار تذکیر کی اور لوگوں کو شرک سے بچانے کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔

خودداری:

ہجرت کے بعد مالی حالات نہایت مخدوش ہو گئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اکثر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائیداد، گھر اب ان کی ملکیت ہیں لیکن سب کے اصرار کے باوجود انہوں نے اس بات کو نظرانداز کر دیا اور قبول نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے پیش نظر گھر، جائیداد نہ تھا بلکہ وہ عظیم مقصد تھا جس کی بدولت یہ مملکت وجود میں آئی تھی۔ وہ اللہ کی زمین پر اسی کا نظام دیکھنے کی متمنی تھیں اور ان کی ساری زندگی اسی جہت پر مبنی تھی۔ وہ اپنے ہنر اور ہر وقت مشقت کی عادت کو اپنا زادِ راہ بنائے عسرت کے اس دور سے گزر آئیں۔ آپا جی نے اپنی اولاد کو اس بات کی تلقین کی کہ وہ مدد کے لیے کسی کی طرف نہ دیکھیں اس سلسلے میں ان کے بیٹے نے مزید بتایا کہ ''میں اور میرے بڑے بھائی مختلف فیکٹریوں سے بیڈمنٹن کھیلنے کی جالی (Net) بُننے کے لیے لے آتے اور امی کے ساتھ مل کر راتوں کو جاگ کر یہ کام مکمل کرتے۔ امی نے انتظام کر کے سلائی مشین بھی لے لی تھی وہ سلائی بھی کرتیں۔ ابو کی آمدنی بھی شامل ہوتی، اس طرح گھر کے اخراجات اور ہماری تعلیم کا بندوبست ہوا کرتا''۔

دوسری ہجرت:

اسی جدوجہد کے ساتھ آپا جی نے محنت و مشقت سے بھرپور زندگی کے پندرہ سال سیالکوٹ میں گزار دیے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ان کے شوہر کراچی آ گئے۔ وہ یہاں فوج میں ملازم تھے پھر آپا جی چھوٹی بیٹیوں کے ساتھ کراچی آ گئیں۔ باقی بچّے پہلے لاہور تایا کے پاس ٹھیرے، ۱۹۶۶ء میں وہ بھی کراچی آ گئے۔

کراچی آنے کے بعد آپا جی نے یہاں اُم زبیر صاحبہ سے رابطہ کیا اور ان کی ہمنوائی میں دعوتی و تربیتی سفر کو جاری رکھا۔ خاندانی محافل میں درس قرآن کی روایت ڈالی۔ مہینے میں ایک بار درس قرآن ہوا کرتا جس میں اہل خاندان کو دعوت عام دی جاتی۔ آج بھی ان کے بیٹے کے گھر میں اس محفل کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ آپا جی کے بیٹے مزید بتاتے ہیں کہ ''کراچی آنے کے بعد امّی کے اصرار پر اسلامی جمعیت طلبہ میں شمولیت اختیار کی اور پورا تعلیمی دور جمعیت کے

سائے تلے گزارا۔اس کے بعد اپنا کاروبار شروع کیا تو امّی نے بے پناہ حوصلہ افزائی کی۔ میں نے دیکھا کہ جب میں نے کاروبار میں کامیابی حاصل کی اور گھر کے حالات بہتر ہونے لگے تو امّی کی درس وتدریس کی مصروفیات میں اضافہ ہوگیا''۔

گھریلو جہاد:

گھر میں ایک بڑا سا تخت ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھا جہاں بھرپور دعوتی وتربیتی ملاقاتیں ہوتیں۔ آپا جی لوگوں کے مسئلے سنتیں اور ان کے حل بتاتیں۔مہمانوں کی چائے ناشتے سے تواضع کی جاتی،ایک جانب سلائی مشین رکھی ہوتی اور کپڑوں کی سلائی جاری رہتی،سکھانے کا عمل بھی ساتھ ہی منسلک تھا۔کبھی اُون سلائیوں سے بڑی سرعت سے سوئیٹر بُنے جارہے ہوتے۔وہ جو سراپا محبت تھیں۔جیسی چیز اپنے لیے اور اپنے بچّوں کے لیے تیار کرتیں،اسی معیار کی چیزیں اپنے ہاتھ سے تیار کر کے دوسروں کو تحائف دیتیں۔یہ ان کے معمولات کا حصہ تھا۔

آپا جی کے گھر میں فجر کے بعد سونے کی اجازت نہیں تھی۔علی الصبح کاموں سے فارغ ہو کر گھر میں موجود مدرسے میں بچّوں کو پڑھاتیں، بیٹیاں بھی اسکول کالجز سے آ کر بچّوں کو قرآن پڑھانے لگتیں۔مدرسے کے بچّوں کے لیے آپا جی ہفتہ وار نوری محفل کا اہتمام کرتیں۔اس کے ذریعے بچّوں کی دینی و دنیاوی تربیت اور ان کی صلاحیتوں کو اُبھارنے پر آپا جی کی زبردست گرفت رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوری محفل کے شرکا بچّوں میں سے آج کئی افراد تحریک کی اہم ذمہ داریوں کا بار اُٹھائے ہوئے ہیں۔

ان کی مصروفیات کے متعلق ان کے بیٹے نے بتایا کہ''امی نے دن کا بیشتر حصہ درس وتدریس کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ یوں تو گھر میں ماسی کی سہولت بھی موجود تھی مگر صبح والد صاحب اور ہم لوگوں کا مکمل ناشتہ وغیرہ تیار کرتیں اور رات کا کافی وقت انہوں نے تحریر کے لیے وقف کر رکھا تھا۔نہ صرف بہت سے مضامین کی وہ لکھاری تھیں بلکہ کئی نظمیں بھی انہوں نے تخلیق کیں''۔

اپنے گھریلو معاملات میں آپا جی کا کیا کردار رہا،اس بارے میں انجم خالق نے، جو آپا جی کی بڑی بیٹی ہیں، بتایا کہ''ہمارے گھر میں بہت زیادہ مالی مشکلات بھی آئیں لیکن امّی نے کبھی اسے ہم پر ظاہر نہیں کیا۔قناعت کی زندگی بسر کی۔کپڑے سلائی کیے لیکن پڑھانے کے باوجود اس کا معاوضہ نہیں لیا۔پُرانے کپڑے سی کر ہمیں پہنا دیتیں۔سوکھی روٹیاں میٹھی کر کے یا حلیم کی

صورت میں پکا کر ہمیں کھلا دیتیں۔ ہاتھ میں بے حد ذائقہ تھا۔بہت جلدی ہر چیز تیار کر لیا کرتی تھیں۔مالی پریشانی کا نہ کبھی ذکر کیا نہ شکوہ زبان سے ادا ہوا۔امّی ہمیشہ دینے کی فکر میں رہتیں، لینے کا کبھی نہ سوچا''۔میری امّی کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اُن کی اولادیں ایک بہترین اجتماعیت کے ساتھ جُڑ کر اپنی زندگی گزاریں۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے''اسلامی جمعیت طالبات کراچی'' کا سب سے پہلا اجتماع ہمارے گھر منعقد ہوا۔اُم زبیر خالہ جان کی بیٹی آسیہ باجی کو ناظمہ بنایا۔ یوں میں نے نویں جماعت میں اسلامی جمعیت طالبات میں شمولیت اختیار کی۔ جب میں دسویں جماعت میں آئی تو ہمارے گھر مدرسے کا آغاز ہوا۔جس میں بچّے،بچّیاں،لڑکیاں اور خواتین سب تعلیم حاصل کرتے۔بڑی لڑکیاں اور خواتین ترجمہ وتفسیر روزانہ کی بنیاد پر پڑھا کرتے تھے اور اُن میں میں بھی شامل تھی۔اس طرح ابتدائی تعلیم میں نے امّی سے حاصل کی۔

جب یادوں کے دریچے میں جھانکتی ہوں تو ایک منظر سامنے آتا ہے کہ گھر میں ہفتہ وار درس کی تیاری ہو رہی ہے۔کالج سے واپسی پہ جونہی گھر میں داخل ہوئی تو یاد آیا آج تو مدرسہ نہیں ہے،اس لیے آرام کر لیتی ہوں۔ جیسے ہی یہ ارادہ کیا وہیں امّی نے آواز دی کہ انجم فوراً یہاں آ کر بیٹھو درس کے لیے لوگ آنے والے ہیں''۔پھر اُکتاہٹ کے ساتھ درس میں بیٹھ گئی اور ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔درس ختم ہونے کے بعد امّی نے کہا''جا کر فلاں کتاب اُٹھا کر لاؤ''۔ کتاب لانے کے بعد امّی نے ایک منتخب مضمون پڑھنے کو کہا اور میری اُکتاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔اب امّی کے برابر میں بیٹھی لٹریچر کا باآواز مطالعہ کر رہی ہوں۔ جہاں اٹکی، وہیں امّی نے سرزنش کی۔ لیجیے جناب اب تو آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے اور الفاظ مزید دُھندلے ہو گئے۔ ساتھ ہی غصہ بھی آ رہا ہے کہ کیوں سب کے سامنے پڑھنے بٹھا دیا اور اپنی غلطیوں پر شرمندگی بھی۔۔۔پھر اسی شرمندگی سے بچنے کے لیے درس سے پہلے ہی امّی سے جا کر لٹریچر کا پوچھ لیا کہ آج کیا پڑھوائیں گی۔اس طرح مطالعہ لٹریچر کی عادت پختہ ہوتی چلی گئی۔

۱۹۸۳ء میں جب جماعت کی رُکنیت کا حلف اٹھایا تو میرا اور امّی کا رشتہ راہِ حق کے ساتھیوں جیسا بن گیا۔ان کے دعوتی وتربیتی کاموں میں میری معاونت شامل رہتی۔ جو ہر قدم پر میرے لیے رہنمائی بن جاتی۔خصوصاً میمن برادری میں دعوت کے کام میں امّی کے ساتھ رہی۔اس ساتھ کے نتائج آج تک حاصل کر رہی ہوں،جبکہ میں بیٹھک اسکول کے ساتھ منسلک ہوں''۔

بیٹی شاہینا حمد بیان کرتی ہیں کہ ’’جب میں چھٹی جماعت میں تھی تو اسکول سے آنے کے بعد گھر میں ایک رومال رکھا ہوتا جس پہ پنسل سے پھول بنا ہوتا امّی کا حکم تھا کہ اسکول سے واپسی کے بعد وقت ضائع کرنے کے بجائے رومال کاڑھا جائے۔ ہر دفعہ کوئی نیا ٹانکا سکھا دیتی تھیں اس کے بعد ہر عید، بقر عید پہ وہ رومال رشتہ داروں، عزیزوں میں تحفتاً تقسیم کر دیتیں۔ اس عمل کے نتیجے میں کئی مقاصد کا حصول ممکن ہو جاتا۔ میرا وقت ضائع نہ ہوتا، میں ہنر سیکھ گئی اور امّی نے تحائف دینے کا سامان جمع کر لیا۔ ایک قابل غور بات یہ ہے امّی کا انداز کبھی حاکمانہ نہیں ہوتا تھا لیکن پھر بھی ان کی کوئی بات ٹالی نہیں جاتی تھی۔ اس رویے کے پس منظر میں دراصل امّی کی ناراضی کا ڈر موجود ہوتا تھا۔

۱۹۷۱ء کی جنگ کے زمانے میں گھر کو ضلع وسطی میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ فوجی بھائیوں کے لیے تحائف، راشن ہمارے گھر سے پیک ہو کر جاتے تھے۔ امّی ہمیں طریقہ بتا دیتیں اس کے بعد ہم سب مل کر یہ کام مکمل کرتے تھے۔

۱۹۷۷ء کی تحریک میں تو دو بیٹیوں کی شادی کے باوجود پورا گھرانہ تحریکی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ گھر میں شادی کے ہنگاموں سے زیادہ تحریکی کام ہو رہے تھے۔

گھر میں سب سے چھوٹے ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ بہت وقت امّی کے ساتھ گزرا۔ میں امّی کے ساتھ شبِ داریوں میں شرکت کرتی۔ اس طرح عبادت کا لطف چھوٹی عمر میں ہی حاصل کر لیا۔ اب سوچتی ہوں کہ صحیح وقت پر صحیح چیز حاصل کر لی تھی۔ امّی کے ساتھ قرآن کا لفظی ترجمہ اور تفسیر پڑھی۔ جو وقت امّی کے ساتھ گزرا وہ زندگی کا بہترین دور تھا‘‘۔

اپنے انتقال سے دو روز قبل امّی نے نیوی ہاؤسنگ سوسائٹی میں درس دیا جسے خواتین نے بے حد سراہا اور درس سے بہت سی خواتین متاثر ہوئیں۔ جب دوسرے دن میں امّی سے ملنے گئی تو وہ گھر میں سب کو خوشی سے یہ روداد سُنا رہی تھیں۔ اس وقت وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ امّی سے میری آخری ملاقات ہے۔ اگلے روز میری امّی اپنے پیارے رب سے ملنے اس کے حضور جا پہنچیں۔ ’’اَللھُمّ اغفر لھا‘‘۔

عذرا آپا کی بیٹی شبانہ صادق بتاتی ہیں کہ ’’یہ ۱۹۹۰ء کی بات ہے میں اِن دنوں لاہور میں رہائش

پذیر تھی۔ میری بیٹی ثوبیہ کی ولادت کے موقع پر امّی میرے پاس آئی ہوئی تھیں۔ اکتوبر کا مہینہ تھا جب لاہور کا موسم خوشگوار ہو جاتا ہے، اپنی تکلیف کے باوجود میرے اور بچّوں کے کام کرتیں ان کے ساتھ وقت گزارتیں ان کی مختلف انداز سے تربیت کرتی تھیں جب بچّے اسکول سے آ جاتے تو ان کو اپنے ساتھ مصروف رکھتیں۔ مجھے لاہور گئے ہوئے ابھی چند ماہ ہوئے تھے اس لیے میرا وہاں جماعت اسلامی حلقہ خواتین سے کوئی رابطہ نہ تھا امّی نے وہاں کے حلقہ خواتین سے رابطہ کیا اور پھر میری ان سے ملاقات کروائی جس کے بعد میں باقاعدہ وہاں جماعت کے ساتھ منسلک ہوگئی۔

امّی کیونکہ داعیانہ سوچ رکھتی تھیں اس لیے ان کو فکر ہوتی تھی کہ کسی طرح دین کی دعوت اطراف میں پہنچائی جائے ان کی اس سوچ اور فکر کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح پورا کیا کہ ہمارے محلّہ میں رہائش پذیر مدیر اُردو ڈائجسٹ الطاف حسن قریشی صاحب کی بیگم سے امّی کی ملاقات ہوئی اور لکھنے کے شوق کے باعث دونوں میں دوستی ہوگئی۔ ساتھ ہی محلے کی کچھ اور خواتین سے بھی ان کی مُلاقات ہوگئی اور انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ ہم خواتین صبح پارک میں واک کے لیے جاتی ہیں اور وہاں اور بھی بہت سے خواتین ہوتی ہیں تو کیوں نہ آپ اُن کو کچھ ہلکا پُھلکا درس دیں اور آسان انداز میں ان کو دین کی بات بتائیں امّی تو ویسے ہی اس فکر میں تھیں انھوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور تیار ہوگئیں اور پھر جتنے دن میرے پاس لاہور رہیں یہ کام انجام دیتی رہیں۔ جس کی وجہ سے اچھی خاصی تعداد میں لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا۔ امّی کو اللہ تعالیٰ نے حکمت اور فراست سے نوازا تھا۔ تبلیغ کے لیے کوئی بھی موقع میسر آ جاتا اس کو ضائع نہ ہونے دیتی تھیں اور ہر طبقہ فکر اور ہر عمر کے لوگوں کے ساتھ گھُل مِل جاتیں۔ بچّوں کے ساتھ بچّوں کے ذہن کے مطابق اور اُن کی خواہش کے مطابق، اور بڑی خواتین میں ان کے مطابق، اسی طرح نوجوان لڑکیوں کے درمیان ان کے مطابق یعنی ہر محفل کی اور سب کی پسندیدہ شخصیت کی مالک تھیں۔ آج بھی اکثر خواتین سے امّی کے بارے میں خیالات سن کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ ان کا ایک اپنائیت کا تعلق تھا ہر ایک سے محبت اور شفقت کا جذبہ ان کے اندر موجود تھا۔ اپنی ذات کو پیچھے چھوڑ کر دوسروں کی مدد کرنا اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ ان کے اندر تھا یعنی چلتے پھرتے ایک داعی کا کردار ادا کرتی تھیں، کسی کا غم ہو یا خوشی امّی ان کے ساتھ ساتھ ہوتی تھیں۔ اُن

کے اندر ایک تحریک تھی جوان کو ہر وقت متحرک رکھتی تھی ۔ کیسے ہی حالات ہوں صحت اجازت دے یا نہ دے ان کی دین کو پھیلانے کی تڑپ چین سے بیٹھنے نہ دیتی تھی اپنے وقت کو ضائع نہیں کرتی تھیں اور ہم سب کو بھی اس کی تلقین کرتی تھیں کبھی فارغ نہ رہنے دیتیں۔ اپنے آخری وقت تک امّی اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے میں مصروف رہیں جو امانت ان کے ذمہ تھی یعنی فریضہ اقامت دین، اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا سے بحسن وخوبی پورا کرنے کی کوشش کرتی رہیں''۔

بیٹے مجاہد نبی کہتے ہیں کہ: ''وہ نہ صرف میری ماں تھیں بلکہ وہ ایک عظیم ہستی تھیں۔ امّی کا پورا خاندان یعنی ان کا سسرال، ان کے بہن، بھائی ان کی خالائیں، رشتے میں ان سے چھوٹے بڑے تمام لوگ ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ وہ چھوٹی ہو کر بھی بہت بڑی تھیں ۔ امّی آخری وقت تک اپنے گھر کی مکمل منتظم رہیں ۔ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ میری امّی ایک بہترین ماں، بہترین بیوی، بہترین ساس، بہترین سمدھن، بہترین منتظم، رشتوں کے تقدس کا خیال رکھنے والی، بہترین مُدرّسہ، بہترین ادیبہ، شاعرہ، بہترین مقررّہ، بہترین تنظیمی صلاحیتوں کی حامل، انشاء پرداز اور ہمہ گیر صلاحیتوں کی حامل خاتون تھیں ۔

ان کے انتقال کے وقت ہر ایک کے یہی احساسات تھے کہ عذرا جمال مجھ سے زیادہ قریب تھیں، ان کے جانے کے بعد پورا خاندان ان کی کمی کو محسوس کرتا ہے، جماعتِ اسلامی بھی ان کی کمی کو محسوس کرتی رہے گی''۔

ان کی بہو مریم مجاہد کہتی ہیں ''جب میری شادی ہوئی تو میری عمر ۱۷ سال تھی، شادی کے تعلق سے عمومی خوشی کے ساتھ ساتھ روایتی تشویش بھی تھی کہ نہ جانے شوہر کیسے ہوں۔ ساس کس مزاج کی ہوں۔ لیکن شادی کے بعد میری ساس نے اسی طرح میرا ساتھ دیا جس طرح ایک ماں اپنی بیٹی کا ساتھ دیتی ہے۔ جہاں وہ مجھے اپنے بیٹے کی عادتوں سے آگاہ کرتی رہیں وہیں انہوں نے میرے شوہر کو بھی بار بار میرا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ وہ اپنی بڑی بہو کا بھی اسی طرح خیال رکھتی تھیں ۔ کبھی ان کی کوئی برائی مجھ سے نہ کی اور نہ ہی میری کوتاہیوں کا تذکرہ کسی اور سے کیا۔

میں امّی کے معمولات دیکھ کر بہت متاثر ہوتی تھی، وہ ابو کا بھی خیال رکھتی تھیں ۔ اپنے بچّوں کا، میرا اور میرے بچّوں کا بھی ہم سب کا خیال رکھتی تھیں اور ہر ایک کے تمام معاملات

میں تعاون کرتی تھیں۔ مہمانداری بھی احسن طریقے سے کرتی تھیں۔ تمام نمازوں کی پابندی کی بچّوں کو تلقین کرنا اور میری بھی اسی انداز میں تربیت کرنا ان کی عادت تھی، کبھی کسی کی غیبت کرنا پسند نہیں کیا۔ پھر درس وتدریس کی تمام مصروفیات اس کے ساتھ تھیں۔ مل جُل کر کام کرنے کو پسند کرتی تھیں، گھر کے کاموں کے معاملے میں کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ مجھے کون سا کام لازماً کرنا ہے۔ اتنی احتیاط سے میری تربیت کی کہ مجھے خود ہی اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا چلا گیا۔ ان کی بے لوث محبت کی وجہ سے میں ان کے قریب ہوتی چلی گئی''۔

بڑی بہو صولت جبیں آپ کے بارے میں کہتی ہیں کہ ''وہ ایک پُرعزم اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ پڑھنا پڑھانا اور لوگوں کو صحیح معنوں میں قرآن کی دعوت دینا ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ میری نظر میں ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا اخلاق تھا۔ ہنستے، شاداب چہرے کے ساتھ لوگوں سے ملتی تھیں۔ حریم ادب کے حوالے سے میں نے خود ان کو سارا دن تگ ودو کرتے ہوئے دیکھا۔ صبح سے نکل کر ایک ایک فرد کو لے کر آنا ان ہی کی ہمت تھی۔ میں اکثر ان سے کہتی تھی کہ آپ شرکا کے نخرے کیوں اُٹھاتی ہیں۔ لیکن انہیں بس کام کی لگن تھی۔ معاشرے سے بُرائیاں ختم کرنے اور لوگوں کو اچھائی کی طرف بُلانے کا جنون تھا۔ وہ کبھی تھکتی نہیں تھیں۔ میرا ان سے کیسا تعلق تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کسی پروگرام میں ایک خاتون نے ہم دونوں کو آپس میں بات چیت کرتے دیکھا اور پھر پوچھا کہ ''یہ آپ کی بیٹی ہیں؟'' امّی نے مجھے گلے لگا کر کہا ''ہاں یہ میری بیٹی ہے''۔ آپس کے تعلقات میں اس بات کا خیال رکھتی تھیں کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ میکے اور سُسرال کا ہر رشتہ احسن طریقے سے نبھایا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے''۔

دعوتی وسعت:

عذرا آپا کی دعوت کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا جس میں تمام خواتین، بچّے شامل تھے۔ وہ جس بہو پر کام کرتیں اس کی ساس سے دوستی کر لیتیں اور جس ساس پر کام کرتیں اس کی بہو، بیٹیوں پر خاص توجہ دیتیں، دعوت کے نتیجے میں افراد کو متعین کر کے ان پر کام کرتیں پھر انہیں جماعت کا حِصّہ بنا دیتیں۔ ایک مستقل دعوتی سرگرمی یہ تھی کہ گھر میں نئی دلہنوں کی دعوت رکھی

جاتی اور دعوت کے اس ماحول میں ہلکے پُھلکے پروگرامات کے ذریعے گھر کو برتنے کا سلیقہ، بہوؤں اور ساس کے آپس میں کیسے تعلقات ہوں؟ اور شوہر کے ساتھ کامیاب زندگی گزارنے کے اُصول بتائے جاتے۔ اس پروگرام کا مقصد کردار سازی کرنا اور ان افراد کو متعین بنانا تھا۔ اس وقت جماعت اسلامی میں متعین افراد کی اصطلاح عام نہ تھی مگر انہوں نے اس کی بنیاد رکھی۔ اس دعوت میں موقع کی مناسبت سے تحائف تقسیم کیے جاتے۔ جہاں تحائف دینا سُنت نبوی ﷺ ہے وہیں دعوت کے میدان میں لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کا آسان نسخہ بھی ہے۔ آپا جی نے تمام عمر بہت خلوص کے ساتھ تحائف دینے کا اہتمام کیا۔ اتنی زیادہ تعداد میں تحائف خریدنا چونکہ ممکن نہیں تھا، اسی لیے وہ کتابوں اور قرآن پاک ہدیہ کرنے کے علاوہ اپنے ہاتھ سے چیزیں تیار کر کے تحفے میں دیتیں۔ جن میں بچّوں کے سوئیٹر، فراکیں، تلّے دانی۔ کنگھا دان، بٹوے، جزدان، کڑھے ہوئے رومال وغیرہ شامل ہوتے۔ آپا جی قرآن اور کتابوں پر اپنے خوبصورت انداز میں دعائیں ضرور لکھ کر دیتیں۔ غرضیکہ انہوں نے دعوت کے میدان میں اپنے ہنر کا خوب استعمال کیا۔

سابق نگراں بیٹھک اسکول طیبہ عاطف صاحبہ نے بتایا کہ ''وہ انتہائی دوستانہ برتاؤ کے ساتھ اپنی تربیت کے گہرے اثرات چھوڑ جاتیں۔ وہ اقامت دین کے کام کو شوق اور محبت کے ساتھ پُرسکون انداز میں کرتی تھیں اور کبھی ماتھے پر بل نہ آنے دیتی تھیں۔ جس گھر میں ملاقات کے لیے جاتیں وہاں موجود بزرگ خواتین سے ملاقات کے لیے علیحدہ وقت کی گنجائش نکالا کرتیں تاکہ ان سے بھی ایک تعلق بن جائے اور ان کی بھی ذہن سازی ہو سکے وہ ایک مثالی مُدرّسہ تھیں۔ ان کے دروس سامعین کو غور وفکر کی دعوت دیتے اور گہرا اثر چھوڑتے تھے۔

تحریکی کارکن ثمینہ برکاتی بتاتی ہیں کہ آج بھی ان کی شبیہ یادوں کے دریچے پر اُبھرتی ہے دعوتی کاموں کا پُرجوش جذبہ لیے وسائل کی کمی اور سہولیات کی عدم دستیابی کے باوجود اکثر امّی سے ملنے اور کبھی ان کو ساتھ لے کر ملاقاتیں کرنے کے لیے ہمارے گھر آیا کرتی تھیں۔ وہ جب بھی آتیں مجھ سے ضرور ملاقات کرتیں، میں اس وقت آٹھویں کلاس میں زیرِ تعلیم تھی۔ انھوں نے میرے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو ڈھونڈا اور اُبھارا، مجھے نور میں کہانیاں لکھنے پر اُکسایا۔ پھر

درسِ حدیث دینے کے لیے تیار کیا۔ سیاسی کاموں کی اہمیت سمجھا کر پولنگ ایجنٹ بننے پر تیار کیا، ان کی حوصلہ افزائی مجھے ہر کام کے لیے تیار کرتی چلی گئی۔

برادریوں میں دعوت:

ایک اہم کاوش میمن برادری اور آغا خانیوں میں دعوتی کام کرنا تھی، جہاں ملاقاتوں کے ذریعے ہمدردانہ اور قریبی تعلقات استوار کیے۔ اپنے مدرسے میں آغا خانیوں کو آنے کی دعوت دی۔ جب آغا خانی بچّیاں قرآن پڑھنے لگیں تو ان کی مائیں بھی دلچسپی ظاہر کرنے لگیں۔ اس جانفشانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی آغا خانی گھرانے مسلمان ہوگئے۔ ایسے وقت میں ان کی خوشی دیدنی ہوتی۔ تشکر کے جذبات کے ساتھ ان لوگوں کو گلے لگاتیں۔

اندرون سندھ دعوت:

آپا جی نے اندرون سندھ بھی دعوت کا کام کیا۔ خواتین کے ساتھ دور دراز کے گاؤں میں دو روزہ دعوتی دوروں پر جاتیں اور قیام کے دوران عورتوں کو دین کے ابتدائی علم سے لے کر بنیادی احکامات تک ذہن نشین کروائے جاتے۔

مہمانداری:

جس دوران آپا جی دعوتی دوروں پر جایا کرتی تھیں، ان کی ملاقات اس وقت نوابشاہ میں مقیم ایک خاتون تسنیم صاحبہ سے ہوئی جو جلد دوستی میں بدل گئی۔ اس تعلق کے متعلق مزید تسنیم صاحبہ کی زبانی سنیے: ''عذرا جمال سے میری ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ ان دِنوں میرے شوہر بیمار اور بے روزگار تھے۔ ہم سخت آزمائشی حالات سے گزر رہے تھے۔ ایسے میں عذرا جمال نے مجھے بہن کا درجہ دیا۔ انہوں نے مجھے نوابشاہ سے کراچی آنے کا مشورہ دیا کچھ پس و پیش کے بعد میرے شوہر آمادہ ہوگئے تو قیام کے لیے جگہ کا مسئلہ درپیش تھا۔ آپا جی نے بصد اصرار ہمیں اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ ۱۲۰ گز کے مکان میں ہم دونوں میاں بیوی اپنے ۵ بچّوں سمیت رہتے۔ عذرا آپا کے گھر کے ۷ افراد اور ان کی بیوہ بہن اپنے دو بچّوں کے ساتھ مقیم تھیں۔ لیکن کبھی اہل خانہ کی پیشانی پر بل نہیں دیکھے۔ اُن کے شوہر شام کو آفس سے گھر لوٹتے تو ساتھ موجود تھیلی میں دس پُڑیاں ہوتیں۔ جس میں کھانے کی چیزیں ہوتیں۔ وہ آتے ہی بچّوں کو اپنے گرد جمع کر لیتے اور پیار

کرتے پھر پُڑیاں برابر تقسیم کر دیتے۔

اُن کی محدود آمدنی میں نہ صرف ہم سب مِل جُل کر کھاتے پیتے بلکہ روز ہی کوئی مہمان موجود ہوتا جسے کھانا کھلائے بغیر جانے نہ دیا جاتا۔ اُن کے گھر کی شاندار روایات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جو حاضر و موجود ہے اس پر شُکر کیا جائے اور کسی کو دستر خوان پر بٹھائے بغیر لوٹایا نہ جائے۔ گھر میں آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ جب بچّے قرآن پڑھنے آتے تو ساتھ ان کی مائیں بھی آ جاتیں۔ رشتہ دار اکثر آتے اور رُک بھی جاتے۔ ایک جانب ہنس مُکھ عذرا آپا آنے والوں سے گفتگو، تربیتی اُمور انجام دیتیں، لوگوں کے مسئلے سُن کر حل پیش کرتیں۔ دوسری جانب درس دینا، اعانتیں جمع کرنا، رسالے تقسیم کرنا، کُتب فروخت کرنا، رپورٹس کی تیاری، مطالعہ کرنا اور کروانا، سارے کام مشینی انداز میں مسلسل اور روزانہ کی بنیاد پر ہوتے۔ لیکن کبھی تساہل و اُکتاہٹ کی ہلکی سی جھلک نہیں دیکھی۔ میں کم و بیش ایک ماہ ان کے گھر قیام پذیر رہی اور میرا مشاہدہ اور تجربہ آج بھی میرے ایمان کو مضبوط کرتا ہے۔ ان کی مغفرت کے لیے ہمارا پورا خاندان دعا گو رہتا ہے اور انہیں یاد کر کے ہم آبدیدہ ہو جاتے ہیں''۔

عذرا آپا کے ساتھ رہنے والا ہر شخص گواہ ہے کہ انہوں نے شفقت، محبت، اخلاص، رب کی رضا اور آخرت کو محور بنایا۔ وہ اپنے قول و فعل کے ذریعے اس بات کی تذکیر کرتی رہتی تھیں کہ یہاں آرام کرنے نہیں آئے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی میں ایک مسلسل جاری تحریک نظر آتی ہے۔

تربیتی میدان:

اپنے کارکنان کی تربیت میں بھی انہوں نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی۔ وہ تحریک کے کارکنان کی قرآن سے تعلق استوار کروانے کی خواہاں تھیں۔ ہفتہ وار کارکن سازی کلاس میں ایک آیت دی جاتی جس کی ہر فرد لٹریچر اور قرآن سے تیاری کرتا تھا۔ اس تیاری کے دوران ہر کارکن قرآن، حدیث اور لٹریچر کا مطالعہ کرتا تھا اور ساتھ آپ کی رہنمائی بھی ہمہ وقت شامل ہوا کرتی۔ اگلی کلاس میں فرداً فرداً سب کو ڈسکشن میں اس آیت پر بات کرنی ہوتی۔ اس پورے عمل کے نتیجے میں علم میں اضافہ، بات کرنے کا سلیقہ، دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کا ڈھنگ افراد میں پیدا ہوتا۔

حمیدہ صاحبہ قرآن انسٹیٹیوٹ میں معلّمہ کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ

''میں نے قرآن کی تعلیم کا آغاز عذرا آپا سے کیا۔ ہمارا گھرانہ شروع سے دینی تھا۔ میں اپنی امّی کے ساتھ اکثر آپا جی کے درس میں شرکت کرتی تھی پھر جب انہوں نے لڑکیوں کے لیے کلاس کا انتظام کیا تو مجھے اس کی ناظمہ بنایا۔ میں نے ان سے لفظی ترجمہ و تفسیر پڑھا جس کے نوٹس آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ وہ نہایت شفیق اور بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ ایک اُستاد کی تمام خوبیاں ان میں یکجا تھیں''۔

تنظیمی ذمہ داریاں:

مختلف ادوار میں مختلف ذمہ داریوں کو نبھاتی رہیں۔ ایک طویل عرصہ ضلع وسطی کراچی کی نظامت کی ذمہ داری ادا کی، جس میں توجہ نئے نئے حلقہ بنانے اور کام کو وسعت دینے پر مرکوز رہتی تھی۔ اس وقت خواتین کے لیے ایک ہُڈ والی سوزوکی آیا کرتی تھی جس میں چڑھنا خواتین کے لیے بہت مشکل ہوتا تھا۔ انہوں نے اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے مردانہ نظم سے مستقل اصرار کیا اور اس کے بعد خواتین کے لیے سوزوکی ہائی روف آنی شروع ہوئی۔ حجاب کے ساتھ کام میں آسانی پیدا کرنے کے لیے آپ نے سب سے پہلے خود جرسی کا کپڑا لا کر اس کا نقاب سیا اور پہنا اور بعد میں اس کا رواج ہوتا چلا گیا۔

مرکزی شوریٰ کی رکن اور صوبہ سندھ کی ٹیم میں بھی شامل رہیں۔ چہرے پر شفیق مسکراہٹ سامنے والے کو بات کہنے کا حوصلہ دیتی تھیں۔ بسا اوقات آراء میں اختلاف بھی ہو جاتا لیکن اس سے تعلقات کو متاثر نہ ہونے دیتیں اور دوسروں کے راز کی انتہائی حفاظت کرتیں۔

قلمی جہاد:

لکھنے پڑھنے کا ذوق فطری طور پر موجود تھا۔ قوم کے عقائد و اخلاق کو تباہ کرنے والے ادب کے خلاف وہ اپنی مثبت تحریروں کے ذریعے جہاد میں مصروف رہا کرتیں۔ خود بھی مستقل لکھتیں اور جس میں اس کی صلاحیت دیکھتیں اسے بھی لکھنے پر راغب کرتیں۔ جب ''حریم ادب'' کی ذمہ داری دے دی گئی تو اس ضمن میں آپ کی لگن اور بھی بڑھ گئی۔ قلمکار خواتین کی تلاش اور انھیں اس پلیٹ فارم پر جوڑنے کے لیے از حد محنت کی۔ حریم ادب کی پُرانی لکھاری حمیرا عبید اس ضمن میں ان کی محنت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتی ہیں کہ'' مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

جب وہ پہلی دفعہ مجھے حریم ادب کی نشست کی دعوت دینے آئیں تو میں نے بہت حیلے بہانے کیے کہ ابھی بچّہ بہت چھوٹا ہے وغیرہ لیکن انھوں نے ایک نہ سُنی اور کہا کہ اگلی دفعہ جب میں آؤں گی تو آپ کو لازماً میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ دورانِ ملاقات اکثر اپنے ہاتھ سے سلے ہوئے کپڑے تحفے میں دیا کرتیں۔ چند ہی مہینوں میں ہمیں ان کی محبت نے اس طرح اسیر کر لیا کہ حریم ادب کی نشستوں کا انتظار رہنے لگا۔ ایک دفعہ انھوں نے تیز بُخار کی حالت میں مجھے بُلایا۔ میں گئی تو دیکھا بُخار کی حِدّت سے ان کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا لیکن وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھیں۔ مجھ سے کہنے لگیں بیٹا آج ادبی نشست میں نہیں جا سکوں گی تم یہ نشست کروالینا اور میرا یہ مضمون وہاں پڑھوا لینا۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ آٹھ دس صفحات کا لیکچر انھوں نے کئی ضخیم کتابوں اور مُختلف حوالہ جات کے ساتھ شدید بُخار کی حالت میں تیار کیا تھا۔ انھیں فکر تھی تو اس بات کی کہ دین کی دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائی جا سکے اس کے لیے جس قدر مواقع میسر آئے، انھوں نے اس سے بھرپور فائدہ اُٹھایا یہاں تک کہ جب چھیاسٹھ سال کی عمر میں انھیں مختلف جسمانی تکالیف نے گھیر لیا تھا اور دوسرے لوگ ان کے لیے فکر مند ہو جاتے تھے تو وہ ہمیشہ شُکر الحمدللہ کہتیں کہ اسی نے مجھے کھڑا کیا ہوا ہے جس کا میں کام کرتی ہوں"۔

رُکن جماعت محترمہ حمیرا رفیع صاحبہ بتاتی ہیں کہ وہ نئی نسل کے قلمکاروں کو حریم ادب کی محفل میں شریک کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتیں۔ انھیں شریک کرنے کے لیے ان کی ساس، نندوں سے دوستی کر لیتیں تاکہ اجازت لینے کا مرحلہ آسان ہو جائے۔ اپنی ذمہ داری پہ شرکا کو گھر سے لے کر جاتیں اور پھر خود گھر واپس لا کر چھوڑتیں۔ ان کے چہرے پہ ہر وقت ایک شفیق سی مسکراہٹ موجود رہتی۔ بیٹا کہہ کر جب سامنے والی کو قلمی جہاد پر آمادہ کرتیں اور حریم ادب کی محفل میں شرکت کے لیے کہتیں تو ان کی بات مانے بغیر چارہ نہیں رہتا تھا۔ خود بھی اپنی تحریر پیش کرتیں جس میں کسی نہ کسی مثبت سوچ کو موثر انداز میں پیش کیا جاتا۔"

اعلیٰ اخلاق:

بڑوں کے ادب و احترام میں پیش پیش رہتی تھیں۔ مختلف اوقات میں سفر کے دوران اپنی ٹانگوں کی سوجن کے باوجود وہ اپنے بزرگ افراد کی خاطر تواضع میں مصروف رہتی تھیں اور ان

سے نہایت احترام سے پیش آتیں۔

خوش اخلاقی و خوش گفتاری ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ مسکراتے چہرے کیساتھ نئے آنے والوں سے اس طرح مِلتیں اور ان میں اس طرح گھل مِل جاتیں کہ لگتا برسوں کی وابستگی ہے۔ اس وجہ سے لوگ ان سے اپنے مسائل بلا جھجک بیان کرتے اور ان سے مشورہ لیا کرتے۔

حاجت مندوں کی تالیف قلب کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتیں اور ان کی مدد کے لیے ہمیشہ مستعد رہتیں۔ اللہ کے مجبور بندوں کی مدد کر کے اور ان سے قریب ہو کر دراصل وہ اللہ سے قریب ہونے کا سامان کیا کرتی تھیں۔

اختتامِ زندگی:

یہ اَنتھک کارکن دمِ رُخصتی بھی نماز پڑھ کر فون پر کسی سے گفتگو کر رہی تھیں۔ طبیعت خراب محسوس ہوئی تو خود چل کر گاڑی میں بیٹھیں اور اسپتال پہنچیں۔ شدید ہارٹ اٹیک کے باوجود نقاب چہرے سے الگ کرنے پر آمادہ نہیں ہوئیں۔ علاج جاری رہا لیکن اپنے رب سے ملاقات کی متمنی چہرے پہ ابدی مسکراہٹ سجائے رُخصت ہو گئیں۔ گو کہ عذرا آپا اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی میں ان کی قائم کی ہوئی روایات ہمیشہ سب کے دلوں میں زندہ رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت کرے اور اُن سے راضی ہو۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ماخذات

۱۔ مجاہد نبی صاحب۔۔۔بیٹے ۲۔ انجم خالق صاحبہ۔۔بیٹی
۳۔ شاہینہ احمد صاحبہ۔۔۔بیٹی ۴۔ شبانہ صادق صاحبہ۔۔بیٹی
۵۔ مریم مجاہد: صاحبہ۔۔بہو ۶۔ صولت جبیں صاحبہ۔۔بہو
۷۔ تسنیم صاحبہ۔۔کارکن جماعت اسلامی ۸۔ ثمینہ برکاتی صاحبہ۔۔۔کارکن جماعت اسلامی
۹۔ طیبہ عاطف صاحبہ۔۔رکن جماعت اسلامی ۱۰۔ حمیرا عبید صاحبہ۔۔۔ممبر حریم ادب
۱۱۔ حمیرا رفیع صاحبہ۔۔رکن جماعت اسلامی ۱۲۔ عقیلہ اظہر صاحبہ۔۔۔ممبر حریم ادب

&

فیض النساء

۱۹۳۷ء تا ۲۰۱۱ء

)

4

جیل میں قیدی خواتین کے آپس میں بہت لڑائی جھگڑے ہوتے تھے، لیکن جب فیض آپا وہاں باقاعدگی سے پروگرام کرنے کے لیے جانے لگیں تو خود جیل کے ذمہ داران نے اعتراف کیا کہ آپ کے آنے سے ان کے رویوں میں بہتری آئی ہے اور لڑائی جھگڑے بھی کم ہو گئے ہیں۔

اللہ پر توکّل نے آپ کے اندر بَلا کا اعتماد پیدا کر دیا تھا، بعض مرتبہ اس ذمہ داری کو نبھانے میں مشکل مراحل سے بھی گزرنا پڑتا تھا، لیکن آپ باآسانی اس سے گزر جاتی تھیں۔ خواہ ایس پی سے ملاقات کرنی ہو، وکیل سے بحث ومباحثہ کرنا ہو یا موکّل کے گھر سے سامان اٹھانا ہو، آپ انتہائی جرأت سے تمام کام کر گزرتی تھیں۔ آپ کی قوتِ فیصلہ بہت مضبوط تھی اور آپ فیصلے کے بعد اس پر فوری عملدرآمد کی قائل تھیں۔

4

شہر کے وسط میں موجود الحمرا گارڈن اپنی وسعت کے باوجود اس وقت تہی دامانی کا شکار لگ رہا تھا سہ روزہ سیرت کانفرنس کا پہلا دن تھا خواتین جوق در جوق اس میں شرکت کے لیے پہنچ رہی تھیں ان کے استقبال کے لیے ایک دبلی پتلی خاتون صاف رنگت ،لال بال، کلف لگی ساڑی کے پلو سے سر کو ڈھانپے دلآویز مسکراہٹ لیے موجود تھیں۔کبھی مہمانوں کا استقبال کر کے ان کی نشستوں کی طرف رہنمائی کرتیں اور کبھی کانفرنس کے باقی انتظامات پر توجہ دیتیں۔ابھی آدھا دن گزرا ہوگا کہ اس ذمہ دار خاتون کو والدہ کے انتقال کی افسوسناک خبر سننے کو ملی۔اس خبر کو صبر کے ساتھ سنتے اور دیگر ساتھیوں کو ہدایات دیتے ہوئے یہ خاتون اپنے گھر روانہ ہوئیں ۔اگلا دن طلوع ہوا تو وہ خاتون پھر اپنی ذمہ داری پر موجود تھیں۔شرکاء حیران تھیں کہ اتنے بڑے صدمے کے باوجود بھی ایسی فرض شناسی؟ اپنے ذاتی غم کو اصلاح امّت کے بڑے غم میں گُم کر کے فرض کی ادائیگی میں منہمک یہ مجاہدہ فیض النساء صاحبہ تھیں جو اپنی پوری زندگی زمانے کے لیے فیض کا سبب بنی رہیں۔

ابتدائی تعارف:

۱۹۳۷ء میں حیدرآباد دکن میں آنکھ کھولنے والی فیض آپا کی والدہ ایک گھریلو خاتون اور والد وکیل تھے ابھی میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی کہ والد نے اس زمانے کے رواج کے مطابق دس سال کی عمر میں ان کی شادی اپنے بھتیجے سے کر دی۔اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے کراچی آ گئیں اور پھر یہیں مقیم رہیں ۔اللہ نے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں سے نوازا جن میں سے ایک بچہ کمسنی میں ہی انتقال ہو گیا۔بڑی بیٹی کا رشتہ بھی ان کے شوہر نے کم عمری میں ہی طے کر دیا۔بڑی بیٹی ہونے کے ناطے اس سے گہرا لگاؤ تھا۔شادی کے بعد ابتدائی زمانہ میں اس کے گھریلو حالات میں سختیاں اور اُلجھنیں پیش آئیں تو ازحد دل گرفتہ رہنے لگیں۔اپنے غم کو سمیٹنے کے لیے کسی ذریعہ کی تلاش میں قریب واقع امی جی کے مدرسہ جا پہنچیں جہاں آنے والے قرآن کی نعمت سے جھولیاں بھر کر لے جاتے تھے۔اپنی ذات کا ایک چھوٹا غم لے کر وہاں گئی تھیں اور امّت کی حالتِ زوال کا بڑا غم لے کر واپس پلٹیں۔دل کا سوز قرآن کے سوز سے اس طرح ہم آہنگ ہوا کہ قرآن ہی آپ کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔پہلے قرآن سیکھا اور پھر قرآن

سکھانے کے لیے کوشاں ہو گئیں ۔اگرچہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث گھر کی کل ذمہ داریاں آپ کے سپرد تھیں ۔دمہ کی مریضہ بھی تھیں اور ہر سال نمونیہ کا شکار ہو جاتی تھیں۔برص کے باعث آپ کی جلد بھی بے حد حساس تھی ،لیکن ان میں سے کوئی عذر بھی آپ کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکا۔ بہت سوچ سمجھ کر جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی تو پھر استقامت کے ساتھ ہر حال میں قدموں کو جمائے رکھا۔

مستعد سپاہی:

فیض آپا ذمہ داری اور فرض کی ادائیگی میں اپنے آپ کو سراپا وقف کر دیتی تھیں۔جس کے باعث اکثر اہم کاموں کے لیے نظم کی جانب سے ان کا نام تجویز کیا جاتا۔ان کا یقین واعتماد، معاملہ فہمی اور استقامت ہر کام کو آسان بنا دیتی ۔تحریک نے مختلف سطحوں کی نظامت ان کے سپرد کی ،شوراؤں میں ان کی مشاورت سے فائدہ اُٹھایا، جامعۃ المحصنات کراچی کی نگران بنائی گئیں۔قرآن انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹر کی ذمہ داری سپرد کر دی گئی اور کبھی لیگل ایڈ کے شعبہ میں ذمہ دار بنا دیا گیا۔انہوں نے ایک مستعد سپاہی کی طرح ہر مورچہ کو اپنی ذات سے مضبوط بنایا۔ وقت کے کم اور کام کے زیادہ ہونے کے احساس نے ان کے اندر پھرتی پیدا کر دی تھی، گھر اور بچوں کے کاموں کو اس طرح سمیٹتیں کہ گاڑی کے آنے سے پانچ منٹ پہلے ہی تیار ہوتیں۔ ان کے دل میں یہ خیال راسخ تھا کہ جماعت کی گاڑیاں اور ان کے اوقات بھی امانت ہیں جنہیں ضائع نہیں ہونا چاہیے۔اس ضمن میں وہ اتنی حساس تھیں کہ اگر کوئی بہن کام مکمل نہ ہونے کے باعث چند منٹ گھر پر گاڑی رکوا لیتی تو اس کو بھی سمجھایا کرتیں۔ان کی کارکردگی وسائل سے مشروط نہیں تھی۔گاڑی نہ ہونے کے زمانے میں پیدل، بسوں، رکشوں اور ٹیکسیوں کے ذریعہ شہادتِ حق کے فریضے کو خوب خوب ادا کیا۔جس زمانہ میں جماعت اسلامی میں شامل ہوئیں اس دور میں مرد و عورت کارکن کی نشانی اس کے ہمراہ کتابوں کا تھیلا ہوتا تھا یہ تھیلا سنبھالے ہوئے وہ بسوں میں بھی چڑھتیں اور مختلف اسکولوں میں جا کر اساتذہ و طالبات کو کتب فراہم کرتیں اگرچہ ان کا وزن کبھی بھی ایک سو دس پونڈ سے زیادہ نہ رہا تھا، اور جِلد کی حساسیت اور برص، دھوپ سے بچاؤ کا مطالبہ کرتی تھی۔

عائلی زندگی:

وہ اکثر قائداعظم کے اس قول کو دہرایا کرتیں کہ ’’کام، کام اور کام‘‘ خود ان کی پوری زندگی اسی قول کے مطابق گزری۔ تھکن اور سستی تو جیسے انہیں چھو کر نہیں گزری تھی۔ بجلی کی سی تیزی سے اپنے کام اس طرح نمٹاتی تھیں کہ دیکھنے والی حیران رہ جاتی۔ سلیقہ و نفاست پہننے، اوڑھنے، نشست و برخواست اور گھر کے کونے کونے سے ٹپکا پڑتا۔ بہترین منتظم تھیں۔ کپڑے ہمیشہ کلف لگا کر پہنتیں جو عموماً ساڑھی پر مشتمل ہوتے تھے۔ گھر میں کلف لگاتیں اور کپڑے اس طرح تہہ کرتیں کہ استری کی ضرورت نہ پڑے۔ گرد بالکل برداشت نہ تھی ماسی کے آنے میں دیر ہوتی تو خود ہی اس کے حصے کا کام بھی نمٹا دیتیں۔ سلائی کڑھائی پر مکمل عبور تھا سارے کاموں کے ساتھ ساتھ یہ مصروفیت بھی جاری رہتی۔ پان کھانے کی شوقین تھیں لیکن اس شوق میں بھی حد درجہ سلیقہ برتتی تھیں۔ ان کے فرائض کی ابتدا گھر والوں سے ہوتی تھی۔ شوہر اس کام میں ان کے معاون تھے وہ شوگر کے مریض تھے جس کے باعث گردوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا آخر میں جسم کا ایک حصہ فالج کا شکار ہو گیا تو فیض آپا سراپا خدمت بن گئیں۔ تین سال ان کی مکمل دیکھ بھال میں مصروف رہیں۔ شوہر کی ملازمت ختم ہو جانے کے باعث مالی مشکلات کا سامنا بھی رہا جسے صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا۔ شوہر کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی بھرپور نظر رکھی۔ بڑی بیٹی کے اوپر تلے بچوں کی مصروفیات نبھانے میں مشکلات کے باعث اس کی مدد کے خیال سے بڑی نواسی کو اپنے گھر لے آئیں اور پندرہ سال تک وہ ان کے زیر سایہ رہی۔ حرا کہتی ہے کہ ’’میں نے ہمیشہ اپنی نانی کو کتابیں پڑھتے اور خاندان کے مسائل حل کرتے ہوئے پایا‘‘۔ دیور کی بیٹی اسکول میں پڑھاتی تھی اسے بھی اپنے ہمراہ رکھا اور پھر خود ہی اس کی شادی کی۔ جب بیٹے کی شادی کی تو بہو میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھی انہوں نے اس کی بقیہ پڑھائی اور ہاؤس جاب میں مکمل تعاون فراہم کیا بلکہ پوتی کی پیدائش کے بعد اس کی ذمہ داری بھی خود نبھائی۔ اپنے بچوں کو ہمیشہ سمجھاتی تھیں کہ ’’ہمیں اللہ نے اس لیے بنایا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں‘‘ اس بات کی نصیحت بھی کرتی رہتی تھیں کہ ’’جو کچھ تمہارے پاس ہے اس پر رب کے شکر گزار رہو‘‘۔

تعلقات کی پاسداری:

رشتہ داریاں اور دوستیاں نبھانے میں وہ اپنی مثال آپ تھیں خاندان کی بچیوں کی شادیوں پر اپنے ہاتھوں سے قرآن پاک کا خوبصورت جزدان تیار کر کے تحفے میں دیتیں۔ جہاں جس کو جس طرح کی مدد کی ضرورت پڑتی اس کے ساتھ تعاون کے لیے تیار رہتیں۔ بہن کی پوتی کو کینسر ہو گیا تو اس کا غم اپنے اوپر طاری کر لیا حالانکہ آپ خود اس وقت بہت بیمار تھیں، روزانہ اس کی عیادت کو جاتیں یا فون کرتیں۔ پانی پڑھ کر اسے بھجواتیں۔ جب گھر والوں نے اس کے لیے دعا کی محفل رکھی تو بیماری کے باوجود شرکت کی اور بچی کو اپنی گود میں بٹھا کر اس طرح دلسوزی سے دعا کی کہ سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور بچی کو صحت یابی عطا کی۔

بچوں سے لگاؤ:

بچوں میں کام کو بے حد ضروری خیال کرتی تھیں اور بچوں کے ساتھ خوش رہتی تھیں قرآن انسٹیٹیوٹ کی ذمہ داری کے دوران سب سے پہلے ان ہی کی تجویز پر موسم گرما کی تعطیلات میں بچوں کے لیے سمر کورس کا آغاز کیا گیا۔ وہ نہ صرف اس کا منصوبہ بنانے والوں میں شامل تھیں بلکہ اس میں شرکت کے لیے بچیوں کو تیار بھی کرتی تھیں۔ خود کہتی تھیں کہ میرا بس نہیں چلتا کہ سارے بچوں کو اس میں اُٹھا کر لے آؤں۔ عمر کے آخری حصہ میں گھر پر خاندان کے بچوں کے لیے ہفتہ وار کلاس شروع کی تھی جس دن کلاس ہوتی وہ صبح ہی سے اس کی تیاری شروع کر دیتیں۔ بچوں کی پسند کی ڈشز بنواتیں۔ مختلف کوئز مقابلے کرواتیں جس کے بعد بچوں کو انعام دیتیں۔ اس دوران نہ انہیں کھانسی اُٹھتی نہ سانس تیز ہوتا۔ جس دن ان کا انتقال ہوا اس سے چار دن پہلے بھی بچوں کی کلاس لی تھی جب کراچی جماعت نے زبیر پبلک اسکول کے قیام کا منصوبہ بنایا تو اس میں بھی ان کا بے حد تعاون شامل رہا یہاں تک کہ ابتدائی دنوں میں وہ اسکول میں جھاڑو بھی دے لیتیں اور چھوٹے بچوں کو باتھ روم لے جانے میں بھی عار نہ سمجھتیں۔

بحیثیت رکن شوریٰ:

فیض آپا طویل عرصے تک کراچی شوریٰ کی رکن ہونے کی ذمہ داری نبھاتی رہیں۔ ان کے

اندر رکن شوریٰ کے فرائض کی ادائیگی کا جذبہ مجسم نظر آتا تھا۔ سابقہ ناظمہ کراچی دردانہ صدیقی صاحبہ بیان کرتی ہیں'' کہ میں نو آموز تھی وہ میری رہنمائی کرتی تھیں۔ انتہائی طبعیت کی خرابی کے باوجود ان کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ اجلاس سے غیر حاضر نہ ہوں۔ ہمیشہ بروقت اور کل وقتی شرکت کرتی تھیں۔ دلیل کے ساتھ اپنی رائے بناتی تھیں اور اعتماد کے ساتھ اسے پیش کرتی تھیں۔ ان کی رائے جماعت کی سابقہ و موجودہ روایات، انسانی نفسیات، فیصلے کے مستقبل پر اثرات غرض تمام ہی پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہوتی تھی۔ اللہ نے سوچنے اور سمجھنے کی بہترین صلاحیتیں عطا کی تھیں لہٰذا وہ ہر معاملہ میں اپنی ایک پختہ سوچ رکھتی تھیں اور کسی کی رائے سے یا اکثریت کی رائے سے متاثر ہوئے بغیر اسے سامنے لاتی تھیں۔ بے لاگ طریقہ سے احتساب بھی کرتی تھیں لیکن ساتھ ہی تمام بہنوں سے بے حد محبت بھی کرتی تھیں''۔

حسن انتظام:

ان کی دیرینہ ساتھی تحسین فاطمہ صاحبہ بیان کرتی ہیں کہ ان سے دوستی تو تھی لیکن زیادہ سمجھنے کا موقع اس وقت ملا جب ۱۹۷۷ء میں ان کے گھر پر ارکان کا سہ روزہ اجتماع ہوا۔ اجتماع کی تمام ضروریات کو انہوں نے بہترین طریقے سے پورا کیا پھر ان کی انتظامی صلاحیتیں بعد میں اور بڑی سطحوں کے اجتماعات میں کام آتی رہیں وقت سے پہلے کام کی تیاری ان کا امتیازی وصف تھا۔ کام کے جائزے اور آئندہ کی منصوبہ بندی میں انہیں طاق پایا۔ ساتھ کام کرنے والیاں ان کی ڈانٹ بھی سنتی رہتیں، لیکن پھر ان پر پیار بھی انڈیلا جاتا تھا۔ قرآن فہمی کی کلاسز لینے کا سلسلہ انہوں نے ہمیشہ جاری رکھا اور کتنی ہی خواتین ان کلاسز کے ذریعے تحریک کا سرمایہ بنیں۔

امانت و دیانت:

امانت دیانت ان کی خاص صفت تھی۔ ہر طرح کے حسابات کے لیے الگ الگ بٹوے تیار کر رکھے تھے پوری ذمہ داری سے حساب کتاب کر کے متعلقہ مدات میں جمع کرا دیا کرتیں لوگ ان پر بے حد اعتماد کرتے اور انہیں انفاق فی سبیل اللہ کے لیے بڑی بڑی رقومات دیا کرتے۔ ہمیشہ یہی کہا کرتی تھیں کہ ''مال کا فتنہ بہت برا ہوتا ہے اس سے بچو''۔ اپنی زندگی میں ہی اپنی سب چیزیں بانٹ دی تھیں! اپنا زیور بیچ بیچ کر مختلف مواقع پر جماعت کے فنڈ میں ڈال دیتی تھیں۔

سیاسی جدوجہد:

جماعت اسلامی کو بلدیاتی ایوانوں میں خواتین کی نمائندگی کی جب بھی ضرورت محسوس ہوئی تو بھیجے جانے والے ناموں میں فیض آپا کا نام شامل رہا۔ مئیر افغانی صاحب کے دور میں سٹی کونسل میں تعلیمی کمیٹی کا ممبر ہونے کے ناطے اسکولز پر بے حد توجہ دی۔ جہاں ان کی انتظامی صورتحال بہتر بنانے کے لیے فکر مند رہیں، وہیں یہاں موجود ذہنوں کی اصلاح بھی پیشِ نظر رہی۔ تعلیم ان کے لیے انتہائی اہمیت کا معاملہ تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ یہ وہ بیج ہیں جن کی صحیح نگہداشت کی جائے تو مستقبل میں تناور درخت اور پھل مل سکتے ہیں۔ اسی اہمیت کے پیش نظر خود بھی اعزازی ٹیچر کی حیثیت سے اسکول میں خدمات انجام دیں۔ اسمبلی میں درس قرآن رکھتیں۔ ٹیچرز کے ساتھ ڈسکشن رکھے جاتے، انہیں صالح لٹریچر فراہم کیا جاتا۔ اپنی کونسلر شپ کے دوران انہوں نے اپنے ٹاؤن میں دعوتِ دین کے جذبہ کے تحت نمایاں مقامات پر مختلف آیات واحادیث پر مبنی ہورڈنگز بھی آویزاں کرائے۔ وہ ضیاء الحق کے دور میں بھی کونسلر رہیں اور جنرل پرویز مشرف کے دور میں بھی سٹی کونسلر کے فرائض سرانجام دیے۔

مشرف دور کی کونسلر شپ کی یادیں دہراتے ہوئے سٹی کونسل میں جماعت اسلامی کی خواتین کونسلرز کی سربراہی انجام دینے والی ریحانہ افروز صاحبہ بتاتی ہیں کہ'' مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب سٹی کونسل میں جانے والی تمام خواتین عائشہ باجی کے آفس میں جمع تھیں اور کسی ایک کو نگران بنائے جانے پر رائے لی جا رہی تھی تو فیض آپا نے میرا نام دیا اور پھر سب نے اس پر اتفاق کر لیا۔ میں نے پورا دور آپ کی رہنمائی کے ذریعہ گزارا۔ سٹی کونسل کے ہال میں ہمیشہ انہیں اپنی برابر کی نشست پر بٹھاتی تھی تاکہ مشاورت میں آسانی رہے جب پہلے ہی دن میرے پاس پرچی آئی کہ آج ایوان میں آپ کو تقریر کے ذریعہ خواتین کی نمائندگی کرنی ہوگی اور انہیں درپیش مسائل کو سامنے لانا ہوگا تو میں نے یہ پرچی فیض آپا کو پکڑائی۔ اس پر انہوں نے فوراً مشورہ دیا کہ خواتین نے اپنی بچت کی رقوم جن سرمایہ کار کمپنیز میں لگائی تھیں اور وہ انہیں لُوٹ کر فرار ہو گئے ہیں ان پر بات کروا ور میں نے اس وقت کے اس گرم موضوع کو ایوان میں اُٹھایا۔ کونسل میں خواتین کے بیٹھنے کے لیے ایک الگ ہال بھی بنا ہوا تھا جب ہم وہاں جمع ہوئے تو اطلاع ملی کہ خواتین کے لیے یہاں چائے بھجوائی جا رہی ہے اس پر فیض آپا نے فوراً اپنا بٹوہ

کھولا پیسے نکالے اور کہا کہ ’’مجھے تو ان پیسوں سے چائے منگوا دو میں یہ چائے نہیں پیؤں گی‘‘ یہی محتاط رویہ سوک سینٹر میں بھی دیکھنے میں آتا جب وہ ہم سب کو ہدایت کرتی تھیں کہ ’’جو کھانا پینا ہو وہ اپنے پیسوں سے منگواؤ، سرکاری رقم خرچ مت کرو‘‘۔ اور پھر ہم انہی سے چائے منگوانے کی فرمائش کرتے اور وہ ہمیں اپنے پیسوں سے چائے پلواتیں، ان کی موجودگی میں دل کو یہ اطمینان رہتا تھا کہ وہ اگر موجود ہیں تو کوئی غلط کام نہیں ہونے دیں گی! وہ ایوان کی بہت اچھی بولنے والیوں میں سے ایک تھیں۔ اگرچہ دمے کے دورے کے باعث انہیں اکثر ایمرجنسی میں ایوان سے باہر نکل کر جانا پڑتا تھا لیکن وہ کبھی ایوان سے غیر حاضر نہیں ہوتی تھیں‘‘۔

الیکشن کی تھکا دینے والی مہمات اور کراچی کی کشیدہ اور خوفناک سیاسی فضا میں پورے شعور اور علم و آگہی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو کماحقہٗ انجام دیا۔ انہوں نے اپنی دینی و سیاسی بصیرت سے خواتین کی کثیر تعداد کو دین و سیاست کی یکجائی کا شعور دیا۔ ۱۹۷۷ء میں تحریک نظام مصطفیٰؐ کی روح رواں رہیں۔ انتخابات کے زمانہ میں خواتین اور بچیوں کو جمع کر کے اپنے اپنے حصے کی ذمہ داری کی ادائیگی کی سمجھ دیتیں۔ اسلامی نظامِ حیات کے غلبہ کی بات قرآن و حدیث کی روشنی میں مدلّل انداز میں کرتیں اور جماعت کے نمائندگان کی تشہیر سے لے کر پولنگ کے دن کی صبر آزما اور مشکل ترین ذمہ داریاں بخوبی انجام دیتیں۔

قانونی رہنمائی کا میدان:

جماعت اسلامی نے جب خواتین کو قانونی رہنمائی دینے کے کام کے آغاز کے لیے شعبہ بنایا تو اس کی ذمہ داری کے لیے بھی فیض آپا ہی سب سے مناسب قرار پائیں۔ اگرچہ یہ میدان ان کے لیے بالکل نیا تھا لیکن اطاعت نظم میں اس کام کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور اپنی صلاحیتیں اس کام کے جمانے اور آگے بڑھانے میں لگا دیں۔ اس کام میں ان کی مددگار شگفتہ مشہود صاحبہ اس حوالے سے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ ’’فیض آپا ایک ہیرا تھیں جس کا ہر پہلو بڑی آب و تاب رکھتا تھا۔ جب ان کے ساتھ کام کیا تو ان کی شخصیت کے پہلو مجھ پر ظاہر ہوئے۔ اس ذمہ داری کے وقت ان کے قویٰ بڑھاپے سے مضمحل ہو چلے تھے لیکن ہم نے انہیں جوانوں سے زیادہ متحرک دیکھا۔ ان سے ملنے والا کوئی نیا فرد ان کی دبنگ اور با رعب شخصیت سے مرعوب ہو جاتا تھا لیکن قریب رہنے سے ان کی شخصیت کے منور گوشے متاثر

کن انداز میں سامنے آتے تھے۔ وہ انتہائی مستعدی کے ساتھ ہر ضروری کام کو فوراً کر دینے کی قائل تھیں ہم نے انہیں کبھی کسی کام کو ٹالتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آفس میں بے شمار قسم کے کاموں کو وہ بہت موثر انداز میں سرانجام دیتی نظر آتی تھیں۔ ایک طرف آفس کے انتظامی مسائل کو حل کر رہی ہیں، دوسری طرف موکلوں سے مل کر ان کے کیس پر بات کر رہی ہیں، تیسری طرف وکیلوں کے معاملات دیکھ رہی ہیں، پھر ساتھ ہی ساتھ مالی معاملات کی بھی نگرانی انجام دے رہی ہیں۔ سارے کاموں کو بہترین طریقے سے انجام دیا جبکہ اس وقت سٹی کونسلر کے فرائض بھی نبھا رہی تھیں۔ ہمارا آفس صدر کے علاقے میں تھا جہاں بے تحاشا فضائی آلودگی دمہ کے مریضوں کے لیے انتہائی نقصان دہ تھی لیکن اپنی اس بیماری کے باوجود وہ آفس آتیں۔ بیمار پڑ جاتیں تو ایک دو دن ناغہ کر لیتیں پھر طبیعت سنبھلتے ہی دوبارہ آ جاتیں جب بہت طبیعت خراب رہنے لگی تو پھر نظم نے انہیں یہاں سے ہٹا کر دوسری ذمہ داری دے دی۔ انہوں نے جیلوں میں جا کر قیدی خواتین کی اصلاح کا کام شروع کیا۔ اس کے لیے ہم نے باقاعدہ جیل کے ذمہ داران سے اجازت کا خط حاصل کیا تھا ہمارے جانے سے قبل وہاں قیدی خواتین کے آپس میں بہت لڑائی جھگڑے ہوتے تھے لیکن جب فیض آپا وہاں باقاعدگی سے پروگرام کرنے کے لیے جانے لگیں تو خود جیل کے ذمہ داران نے اعتراف کیا کہ ان کے آنے سے ان کے رویوں میں بہتری آئی ہے اور لڑائی جھگڑے بھی کم ہو گئے ہیں۔ اللہ پر توکل نے ان کے اندر بلا کا اعتماد پیدا کر دیا تھا، بعض مرتبہ اس ذمہ داری کو نبھانے میں مشکل مراحل سے بھی گزرنا پڑتا تھا لیکن وہ با آسانی اس سے گزر جاتی تھیں خواہ ایس پی سے ملاقات کرنی ہو، وکیل سے بحث و مباحثہ کرنا ہو یا موکل کے گھر سے سامان اُٹھانا ہو وہ انتہائی جرات سے تمام کام کر گزرتی تھیں۔ ان کی قوت فیصلہ بہت مضبوط تھی اور فیصلے کے بعد اس پر فوری عملدرآمد کی قائل تھیں۔

آفس کی تعمیر نو کا معاملہ ہو، نئے آفس میں منتقلی ہو، فرنیچر کی خریداری ہو یا گاڑی لینی ہو، جب فیصلہ ہو جاتا تو آپ اس پر عمل کی دھن میں لگ جاتیں۔ قرآن و حدیث سے مضبوط تعلق نے ان کے اندر فراست ایمانی پیدا کر دی تھی بعض دفعہ مختلف کیسوں کے حوالے سے ہماری رائے اُن سے مختلف ہوتی تھی لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد ثابت ہوتا کہ ان ہی کی رائے صائب تھی۔ کاموں کی انجام دہی کے لیے فنڈنگ میں بھی پیش پیش رہتیں۔ ہمیں بھی سمجھاتیں

کہ" آج تک جماعت اسلامی کا کوئی کام وسائل کی کمی سے کبھی نہیں رکا ہے، آپ ارادہ کریں اللہ پر بھروسا کر کے کوشش کریں تو وہ ضرور عطا کرے گا"۔ رمضان المبارک میں وہ لاکھوں کا فنڈ اکٹھا کر لیتیں۔ کام کے ہر مرحلے پر انہوں نے اس کے لیے فنڈ جمع کیا اور جب اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئیں تب بھی اس کام سے لگاؤ کے باعث یہاں کے لیے فنڈنگ کرتی رہیں۔ اپنے تمام تر تجربے اور بزرگی کے باوجود وہ اطاعت نظم میں مثالی رویہ اختیار کرتیں میرے پاس بیت المال کی ذمہ داری تھی تو آڈیٹر کے بتانے پر میں انہیں جو ہدایات دیتی اس پر ہو بہو عمل کرتیں۔ راشن کے لیے فنڈنگ کر کے مستحق افراد تک سامان پہچانا ان کی اضافی پسندیدہ ذمہ داری تھی۔ آڈیٹر کے کہنے پر ان افراد کے نام پتے اور شناختی کارڈ زان سے مانگے تو انہیں یہ بات پسند نہ آئی لیکن پھر اس پر عمل کی کوشش میں لگ گئیں۔ تمام تر کاموں کے کرتے ہوئے افراد کو دعوت دین سے آشنا کرانا اور جماعت سے جوڑنا ان کی ترجیح میں رہتا تھا ہمارے ساتھ کام کرنے والے وکیلوں کو دین سمجھانے اور تحریک میں سمونے کی لگن میں مصروف رہتی تھیں"۔

اسی کام میں شریک ایک اور بہن محترمہ عقیلہ اظہر گواہی دیتی ہیں کہ "فیض آپا جیسے باصلاحیت لوگ کم ہی پائے جاتے ہیں۔ دھان پان سی سنجیدہ مزاج فیض آپا کام کرنا اور کروانا خوب جانتی تھیں۔ شروع میں مزاج کی سختی سہنا مشکل لگی لیکن ان کی گرفت نے لوگوں کو کام میں آگے دوڑا دیا۔ وہ اپنے ساتھ لوگوں کو لے کر اس طرح چلتیں کہ طے شدہ ہدف وقت پر انجام پاتا۔ ہمارا آفس صدر میں واقع ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا جس کی لفٹ خراب تھی لیکن فیض آپا طبیعت خرابی کے باوجود سب سے پہلے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچتی تھیں۔ آفس میں کافی دن تک صفائی وغیرہ کے لیے کوئی ماسی نہ مل سکی تو اپنی باری کے دن وہ جلدی آفس پہنچ کر خود جھاڑ و پونچھا کرتیں، فرنیچر صاف کرتیں اور گھر سے اُبلا ہوا پانی کولر میں لاتیں اور کبھی ہم سے اس بات کا ذکر بھی نہیں کیا بہت بعد میں ہمیں آپ کی اس مشقت کا علم ہوا"۔

بحیثیت نگران قرآن انسٹیٹیوٹ:

جب یہ ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی اس کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ یہاں کی ٹیچرز کے لیے آپ ایک ماں کی مانند مربی و مزکی کی حیثیت رکھتی تھیں ہر ایک کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنے میں کبھی رعایت نہ کرتیں اور اگر باہم دلوں میں کبھی کوئی کدورت آ جاتی تو ایک دوسرے کی

طرف سے دلوں کی صفائی کی کوشش میں سر دھڑ کی بازی لگا دیتیں۔ اومان جانے کے سبب یہ ذمہ داری برقرار نہ رہ سکی تو واپس آنے کے بعد پھر گاہے بگاہے یہاں آتیں اور اپنے مشوروں سے بہرہ مند کرتی رہتیں۔ اپنے انتقال سے چار روز قبل بھی وہ انسٹیٹیوٹ میں ہونے والے جلسہ سیرت النبیؐ میں شرکت کے لیے پہنچیں اور تقریباً پورا دن وہاں ساتھیوں کے ساتھ گزارا اور سب سے کہا بھی کہ آج آپ لوگوں کے درمیان آ کر میں بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں۔ یہاں کی ٹیچرز سے بھی بے حد محبت کرتی تھیں انہیں ساڑھیوں میں سے کرتے اور دوپٹے بنا کر تحفے میں دیتیں تو کبھی اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے پان کھلاتیں۔ مختلف تربیتی اجتماعات میں خصوصاً سفر میں لے جانے کے لیے تحریکی بہنوں کی فرمائش پر میٹھے کھانے تیار کر کے لے جاتیں۔ چند دن ملاقات کو ہو جاتے اور کوئی قریبی ساتھی نہ ملی تو اس طرح ناراضگی کا فون کرتیں کہ وہ لازمی ان کی محبت و خلوص کے احترام میں ملنے پر مجبور ہو جاتا۔ اگر کسی کی غلطی پر ڈانٹتیں تو بعد میں اپنے پیار و محبت سے اس کی تلافی بھی کر دیتیں۔ ان سے مسلسل رابطے میں رہنے والیاں ان کی بے لوث محبت، انتھک محنت اور ایثار و قربانی کے جذبوں سے حرارت پاتیں۔

اختتام زندگی:

اکلوتے بیٹے کے اومان چلے جانے کے بعد آپ نے کچھ عرصہ وہاں بھی گزارا لیکن وہاں زیادہ دل نہ لگا اور واپس کراچی آ گئیں مدتوں بیماریوں کے ساتھ شہادت حق کے فریضہ کو ادا کرنے والی فیض آپا نے وقت آنے پر رب کے پاس جانے کا سفر لمحوں میں طے کر لیا اور یوں یہ ۷۴ سالہ سفر ۲ مارچ ۲۰۱۱ء میں اختتام پذیر ہوا۔ اپنے خاندان میں گھر سے باہر نکل کر عورتوں تک دین کی دعوت پہنچانے والی اس مجاہدہ کا رب کے دربار میں جاتے ہوئے حسین و پُرسکون چہرہ قابل رشک تھا۔ وہ جماعت اسلامی کے لیے اللہ تعالیٰ کا خصوصی تحفہ تھیں اللہ ان سے راضی ہو اور وہ اپنے انجام سے خوش اور مطمئن ہوں۔ آمین!

ماخذات

۱۔ فرحین صاحبہ (بیٹی)
۲۔ حرا صاحبہ (نواسی)
۳۔ تحسین فاطمہ صاحبہ (چیئر پرسن جامعۃ المحصنات)
۴۔ شگفتہ مشہود صاحبہ (ممبر شعبہ لیگل ایڈ)
۵۔ عقیلہ اظہر صاحبہ (ممبر شعبہ لیگل ایڈ)
۶۔ ریحانہ افروز صاحبہ (سابقہ سٹی کونسلر)
۷۔ دردانہ صدیقی صاحبہ (قیمہ حلقہ خواتین)
۸۔ لبنیٰ وسیم صاحبہ (معلّمہ قرآن انسٹیٹیوٹ)

&

صفیہ ناہید

۱۹۴۹ء تا ۲۰۱۲ء

)

4

ایک دفعہ آپ بینک سے کچھ رقم نکلوا کر پہنچیں تو گھر کے دروازے پر ان سے پرس چھیننے کی کوشش کی گئی، جس پر انہوں نے ہمت سے چھیننے والوں کا مقابلہ کیا، اس مقابلے میں ان کے بازو پر چوٹیں بھی آئیں۔

اجتماعاتِ عام میں ان کے ذمے فنڈ بکسوں کی نگرانی ہوتی تھی۔ ہر دوسری دلچسپی سے قطع نظر وہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے تینوں دن ڈبوں کو اپنی حفاظت میں لیے بیٹھی رہتی تھیں۔ جب فیصل مسجد اسلام آباد کے قریب ہونے والے اجتماع عام کے آخری دن اچانک تیز بارش ہونے لگی تو ذاتی سامان سمیٹنے کی فکر سے بے نیاز ان کی ساری فکر رقم کو محفوظ بنانے کی تھی۔

4

ہوائی جہاز لاہور ایئرپورٹ پر اتر چکا تھا۔تمام مسافر طیارے سے باہر آ چکے تھے، لیکن ایک خاتون اپنی ساتھی کے ہمراہ وہیل چیئر کے انتظار میں تھیں ۔وہیل چیئر آنے پر انہیں ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر لایا گیا۔گھٹنوں میں شدید درد، ٹانگوں اور پیروں میں سوجن اور مستقل بخار کے باعث ان کے لیے تھوڑا سا فاصلہ پیدل چل کر طے کرنا بھی مشکل تھا،لیکن اس حالت میں بھی کراچی سے لاہور تک کا سفر کسی ذاتی مقصد کے لیے نہیں بلکہ حلقہ خواتین کی مرکزی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے طے کرنے والی یہ باہمّت خاتون صفیہ ناہید صاحبہ تھیں جو مرکزی بیت المال کی امین تھیں اور جانتی تھیں کہ اگر مرکزی اجلاس میں بجٹ پیش اور منظور نہ ہو سکا تو تنظیم کے لیے اپنے کاموں کو جاری رکھنے میں بڑی مشکلات پیش آ سکتی ہیں ۔تنظیمی ضرورت کے لیے ذاتی عذرات کو پس پشت ڈال کر صحت کی اس کمزور حالت اور سخت سردی میں لاہور تک کے سفر اور سہ روزہ قیام کو ممکن بنانے والی اس مجاہدہ کو حلقہ خواتین نے ہمیشہ مصروفِ جہاد ہی دیکھا۔

ابتدائی تعارف:

صفیہ باجی کے خمیر میں تحریک سے محبت شامل تھی۔ان کے ماموں اخلاق حسین لاہور جماعت کے امیر تھے جس کے باعث ان کے گھر والے پہلے ہی جماعت کی دعوت سے آشنا تھے۔بچپن سے ہی انھوں نے گھر میں جماعتی سرگرمیوں کو منعقد ہوتے دیکھا۔ان کے گھر میں مردوں کے بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہوتے تھے جن میں سے چند میں مولانا مودودیؒ بھی شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ والدین نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی فراہم کی جس کے بعد کلاس ہشتم سے اسکول جانا شروع کیا۔اسکول کی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد سرسید گرلز کالج کراچی سے گریجویشن مکمل کر کے پرائیوٹ ایم اے اسلامک اسٹڈیز کیا۔ابتدا میں جب جماعت کا کام محض مردوں میں ہی ہوا کرتا تھا تو انہیں خود خواتین میں کام نہ ہونے کے خلا نے ماموں کے سامنے اس خواہش کے اظہار پر مجبور کیا کہ خواتین کے لیے بھی پروگرام ہونے چاہئیں۔ماموں نے اس کی پُر زور تائید کے ساتھ ایک گھر میں اس کا انتظام کر دیا۔جس میں درس دینے کے لیے حلقہ خواتین کی ایک مدرّسہ شکیلہ آفتاب صاحبہ کو بھی مقرر کر دیا۔چند مہینے تسلسل

سے درسِ قرآن کا یہ سلسلہ جاری رہنے کے بعد حلقے کی ذمہ داری نبھائی۔ یہ کراچی میں جماعت کی ابتدا کا دور تھا۔مردوں کے ذریعہ ہی مختلف جگہوں پر محرم خواتین کے ذریعہ خواتین کا نظم بھی قائم کیا جاتا تھا۔پھر جب بعد میں کچھ خواتین ایسی جمع ہو گئیں جو نظم کی ذمّہ داری سنبھال سکتی تھیں تو خواتین میں کام کی ذمّہ داری ان کے سپرد کر دی گئی ۔

آغازِ سفر

صفیہ باجی دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں ۔تحریک سے جڑ کر انھیں بہت سی بہنیں مل گئیں۔ ابتدا میں لوگ کم تھے۔ بار بار آپس میں ملنے، ایک دوسرے کے گھر جانے، ہر کام ساتھ مل کر کرنے نے تمام کارکنان کو یکجا کر رکھا تھا۔وسائل کم تھے لیکن عزائم بلند تھے۔دروس، قرآنی کلاسز اور لٹریچر کی تقسیم کام کے بنیادی ذرائع تھے۔ابتدا میں مجھے ''بولنا اور لوگوں میں درس دینا نہیں آتا'' کا اعلان کرنے والی صفیہ باجی نے آہستہ آہستہ سارے ہی کام کرنے شروع کر دیے اور پھر اپریل ۱۹۷۶ء میں ان کی رکنیت منظور ہوئی اور لاہور میں بیگم مولانا مودودیؒ نے ان سے رکنیت کا حلف لیا۔اس کے بعد انھیں اپنے علاقہ کی ناظمہ بنایا گیا اور جب عائشہ منوّر صاحبہ کراچی کی ناظمہ بنیں تو انہوں نے صفیہ ناہید کو اپنی ٹیم میں لے لیا۔

یہ دور کراچی میں دعوتی پھیلاؤ کا دور تھا۔اب تک کے شامل شدہ افراد کلاسز، اسٹڈی سرکلز اور دستور پر ڈسکشن سے گزر کر خام سے کندن ہو چکے تھے۔اب انھیں مختلف سمتوں میں دعوت کا پیغام پہنچانے کے لیے روانہ کرنے کا وقت تھا۔ ہر ایک کے لیے ہفتہ بھر کا ٹائم ٹیبل طے کر دیا جاتا تھا۔صفیہ ناہید بھی ضلع وسطی، غربی، بن قاسم اور جنوبی میں تسلسل کے ساتھ کلاسز لیتی رہیں۔ دستور پڑھانا اور سمجھنا ان کا خاص موضوع ہوا کرتا تھا۔تمام ہی اضلاع میں دستور پڑھایا، یہاں تک کہ ساتھی مزاقاً انھیں ''دستوری خاتون'' کہہ دیتے تھے۔کسی کلاس میں قرآن پڑھایا کرتیں اور کسی میں دستور سمجھایا کرتیں ۔سالوں ان کلاسز کا سلسلہ جاری رہا اور تحریک کو بہت قیمتی کارکن میسّر آئے ۔پہلی صف نے مستقبل کے لیے دوسری صف تیّار کر دی تھی ۔اس زمانہ میں کام کو منظّم کرنے کے لیے ایک رپورٹ فارم مرتّب کرنے کی بھی ضرورت محسوس کی گئی۔صفیہ ناہید نے اس ضرورت کے پیش نظر نظم حلقہ و علاقہ کے لیے رپورٹ فارم کا ابتدائی خاکہ تیار کیا جو

مختلف وقتوں میں تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ آج پورے پاکستان میں جاری ہے۔

انھوں نے گہرائی کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کیا تھا اور اس گہرائی کو وہ اپنی کلاسز کے شرکا میں منتقل کرنے کی جدّ وجہد کرتی تھیں۔ان کی کلاس کے شرکا کہتے ہیں کہ ہم نے قرآن پڑھنا ان ہی سے سیکھا۔ وہ ہمیں پڑھاتے وقت ابھارا کرتی تھیں کہ معنی پر غور کرو، اس سے ابھرنے والے سوالات پر غور کرو۔ان سوالوں کے جوابات کے لیے مختلف تفاسیر کا مطالعہ کرو، تو قرآن کی گہرائی سمجھ میں آئے گی۔

نائب ناظمہ کراچی کے بعد تین سال ضلع وسطی کی نظامت ان کے سپرد رہی۔رکن جماعت عطیہ نثار صاحبہ بیان کرتی ہیں کہ صفیہ باجی ایک اصول پسند اور بارعب شخصیت کے طور پر پہچانی جاتی تھیں لیکن جب ان پر نظامت کی ذمہ داری آئی تو انہوں نے اپنے آپ کو اس کے تقاضوں کے مطابق بہت تبدیل کرلیا۔ وہ کارکنان کے لیے انتہائی شفقت کا رویہ رکھتیں اور انہیں ہر معاملہ میں ساتھ رکھ کر اپنی ذمہ داری کو انجام دیتیں۔ بھرپور مطالعہ کے باعث ان کا درس قرآن علمیت سے بھرپور اور خوبصورت الفاظ کے چناؤ پر مشتمل ہوتا تھا۔ وہ بات کو اس طرح سمجھاتی تھیں کہ ذہن نشین ہو جاتی تھی۔ان کے پاس بیٹھ کر خود بھی اپنے اندر تنظیمی سمجھ بوجھ پیدا ہونے کا احساس ہوتا تھا۔اس عرصے میں ان کی توجّہ نئے حلقے قائم کرنے اور کلاسز کے ذریعہ کارکن سازی کرنے پر مبذول رہی''۔

بیت المال کی ذمہ داری:

جب عائشہ منور صاحبہ قیمہ حلقہ خواتین جماعت اسلامی پاکستان بنیں تو انہیں اپنی ٹیم کا حصہ بنا لیا اور مرکزی بیت المال کی ذمہ داری ان کے سپرد کردی۔ کسی خاتون کے لیے بیت المال کا نظام چلانا آسان نہیں ہے۔اس کام میں امانت، دیانت، رازداری، یادداشت، مستقل مزاجی، یکسوئی اور حساب کتاب کی ایک تکنیکی مہارت درکار ہوتی ہے۔صفیہ ناہید کا نام گھر بار کی مصروفیات سے نسبتاً فراغت اور ان کے فہم وادراک سے متصف ہونے کے باعث اس ذمّہ داری کے لیے مناسب سمجھا گیا۔انھوں نے سالہا سال یہ ذمّہ داری اس طرح نبھائی کہ ہر ایک کو بیت المال کے مضبوط ہاتھوں میں رہنے کا احساس رہتا تھا۔ یہ کام اگرچہ ان کے لیے بالکل نیا تھا اور ان کی تعلیم کے مطابق بھی نہیں تھا، لیکن انھوں نے اطاعتِ امر میں اس ذمّہ داری کو قبول کیا۔ مردانہ

نظم کے تعاون سے اس کام کو سمجھا اور اللہ کے بھروسے پر اس کام کو کرنا شروع کردیا۔

جو اللہ کی مدد کرتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے، لہٰذا جب بندی نے رضائے الٰہی کی طلب میں قدم اٹھا لیا تو اللہ نے بھی اس پر نظرِعنایت کی اور کروڑوں کا حساب کتاب رکھنے کے قابل بنا دیا۔ بیت المال میں بے شمار مدات موجود رہیں۔اس عرصے میں خواتین کی سطح پر نئے نئے کام شروع ہوئے۔مختلف شعبہ جات بھی قائم کیے گئے۔اجتماعاتِ عام بھی منعقد ہوئے۔ جہادِ کشمیر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔قدرتی آفات سے بھی ملک دوچار ہوا جس کے لیے جماعت اسلامی کے فلاحی کاموں کا سلسلہ جاری رہا۔انہوں نے ایک ایک پائی کا حساب مکمل رکھا۔ ہر معمولی سے معمولی رقم کی رسید کا ریکارڈ موجود رہتا تھا اور اس ضمن میں وہ دیگر کارکن بہنوں کو توجّہ دلاتی رہتی تھیں اور بعض دفعہ اس امر پر ناراضی کا اظہار بھی کرتی تھیں کہ ''آپ نے رسید وقت پر نہیں بھیجی''۔

احساسِ امانت:

ان کی زندگی میں ان سے لیے گئے انٹرویو میں انھوں نے اس ضمن میں اپنے احساسات و واقعات بتاتے ہوئے کہا کہ ''الحمدللہ نظم نے جس کام کا بھی ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے اس کو وسائل مہیا کردیے۔ میرا ایمان تھا کہ میرے پاس جو بھی رقم ہے، وہ اللہ کی امانت ہے۔اللہ اس کی حفاظت کرے گا اور الحمدللہ ایسا ہی ہوا۔ ایک بار کسی اجتماع میں ہم کو سکھر جانا تھا اور سب کے کرائے کی رقم میرے پاس تھی۔ مجھے اپنی والدہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا، پہلے دل میں خیال آیا کہ پرس بہت بھاری ہو رہا ہے، پیسے نکال کر گھر میں رکھ لیتی ہوں، پھر سوچا کہ ساتھ ہی لے جانا بہتر ہے، لہٰذا میں رقم پرس میں رکھ کر ہی والدہ کو اسپتال لے گئی اور ہمارے جاتے ہی گھر میں چوری ہوگئی۔گھر کی تمام چیزوں کا صفایا ہوگیا۔اللہ کا شکر ہے کہ جماعت کی امانت محفوظ رہی''۔ذاتی نقصان کو چھوٹا گردانتے ہوئے جماعت کی امانت محفوظ رہنے پر اللہ کا شکر ادا کرنے والی صفیہ باجی ایک دفعہ جب بینک سے کچھ رقم نکلوا کر گھر پہنچیں تو گھر کے دروازے پر ان سے پرس چھیننے کی کوشش کی گئی، جس پر انہوں نے ہمت سے چھیننے والوں کا مقابلہ کیا اس مقابلے میں ان کے بازو پر چوٹیں بھی آئیں۔

اجتماعاتِ عام میں ان کے ذمّہ فنڈ بکس کی نگرانی ہوتی تھی۔ ہر دوسری دلچسپی سے قطع نظر

وہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے تینوں دن ڈبوّں کو اپنی حفاظت میں لیے بیٹھی رہتی تھیں۔
جب فیصل مسجد اسلام آباد کے قریب ہونے والے اجتماع عام کے آخری دن اچانک تیز بارش ہونے لگی تو ذاتی سامان سمیٹنے کی فکر سے بے نیاز ان کی ساری فکر رقم کو محفوظ بنانے کی تھی۔
حساب کتاب کھرا رکھنے کی فکر میں آپ نے کبھی کسی سے رعایت نہیں برتی اور مناصب یا تجربہ یا فرد کی کسی اور خوبی کے دباؤ سے آزاد رہ کر اس سے بیت المال کے اصول وقواعد پر عمل کرایا۔
کتنے ہی سال وہ اس کام کو تنہا انجام دیتی رہیں، پھر صحت کی کمزوری کے باعث معاون طلب کرنے لگیں تو اس کام کے لیے انہیں معاونت فراہم کی گئی۔

بیت المال سے ہٹ کر دیگر ذمہ داریوں کے بارے میں بھی یہ احساس بدرجہ اولیٰ موجود رہتا تھا۔ایک تحریکی بہن عید کے موقع پر ان سے ملنے گئیں تو ان کی انگوٹھی وہیں گر گئی جس کا علم انہیں اس بہن کے جانے کے بعد ہوا۔اگرچہ وہ اس وقت بہت بیمار تھیں لیکن انہوں نے فون کر کے اس بہن سے کہا کہ ''آپ کی ایک امانت میرے پاس رہ گئی ہے، جلدی آ کر لے جائیں۔ میری صحت کی حالت بہت نازک ہے''۔انہوں نے پوری زندگی اسی احساسِ امانت کے ساتھ گزاری۔

مستعد کارکن:

اس ذمّہ داری کے ساتھ ساتھ تحریک کی دیگر ہدایات پر عمل کی بھی پوری کوشش رہتی تھی۔ ہر اجتماع میں بروقت شرکت اور بروقت رپورٹ دینا ان کی خصوصی صفات تھیں، جس کا انھوں نے آخر تک خیال رکھا۔ جب حلقہ خواتین کا مرکزی نظم کراچی میں منتقل ہوا تو مرکز کی گاڑیوں کا نظام بھی سپرد کیا گیا۔ڈرائیوروں پر گرفت رکھنا، ہر ایک کی ضرورت کو پورا کرنا، گاڑیوں کی مرمّت اور اس کے اخراجات کا حساب ایک تھکا دینے والا کام ہے، لیکن انھوں نے مستقل مزاجی سے اس کام کو بھی سرانجام دیا۔اس ضمن میں ہر ذمّہ دار کا، ان سے رابطہ رہتا تھا۔اگرچہ اپنے گھر میں والدین اور گھر کو سنبھالنے والی صرف آپ تھیں، جسے ظاہر ہے بار بار کے ٹیلیفون پریشان بھی کرتے ہوں گے، لیکن ہر فون وہ تحمّل سے سنتیں اور ہر ایک کے مسئلے کو سمجھ کر اس کی گاڑی کا مسئلہ حل کرنے کی پوری کوشش کرتیں۔مختلف میٹنگز اور شوراؤں میں اگرچہ خاموش رہ کر سب کی آراء سنا کرتی تھیں لیکن جب رائے لی جاتی تو ان کی رائے میں تجربہ اور دلیل کا وزن محسوس کیا جاتا۔

انہوں نے ساری زندگی ایک پروقار روّیہ اپنائے رکھا۔ جامہ زیبی کا شوق تھا لیکن اس میں ہمیشہ اسلامی حدود کی پاسداری کی۔تحریکی بہنوں کی خوشی وغمی میں ہمیشہ شرکت کی۔سفر ان کے لیے آسان نہ تھا۔گھر میں ضعیف والدین کی ذمہ داری آپ کے سپرد تھی، لیکن تحریک کو جب بھی ضرورت پڑی انہوں نے نظم کو اپنا بہترین تعاون فراہم کیا۔

باہمی تعلقات:

سنجیدہ اور خاموش طبع صفیہ ناہید کا خاصہ تھا کہ وہ تحریکی ساتھیوں کے ساتھ مضبوط تعلق رکھتیں اور اسے نبھاتی تھیں۔قرآنی کلاسز اور فہم دستور کی کلاسز میں ہر عمر کی خواتین کے ساتھ لڑکیاں بھی شریک ہوتیں۔ وہ ان کی پسند ناپسند اور مسائل سے آگاہ رہتیں اور ان کا حل دیتیں۔ گفتگو میں کبھی اپنی مصروفیت کی بنا پر بیزاری اور جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرتیں جب تک مخاطب خود ہی رخصتی کا اشارہ نہ دے دیتا۔ وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں ''اور سناؤ'' کا جملہ ادا کرتی رہتیں۔ان کی کلاسز میں شریک خواتین اور دیگر ساتھیوں سے ان کے گھر کے ہر فرد کا نام لے کر خیریت دریافت کرتیں۔ کسی کی بیماری کی اطلاع ملتی تو عیادت کے لیے ضرور جاتیں۔اگر نہ جا پاتیں تو بار بار اس کی صحت کے لیے فکرمندی کے ساتھ ان کی زبان سے اس طرح الفاظ ادا ہوتے کہ سننے والے کو محسوس ہوتا کہ شاید ان کی اس ساتھی سے کوئی رشتہ داری ہے۔ایک تحریکی بہن کے شوہر کا اچانک حادثے میں انتقال ہو گیا تو انہوں نے بتایا کہ سب سے زیادہ صفیہ باجی ان کی دلجوئی کے لیے آتی رہتیں اور ایک بار جب اپنے ساتھ اندرون سندھ سے آئی ہوئی ایک بہن کو تعزیت کے لیے لائیں تو اس کی تواضع کے لیے اپنے گھر سے کچھ چیزیں لے آئیں تاکہ مجھے زحمت نہ ہو۔ وہ ساتھیوں کو اس بات پر بھی توجہ دلاتی رہتی تھیں کہ جو بہنیں اپنی بیماری یا معذوری کے باعث اپنے گھر تک محدود ہو گئی ہیں، ان کے پاس بھی جاتے رہنا چاہیے تاکہ ان کا حوصلہ برقرار رہے۔

جن افراد سے ان کا رابطہ رہتا ان کے مسائل وضروریات کے حل کے لیے پورا تعاون کرتیں۔ ایک بہن نے بتایا کہ میرے گھر کا ٹیلیفون سیٹ خراب تھا، بات سننے میں دشواری ہوتی تھی تو صفیہ باجی کی طرف سے نئے سیٹ کا تحفہ مل گیا۔ایک ساتھی ان سے ملنے گئیں اور ذکر کیا کہ میں پرس خریدنے بازار جا رہی ہوں تو وہ اندر جا کر بہترین قسم کا پرس لے کر آئیں اور بڑی محبت اور اصرار کے ساتھ

تحفے میں دے دیا۔ کسی نے ڈھیر ساری سبزیوں کا تحفہ بھیج دیا تو انہوں نے فوراً کئی حصوں میں تقسیم کر کے تحریکی بہنوں اور جماعت کی گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو بانٹ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جماعت اسلامی کو اپنے کنبے کی مانند سمجھتی ہیں جس کے ہر فرد کے کام آنا ان کا اولین فرض ہو۔

حسِ مزاح:

ان کے اس اضافی وصف کی وجہ سے ان کے ساتھ کام کرنے والیاں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتی تھیں۔ ایک ساتھی نے ذکر کیا کہ مجھ سے بار بار حساب میں غلطی ہو رہی تھی تو مسکرا کر بولیں، ''سنا ہے آپ معاشیات میں ماسٹرز ہیں''۔ ہر عمر کا فرد ان سے قلبی تعلق محسوس کرتا اور عمروں کے تفاوت کے باوجود ان کی جلد دوسروں سے دوستی ہو جاتی۔

والدین کی خدمت:

اپنے ضعیف اور بیمار والدین کی خدمت کی ذمہ داری انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھائی، جب کہ وہ خود بھی گھٹنوں کی تکلیف کے باعث ابتدا سے چلنے میں دقت محسوس کرتی تھیں۔ ان کی والدہ فالج کے باعث چلنے پھرنے سے قاصر ہو گئی تھیں، صفیہ باجی اپنی ہر ملاقاتی سے والدہ کی ملاقات کرواتیں۔ اگر والدہ نماز بھی ادا کر رہی ہوتیں تو وہ ملاقاتی سے انتظار کی درخواست کرتیں، مقصد والدہ کی دلجوئی کرنا تھا۔ والدہ کوئی بات بار بار دہراتیں تو وہ بجائے بیزاری کے ان کی بات مکمل کرنے اور ضرورت پوری کرنے میں ان کا ساتھ دیتیں۔

ان کے والد بھی بھول کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے صفیہ باجی کا خاصا وقت والد صاحب کی خدمت میں صَرف ہوتا۔ وہ اپنے والدین کے کھانے اور نماز کے اوقات کا بہت زیادہ خیال رکھنے کے ساتھ ان کی پسند اور ناپسند کو کھانا پکانے اور دیگر کاموں میں مدنظر رکھتیں۔ ان کی والدہ ہر آنے والے کے سامنے صفیہ باجی کی خدمات کی تعریف کرتیں اور انہیں دعائیں دیتیں۔

آخری سفر:

بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ صحت بتدریج کمزور ہو گئی۔ گھٹنوں میں درد اور ٹانگوں میں سوجن کی شکایت تو رہتی تھی لیکن ۲۰۱۲ء میں کینسر کے موذی مرض نے بھی آ گھیرا۔ لیکن ہمت اور استقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ دیگر تحریکی بہنوں سے اس کا زیادہ ذکر نہیں کرتی تھیں بلکہ کوئی خدمت

کی پیشکش کرتا تو اسے شکریہ کے ساتھ منع کر دیتیں۔ عیادت کے لیے آنے والوں کی بھی خاطر تواضع کے لیے ماسی سے کہہ کر اہتمام کرواتیں۔ علاج جاری رہا، لیکن مرض پورے جسم میں پھیل چکا تھا۔ وقتاً فوقتاً اسپتال جا کر پھیپھڑوں سے پانی نکلوانا پڑتا۔ اسی کام کے لیے ایک دفعہ اسپتال گئی تھیں کہ ڈاکٹرز نے داخل کر لیا۔ اور ۲۰۱۲ء کو اللہ تعالیٰ نے انہیں وہیں سے اپنے پاس بلا لیا۔ اس حال میں کہ ان کا عید کا سوٹ سل چکا تھا، دوپٹہ رنگنے دیا ہوا تھا اور اس پر لگانے کے لیے بیل ایک بہن سے منگوائی ہوئی تھی لیکن عید سے قبل ہی ان کی رب سے ملاقات کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ ان کے انتقال پر ساری تحریکی بہنیں ایک دوسرے سے مل کر تعزیت کر رہی تھیں۔ ماں بیٹی میں بہت مزاج آشنائی تھی۔ بیٹی کے پچیس دن بعد ماں بھی اس دنیا سے چلی گئیں اور والد صاحب بھی ایک سال بعد رخصت ہو گئے۔

اس دنیا سے رخصت ہونے سے قبل صفیہ ناہید نے جماعت اسلامی کے استحکام و بہتری کے لیے مشورے دیتے ہوئے اپنے انٹرویو میں کہا...

''جماعت اسلامی اسلام کی بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے ہی ترقی کر سکتی ہے، کمزوری آہستہ آہستہ ہی آتی ہے اس لیے چھوٹی سے چھوٹی کمزوری پر ہی اپنا احتساب اور اصلاح کر لینی چاہیے تاکہ اپنی بنیادوں سے دور نہ جا سکیں۔ عہد کی پابندی، سچّائی، باہمی محبت سب ہماری بنیادیں ہیں جن پر ہمیں قائم رہنا چاہیے''۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان بنیادوں پر استقامت عطا فرمائے، آمین!

ماخذات

۱۔ انٹرویو: صفیہ ناہید از روبینہ فرید ۲۰۱۱ء
۲۔ عائشہ منور صاحبہ۔۔۔۔۔۔سابقہ قیمہ حلقہ خواتین
۳۔ افشاں نوید صاحبہ۔۔۔۔۔۔سابقہ ناظمہ صوبہ سندھ
۴۔ رخشندہ منیب صاحبہ۔۔۔۔۔۔معتمدہ صوبہ سندھ
۵۔ تحسین فاطمہ صاحبہ۔۔۔۔رُکن جماعت اسلامی
۶۔ فریحہ اشرف صاحبہ۔۔۔۔رُکن جماعت اسلامی
۷۔ انجم خالق صاحبہ۔۔۔۔۔رُکن جماعت اسلامی

&
ڈاکٹر فوزیہ ناہید

۱۹۶۱ء تا ۲۰۰۸ء

)

4

دو روزہ تربیت گاہ کے اختتام پر کارکن بہنیں مہمانوں کو رخصت کر کے آپس میں حلقہ بنائے بیٹھی تھیں ناظمہ نے اچانک یہ سوال سامنے رکھ دیا کہ آج ہم سب بتاتے ہیں کہ ہم نے اپنی تحریک کو کیا دیا ہے۔ کسی نے سوچ کر کہا وقت، کسی نے کہا صلاحیتیں، کسی نے کہا مال، کسی نے کہا وجود ایک بہن نے اپنی باری پر سر اُٹھایا اور مسکراتے چہرے سے پُر یقین انداز میں کہا میں نے تحریک کو اپنا دل دے دیا ہے اور سننے والوں نے سوچا کہ جو کسی کو اپنا دل دے دے پھر بھلا اس نے بچا کے کیا رکھا؟ گویا سب کچھ ہی دے ڈالا۔ وقت اور افراد گواہ ہیں کہ فریضہ اقامت دین کی ادائیگی کے لیے عمر کے مختلف ادوار میں اس دور کے تقاضے کے مطابق ہر اجتماعیت میں یہ بہن پوری آمادگیٔ قلب کے ساتھ شامل رہیں۔

ہم تیرے ساتھ ساتھ ہیں اے عشق خوش عناں
یہ دل ہے یہ دماغ ہے یہ جسم ہے یہ جاں

4

اسلامی جمعیت طالبات کا پلیٹ فارم ہو یا پیما کا، جماعت اسلامی حلقہ خواتین ہو یا اسلامک سرکل آف نارتھ امریکا (ICNA) سب ڈاکٹر فوزیہ ناہید کی کامیابیوں اور کامرانیوں کے گواہ ہیں۔قائدانہ صلاحیتیں آپ میں اوائل عمر ہی سے نمایاں تھیں خوش مزاج، زندہ دل، پر اُمید، محبت کرنے اور لوگوں کو جوڑ کر رکھنے والی، گہرائی سے سوچنے اور دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھنے والی یہ نیک خصلت بندی ۱۷ر فروری ۱۹۶۱ء کو ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئی۔آٹھ سال کی عمر میں والدہ سے بچھڑ جانے کا صدمہ جھیلنا پڑا لیکن جلد ہی سگی خالہ نے ماں بن کر اس صدمے کو کسی حد تک پُر کر دیا ساتھ ہی اس شدید غم نے کمسنی میں ہی سوچ کو گہرائی اور دل کو حساسیت عطا کی۔والد انتہائی اُصول پسند، صاحب مطالعہ، بچوں کی پڑھائی کے لیے بے حد حسّاس تھے فوزیہ نے دین داری اور ذہانت ان سے ورثہ میں پائی اللہ تعالیٰ نے اس حساس دل کو سیدھی راہ پر ڈالنے کے لیے اس گھرانے کو حمید صاحب کے پڑوس میں آباد کر دیا جہاں اِن کی زوجہ اور بیٹیاں مقیم تھیں اور جن کے گھر میں اسلامی جمعیت طالبات کا مرکزی دفتر قائم تھا اس گھر کا ہر فرد اللہ کے دین کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کی تڑپ رکھتا تھا اور اس کی فضا میں رچی محبت کی خوشبو دور دور سے بہت قریب کھینچ لاتی تھی۔ان کے حساس دل نے اس گھر سے اللہ اور اللہ کے دین کی اقامت کی محبت کو اپنے اندر گہرائی کے ساتھ اس طرح سمو لیا کہ اس کام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اس طرح کہ پھر اس راہ میں قدم آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔فوزیہ بہن کے والد مرحوم ریلوے میں ڈویژنل انجینئر تھے انہوں نے تمام عمر انتہائی نظم و ضبط اور رزق حلال کے ساتھ گزاری۔ چاپلوسی سے ناآشنائی اور اُصول پسند ہونے کے باعث انہیں مقررہ وقت سے کئی سال پہلے ریٹائر ہونا پڑا، بیٹی کی شخصیت کی تشکیل میں ان کے کردار کا اثر شامل رہا۔

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز:

اسکول، کالج میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے ہوئے فاطمہ جناح میڈیکل کالج تک

جا پہنچی دوران طالب علمی جمعیت کی مختلف ذمہ داریوں کو نبھاتی رہیں اور فائنل ائیر تک پہنچیں تو طالبات نے ناظمۂ اعلیٰ منتخب کیا۔ایک طرف وہ ماں باپ کی تابع فرمان بیٹی تھیں تو دوسری طرف تعلیمی میدان کی ہونہار طالبہ اور تیسری طرف جمعیت کی متحرک ناظمہ۔انہوں نے ہر حیثیت کے تقاضے بھرپور انداز میں نبھانے کی کوشش کی۔ والد کی جانب سے پڑھائی پر توجہ کی تاکید اور دیگر سرگرمیوں میں بہت زیادہ شرکت کی ممانعت تھی۔انہوں نے اپنی ذمہ داری کو اسی حد کے اندر رہتے ہوئے پورا کیا۔اس سے لوگوں کو پڑھنے، گہرائی سے سوچنے، راستے نکالنے ہر موقع کو بہترین انداز میں استعمال کرنے، تحریر کو مقصد کا ذریعہ بنانے اور ہر فرد سے جلد بہترین تعلق بنانے اور پھر نبھانے کی روش سیکھنے کا موقع ملا۔ دراصل اس تربیت کے ذریعے رب ذوالجلال ان کے اندر وہ صفات پیدا کر رہا تھا جو آگے جا کر ایک بڑے میدان میں استعمال ہونی تھیں۔ ہاؤس جاب کا وقت آیا تو ENT کی فیلڈ کا انتخاب کیا تاکہ ساتھ ساتھ نظامت اعلیٰ کی ذمہ داری بھی نبھائی جا سکے اتفاق سے اس دفعہ ENT میں ہاؤس جاب کرنے والی وہ واحد ڈاکٹر تھیں لہٰذا چوبیس گھنٹے آن کال رہتیں۔اسپتال سے آ کر بیٹھتی ہی تھیں کہ تھوڑی دیر میں پھر کسی مریض کے لیے بلاوا آجاتا، مگر آپ نے کبھی کسی تنگی کا اظہار نہیں کیا۔خوشدلی سے ڈیوٹی جاری رکھتیں اور اسی آنے جانے کے دوران تحریکی ساتھیوں سے ملاقاتیں اور مشاورت کا عمل بھی جاری رہتا۔اسپتال میں دیگر ڈاکٹرز بہنیں بھی ساتھ تھیں ساتھیوں سے بے حد پیار و محبت کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان کاموں کو تقسیم کرنا اور موزوں فرد سے موزوں کام لینا انہیں خوب آتا تھا۔

محبت فاتح عالم:

محبت کے اظہار میں بہت آگے تھیں گرمجوشی سے ملتیں، پشت دباتیں۔الفاظ اور انداز دونوں کے ذریعہ اپنی محبت کا احساس دلاتیں۔ایک بہن کو لکھا میں اپنے ہاتھ کی انگلیوں پر اپنی جن دوستوں کے نام گن لیتی ہوں اس میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔خود ڈاکٹر عذرا بتول کی وفات پر جو مضمون لکھا اس میں لکھتی ہیں کہ ''میں نے عذرا کے ہاتھوں کی انگلیوں کو پکڑ کر اس سے سارے

سال کی منصوبہ بندی پر بار بار بات کی ہے یہاں تک کہ اس کی انگلیوں کی بناوٹ ونقوش بھی میرے ذہن میں اب تک تازہ ہیں‘‘۔ وہ اپنے جونیئر ساتھیوں کو بھرپور اعتماد دیتی تھیں بہت محبت کے ساتھ نہ صرف تحریکی کاموں بلکہ ان کی ذاتی زندگی میں بھی دلچسپی لے کر رہنمائی دیا کرتی تھیں جس کے باعث دوطرفہ تعلق اور اعتماد بہت بڑھتا۔ وہ افراد جو کسی اور کے ساتھ نہ چل پاتے ان کے ساتھ بھرپور تحریک کے ساتھ کام کیا کرتے تھے۔ انہوں نے کام کو کرنے کے لیے سسٹم بنانے پر پوری توجہ دی یہ ایسی خوبی ہے جو بہت کم افراد میں پائی جاتی ہے۔

ذوقِ مطالعہ:

ایک تحریکی ساتھی کو خط میں لکھتی ہیں کہ ’’آج کل میرا ٹائم ٹیبل یہ ہے۔ صبح ۶ بجے سے ایک بجے تک کالج، ایک سے تین تک ظہر وظہرانہ اور آرام کے بعد ۳ سے ۶ بجے تک اسپتال۔ ۶ سے ۷ تک گھر واپسی پھر آ کر ڈاک کھولتی ہوں خطوں کے جواب دیتی ہوں مطالعہ کا موقع کم مل رہا ہے آج کی رات جاگنے کا ارادہ ہے تاکہ تنقیحات جو شروع کی ہے اسے مکمل کر سکوں‘‘۔ اپنی گہری سوچ کو تحریر میں منتقل کرتے ہوئے ایک ساتھی کو خط میں لکھا ’’ہم نے تو بہت سے مطالعے کے ذریعے مکمل اسلامی دنیا اور اس کی موجودہ صورتحال سے نمٹنے کے لیے بنیادیں اور اُصول لینے ہیں مثلاً اگر کوئی کہے کہ لیجیے اس پوری دنیا پر آج سے لے کر تین ماہ تک آپ حکمران ہیں اور آپ اس عرصہ میں معاشرت کو، معیشت کو، سیاست کو، عدلیہ کو، مقنّنہ کو، انتظامیہ کو اسلامی نہج پر ڈھالیں تو موجودہ نظام کا اسلامی حل بھی ہمارے سامنے موجود ہو اور ہمیں یہ تین ماہ سمجھنے میں نہیں لگانے پڑیں‘‘۔ عقل سلیم، حکمت اور دوراندیشی کا وافر حصہ انہیں قدرت کی طرف سے انعام میں ملا تھا چہرے پر ہمیشہ پرعزم مسکراہٹ جگمگاتی رہتی ہر مشکل اور ہر کٹھن مرحلے پر ان کی کھنکھناتی ہوئی ہنسی غالب آجاتی کبھی کوئی ان سے پوچھتا کہ ’’اس ذمہ داری پر ہونے کے باوجود جب آپ کو گھر کی طرف سے نکلنے کی اجازت نہیں ملتی تو آپ کیا سوچتی ہیں؟‘‘ تو وہ اسی شگفتہ ہنسی کے ساتھ جواب دیتیں کہ ’’میں سوچتی ہوں کہ چلو یہ موقع اور وقت تو گزر گیا اب آگے کی فکر کرتے ہیں‘‘۔

قرآن وسنت سے اخذ شدہ اُصولوں کی روشنی میں طالبات میں کام کے لیے مشاورت کے ساتھ خوب سے خوب تر منصوبہ بندی پر توجہ رہتی۔ مختلف شہروں کی ساتھیوں سے تحریری مضبوط رابطہ تھا ہر جگہ کے حالات ووسائل کی روشنی میں ان کی رہنمائی کی جاتی۔ وہ کہتی تھیں کہ ’’ناظمہ کو اپنی شوریٰ سے ہر معاملہ میں کم از کم دس فیصد بلند ہونا چاہیے‘ اور وہ خود اس کا عملی نمونہ تھیں سمجھاتی تھیں کہ ’’ہمیں چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو بھی نہیں گنوانا چاہیے۔ البتہ اگر دو نیکیوں کے مواقع ایک ساتھ ہوں اور کسی ایک پر عمل ممکن ہو تو پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ اجر کس میں زیادہ ہے؟‘‘ منصورہ میں حلقہ خواتین کے مرکز کے اُوپر جمعیت طالبات کے دفتر کی تعمیر بھی ان ہی کے زمانہ میں انجام پائی۔ بزرگوں کی قدر کرنے اور ان سے رہنمائی لینے کا وافر جذبہ ان میں موجود تھا جماعت کی بزرگ خواتین رہنماؤں سے ملنے کے لیے اپنی شوریٰ کے کسی نہ کسی فرد کو لے کر پہنچ جاتیں۔ ہاسٹل بنت الاسلام صاحبہ کے گھر کے قریب تھا جب کبھی وہاں رکتیں تو کوشش کرتیں کہ بنت الاسلام صاحبہ کی اس ہفتہ وار کلاس میں شرکت کی جائے جس کا اہتمام وہ اپنے خاندان کی بچیوں کے لیے کرتی تھیں۔

حلقہ خواتین میں کردار:

شادی کا وقت آیا تو دین دار اور تحریکی ذہن رکھنے والے ساتھی کی خواہش کی۔ ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر اعجاز صاحب سے نکاح ہوا، جو میڈیکل کالج میں پڑھاتے تھے ایک سال بعد رخصتی ہوئی شادی کے بعد لاہور کی مقامی جماعت کی دعوتی وتربیتی سرگرمیوں میں آگے بڑھ کر کام کیا۔ دوسری طرف بحیثیت ڈاکٹر دیہاتوں میں میڈیکل کیمپس کے ذریعہ خدمت خلق میں بھی مصروف رہیں سال بھر کے لیے ضلع لاہور کی نظامت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ یہ وہ دور تھا جب حلقہ خواتین کے اندر کچھ اختلافی آرا پنپ رہی تھیں کہیں جمود تھا تو کہیں تذبذب۔ ایسے میں آپ نے بہترین قائدانہ صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے نظم کے طے شدہ اہداف کے حصول میں اپنی ساری توانائیاں خرچ کیں۔ اپنی ٹیم میں پرعزم اور متحرک افراد کو شامل کر کے کارکنان کو اگلی منازل کی طرف پیش رفت کا حوصلہ دیا۔

بیرونِ ملک منتقلی:

بچی کے علاج کی خاطر آپ کے خاندان کو بیرون ملک منتقلی کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اور ۱۹۹۶ء میں آپ پورے خاندان کے ساتھ امریکا منتقل ہوگئیں۔ اقامتِ دین آپ کا نصب العین تھا آپ نے ہمیشہ اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ ''میں اللہ کے دین کو دنیا میں دوسرے نمبر پر نہیں دیکھ سکتی یہ اعلیٰ ترین دین ہے جسے دنیا میں اول نمبر پر رکھنا ہی ہمارا کام ہے۔'' میں نے محفل تو بدلی ہے منزل نہیں کے مصداق وہ پاکستان ہی سے اسلامک سرکل آف نارتھ امریکا کے ذمہ داروں کے نام اور رابطے نمبر ساتھ لے کر وہاں گئیں اور جاتے ہی متعلقہ افراد سے رابطہ کر کے فلوریڈا میں سسٹر ونگ کی ممبر بن کر کام کرنا شروع کر دیا۔

سراپا تحریک:

وہ سراپا تحریک تھیں جس منصب پر رہیں ہر جگہ انہوں نے مستحکم بنیادوں پر کام کیا جس کے گہرے اثرات مرتّب ہوئے تبلیغ دین اور خدمتِ خلق بہت لوگ کرتے ہیں لیکن ان کا وصف یہ تھا کہ وہ لوگوں کا تزکیہ وتربیت کرتے ہوئے انہیں تحریک سے جوڑ دیتی تھیں انہیں دعوت کے عملی طریقے سکھاتیں اور ان میں قائدانہ صفات کو اُجاگر کرتی تھیں۔ امریکا میں ان کی آمد بہار کے ایک ایسے جھونکے کی مانند تھی جس نے اکنا سے وابستہ ہر بہن کے دل وجاں کو معطّر کر دیا وہ اس مضبوط بنیاد کی مانند تھیں جس نے پوری تحریک کو اس طرح سہارا دیا کہ پروگرام کے تمام اجزا ٹھوس بنیادوں پر کھڑے ہوگئے۔ کسی کا انتظار کیے بغیر آپ نے ہر جگہ بحیثیت داعی اپنے کردار کی ادائیگی کی بھرپور فکر کی۔

اُجالوں کی پیامبر:

نیویارک کے مختلف علاقوں اور پھر ریاست کینٹکی میں انہوں نے خواتین میں صفر سے کام شروع کیا اس مقصد کے لیے پہلے خواتین سے انفرادی رابطے کیے پھر دعوتی حلقے قائم کیے قرآنی کلاسز اور دورۂ تفسیر کے ذریعہ لوگوں کو مقصد زندگی پر سوچنے کی دعوت دی۔ پہلے سال جب

فلوریڈا پہنچیں تو ان کی رہائش گاہ کے قریب مسلمانوں کی کوئی بڑی آبادی نہ تھی مگر اس کے باوجود انہوں نے صرف ایک ملائیشین خاتون کے ساتھ بیٹھ کر دورۂ قرآن مکمل کیا اس زمانے میں وہ پہلی بار انگلش میں قرآن کا مطالعہ کر رہی تھیں اپنے تجربہ کا ذکر کرتے ہوئے بتاتی تھیں کہ'' میں ڈکشنری ساتھ رکھتی تھی اور ترجمے کے دوران جو لفظ مشکل آ جاتا تھا تو اس کے معنی دیکھ لیتی تاکہ سمجھانے میں آسانی رہے''۔ اس کے بعد نیویارک کے کثیر تعداد کے حلقوں میں دعوتی کام کیا۔ پاکستانی، عرب، امریکن ہر زبان بولنے والی خواتین پر اثر ڈالا۔ کسی نے تھوڑا عرصہ ساتھ گزارا ہو یا زیادہ آپ کسی نہ کسی طریقے سے اسے دعوت ضرور دیتی تھیں ایک بار وہ اپنی بیٹی کے علاج کے لیے اسپتال میں اس کے ساتھ تھیں وہاں سے کارکن خواتین سے رابطہ رکھا فون پر بات کرتے ہوئے کہا'' یہاں ایک اور امریکن عورت اور اس کا بچہ بھی موجود ہے میری فون پر طویل گفتگو شاید اسے ناپسند ہے میں بعد میں تم سے بات کروں گی'' اگلے دن فون کیا تو بتایا کہ ''میں نے اس سے دوستی کے لیے اس کے کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ بچے کی بیماری اور مشکلات کے حل بتائے تو وہ خود ہی اسلام کے بارے میں سوال کرنے لگی، میں نے اسے ترجمہ قرآن اور کچھ کتابچے تحفے میں دیے ہیں اور متعلقہ ویب سائٹس کے حوالے دے دیے ہیں''۔

ناظمۂ اعلیٰ اِکنا ویمن ونگ:

۱۹۹۸ء میں آپ سرعت کے ساتھ تمام تحریکی مدارج کو طے کرتے ہوئے ناظمہ اعلیٰ اکنا ویمن ونگ منتخب ہوگئیں۔ انہوں نے زندگی میں ہمیشہ منصوبہ بندی سے کام کیے۔ قلیل المیعاد کاموں کی الگ اور طویل المیعاد کاموں کی الگ منصوبہ بندی بڑی وسعت نظری کے ساتھ کرتیں اور پھر اس کے نفاذ میں لگ جاتیں، ہمیشہ افراد کو ساتھ لے کر چلتیں۔ ٹیم کو سکھاتیں کہ یہ ہمارے سال بھر کے اہداف ہیں اور اس کی روشنی میں ماہانہ، ہفتہ وار اور روزانہ کاموں کی تقسیم کریں۔ نصیحت کرتیں کہ'' جو کام صبح ہو جاتے وہ پھر سارا دن نہیں ہو پاتے''۔ ہر صبح اُٹھ کر صلوۃ الحاجات اور استخارے کی دعا پڑھ کر اپنے کام شروع کر دیا کرو۔ ان کی کوشش ہوتی کہ تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ معیار کو ذرہ برابر بھی گرنے نہ دیں۔ انہوں نے انفرادی واجتماعی غلطی

پر استغفار کرنا اور صدقہ دینا یاد دلایا۔ ہمیشہ بنیادی چیزوں نماز کی پابندی، اس میں خشوع، باقاعدگی سے قرآن کی تلاوت اور اس پر تدبر، مطالعہ حدیث، سیرت ولٹریچر پر زور دیا۔ حلقے میں دعوتی کام کو سب سے پہلے صحیح کرواتی تھیں۔ مگر اس میں ان کا انداز حاکم و ناظمہ کا نہیں بلکہ پُرخلوص بہن کا ہوتا۔ اپنے زیر تربیت روابط سے کہتیں۔ چلو ہم دونوں یوں کرتے ہیں کہ روزانہ فجر کے بعد فون پر ہی مطالعہ کریں گے''۔

اکنا میں نظامِ اخوات کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی کارکنان کے جوڑوں کو پہلے صرف ارکان میں پھر تمام کارکنان میں پھر ٹیموں اور شوراؤں میں اور پھر شہروں کے درمیان رائج کیا گیا تا کہ مختلف شہروں کے نظم اور مجالسِ شوریٰ ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھیں اور سیکھیں۔ شوریٰ میں زیادہ بولنے والے شخص اور خاموش رہنے والے کی جوڑی بنا دیتیں اور ساتھ ہی بتا بھی دیتیں کہ فلاں سے تم بات کی تہہ تک پہنچنا، رائے بنانا اور فیصلہ کرنا سیکھو اور تم فلاں سے فورم پر صحیح انداز میں سلیقے کے ساتھ بات کو پیش کرنا سیکھو۔ انہوں نے کبھی بھی اپنی ذات کو دعوت کا مرکز نہیں بننے دیا ہمیشہ ٹیم کی تیاری کی، پھر اسے نظم سے اور آپس میں جوڑا، دعوتی تڑپ پیدا کی اور تزکیے کی ترغیب دی۔ اجتماع میں کسی نہ کسی ساتھی کا تعارف یا تعریف ضرور کرتیں۔ آپس میں محبت پیدا کرتیں اگر زیادہ ساتھیوں میں سے کسی کے بہت زیادہ فون آپ کے پاس آتے تو انہیں اپنے متعلقہ نظم سے رابطے کی پُرزور تاکید کرتیں۔

بہنوں کی تربیت کے لیے جاری آن لائن قرآنی کلاسز میں آپ کی شمولیت سے جان پڑ گئی۔ آپ کی کلاس کی بہنیں گواہی دیتی ہیں کہ انہوں نے اس عظیم کتاب کو سہل اور با مقصد انداز سے پڑھایا۔ کلاس کے تمام ساتھیوں کے درمیان وہ ہار کی اس ڈور کی مانند تھیں جو موتیوں کو اپنے اندر پروئے رکھتا ہے۔ ایک دوسرے کی خوشی غمی سے سب کو آگاہ کرتیں آپس میں روابط بنواتیں شرکا سے خاص مواقع پر ان کے تاثرات لیتیں کوئی حج پر گیا کسی نے حجاب شروع کیا تو اس کے تذکرے کو سب کے سامنے بیان کر کے سب کے ایمانوں کو متحرک کر دیتیں۔ شروع دنوں میں اللہ کی صفات یاد کرواتے ہوئے کہا اس کی ہر ہر صفت کو اپنی زندگیوں میں تلاش کرو۔

مؤثر آن لائن کلاسز سے کارکن سازی تک:

آپ کے پڑھائے ہوئے شاگرد جلد ہی اہم ذمہ داریاں سنبھالتے نظر آئے، کلاس میں ناغہ نہیں کرتی تھیں کبھی دوروں کے باعث اتوار کو تاخیر سے گھر واپس آتیں تب بھی کلاس اگلے دن اپنے وقت پر شروع کرا دیتیں ہمیشہ اس بات پر توجہ دیتیں کہ سننے والے قرآن کے علم کو اپنی شخصیت کا حصہ بنالیں۔ قرآن وحدیث پڑھانے کے دوران علمی وتحقیقی امور رکھنے کے بعد عملی مثالیں اور اس کی روشنی میں عملی کام بھی دیتیں۔ اس طرح وہ علم اور تربیت کا کام ساتھ ساتھ کرتیں۔ قرآن کے ابتدائی پاروں کو پڑھانے کے بعد پوچھتی تھیں کہ ''اب آپ لوگ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ پھر پانچویں پارے کے ساتھ ہی انفرادی جائزہ کی رپورٹ فارم کا تعارف دیا جاتا اور پارے کے ٹیسٹ کو روزانہ پر کرنے کے بونس نمبر رکھ دیے جاتے۔ اس دوران اجتماعیت کا تعارف اور اس میں شامل ہو کر نصاب، تربیت گاہوں کلاسز وغیرہ سے فائدہ اُٹھانے کی رغبت دلاتیں پھر جب پندرھویں پارے پر پہنچتیں تو پچھلی کلاس کے حوالے سے انبیاء کرام کے دعوتی انداز کے بارے میں سوال کرتے ہوئے کہتیں.....''اب مجھے یہ جواب نہیں چاہیے کہ یوں کرنا چاہیے بلکہ اب یہ بتائیں کہ ہم نے حلقے میں یہ کیا اور یہ نہ کیا، اگر آدھے قرآن کے تفصیلی مطالعہ کے بعد بھی عملاً دعوت شروع نہ کی تو پھر یہ قرآن ہمارے خلاف کہیں حجت نہ بن جائے''۔

۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۱ء تک وہ اکنا کی خواتین ونگ کی ناظمہ اعلیٰ رہیں اس دوران انہوں نے ایک پوری ٹیم کی تیاری کی مرکز، شہر، حلقہ، ہر سطح پر افراد تیار کیے شعبہ جات کو منظّم کیا، تنظیم کو اسلامی شورائی نظام میں ڈھالا ہر شعبہ کے مقاصد پر ڈسکشن رکھی تا کہ مقصد کو سمجھتے ہوئے ہر ٹیم تحریک کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرے۔ دعوت کے شعبہ کے تحت انہوں نے پورے امریکا میں اکنا کے تحت دعوت کے نئے نئے انداز سمجھائے۔ پہلے ہی سال سے دعوتی اجتماعات میں مختلف تقریروں کے بجائے قرآنی کلاسز، خاص ترتیب کے ساتھ دروس قرآن اور دورۂ تفاسیر کروانے پر توجہ مرکوز کر دی۔ اس مقصد کے لیے مدرسین کی تیاری بھی تمام حلقہ جات میں

بھرپور انداز سے کی۔فون دوروں اور تربیت گاہوں کے ذریعہ تفصیلی ہدایات، ورکشاپس اور مشقی سیشن رکھوائے دعوتی مہمات کے ذریعہ کارکن میں دعوتی شوق کو بیدار کرنے اور اس کو فروغ دینے کی کوشش کی۔شعبہ تربیت میں تنظیم کے نصاب، جائزہ فارم، تربیت گاہیں اور کلاسز سب کے مقاصد زیر بحث لاتے ہوئے از سرنو ترتیب دیے۔رپورٹ کا گوشوارہ دوبارہ بنایا، اس پر تبصرے کا نظام سیٹ کیا۔تبصرہ اس طرح ہوتا کہ عمل تیز تر ہو جاتا عزت نفس بھی مجروح نہ ہوتی اور نہ کوئی خوش فہمی کے فتنوں میں مبتلا ہوتا۔

غیر مسلموں اور انگریزی دان طبقے تک دعوت:

اکنا کا کام ایک عرصے تک صرف پاکستانیوں اور اردو زبان بولنے والے مسلمانوں تک ہی محدود تھا ۱۹۹۱ء کے عشرے میں انگریزی میں کام کی طرف پیش رفت ہوئی، ڈاکٹر فوزیہ نے اس کام کو ''اسرۂ ماریہ قبطیہ'' کے نام سے بھرپور انداز میں منظم کیا۔ان کا زور حکمت اور تربیت پر تھا انہوں نے پہلے ایسے افراد کی تیاری پر زور دیا جو مقامی آبادی کو سمجھ کر ان میں کام کر سکیں اور ان کی تنظیم و تربیت بھی ان ہی کی زبان میں ہو اسی زبان میں لٹریچر پڑھیں تربیت گاہیں اور تنظیمی اجتماعات کریں تاکہ پہلی مقامی ٹیم کو تحریک کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آجائے، اسی سوچ کے تحت انہوں نے ٹیم تیار کی اس کا نصاب طے کیا، رمضان میں ان کے لیے آن لائن دورۂ تفسیر کروایا آپس میں ان کے محتسب گروپس بنوائے اور ہمیشہ اس کام کی حوصلہ افزائی بھی کی اور مشاورت بھی فراہم کی۔

نائن الیون اور حکمت عملی میں تبدیلی:

ان کے دورِ نظامت میں ہی امریکا میں نائن الیون کا حادثہ پیش آیا جس کے بعد وہاں مقیم مسلمانوں کے لیے حالات بہت مشکل بنا دیے گئے ایسے میں آپ نے اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر سرکلرز اور آن لائن ڈسکشنز کے ذریعہ ایمان کو مضبوط رکھنا سکھایا۔آن لائن میٹنگز میں رخصت و عزیمت کے موضوع پر مکالمہ کرتے ہوئے نصیحت کی کہ اپنی ذات کی حفاظت کے لیے ایمان کا سودا ہرگز نہ کرنا، پہلے اپنے ایمان کی حفاظت کرنا خواہ اس کے لیے اصحاب کہف کی طرح اپنے

آپ کو غار میں محصور ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔انہوں نے دعوتِ دین کے لیے جدید آلات اور ٹیکنالوجی کو خوشی کے ساتھ اپنایا، مغربی علوم اور تحقیق کو تحریک کے کام میں خوب استعمال کیا۔ دوسروں کو بھی ابھارتی تھیں کہ نئے نئے کورسز کروتا کہ دعوت کے کام میں مزید بہتری آئے۔ شوریٰ کے فیصلے سے مکمل قرآن کی ترجمہ و تفسیر کی کیسٹس بنوانے پر عمل کیا قیادت کی تیاری اور فکری و تحقیقی کام کے لیے انسٹیٹیوٹ آف اسلامک سائنسز کا قیام عمل میں لایا گیا، ویب سائٹ بنوائی گئی۔لڑکیوں کے لیے ینگ مسلم سسٹرز کا الگ گروپ قائم کیا گیا، جس کا علیحدہ دستور بھی بنایا گیا۔سالانہ پلاننگ کے تحت نصاب، رپورٹ سسٹم اور تربیت گاہیں رکھوا کر اسے مضبوط کیا گیا۔پانچ سے تیرہ سال تک کے بچوں کو MCNA (مسلم چلڈرن آف نارتھ امریکا) کے نام سے منظم کیا گیا بچوں کے لیے باقاعدہ نصاب بنایا گیا اخلاقیات کی بہتری کے لیے رپورٹ سسٹم سے مدد لی گئی اور لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ان کا اپنا رسالہ Companian کے نام سے نکالا گیا۔

''بنیان المرصوص'' کا جذبہ:

زیر تربیت افراد کو رکن کے معیار پر لانے پر توجہ مرکوز رہتی۔اس طرح تربیت کرتی چلی جاتیں کہ وہ بڑی سے بڑی ذمہ داری اُٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے۔امریکا کے ایک شہر کی ناظمہ نے بتایا کہ میرے ناظمہ مقرر ہونے کے بعد روزانہ صبح مقررہ وقت پر ان کا فون آجاتا۔ گزشتہ تجربے سے بتاتیں کہ کن چیزوں سے تحریکیں ٹوٹتی یا متاثر ہوتی ہیں۔افراد کے مسائل بیان کر کے ان کا حل تلاش کرتیں اور ہمیں سوچنے پر مجبور کرتیں۔جو پہلے سے کھڑی تھی اسے چلنے پر تیار کیا اور جو چلنے والی تھی اس کو دوڑنے کی راہ دکھائی۔فون کانفرنس کے ذریعے روابط بڑھانے اور ایک وقت میں دو افراد کو کام سکھانے کی روایت بھی تحریک میں انہوں نے ہی ڈالی۔نظامت کا حلف اُٹھانے والی ایک اور بہن کو بتایا کہ ''انسان کو پانی کی طرح اپنا راستہ تلاش کرنا آنا چاہیے''۔بڑوں کے مرتبہ کا انہیں ہمیشہ خیال رہا نوجوان بہنوں کو ذمہ داری ملتی تو سکھاتیں کہ ''اگر بڑوں کو کچھ کہنا ہو تو سیدنا ابراہیمؑ کا انداز یاد کر لیا کرو، کس طرح ابا جان، ابا

جان کہہ کر والد صاحب کو پیار سے پکارا، مگر صحیح بات ضرور کہہ دی۔ ہر حال میں اپنی ذات کو پیچھے اور حکم الٰہی کو آگے کرنا، اپنی آواز کو پست، نگاہ نیچی، لیکن جوش و جذبہ بلند اور اُمید اچھی رکھنا''۔

ناظمہ بننے والی ایک بہن نے حلف اُٹھایا تو فوزیہ نے کہا'' تم رسولؐ خدا کی وراثت میں شامل ہوئی ہو، ہم حق میں تمہارا ساتھ دیں گے غیر حق میں نہیں۔ اس وراثت کی منتقلی پر میں تمہیں مبارکباد دیتی ہوں''۔ مشورہ دیتیں کہ بات کو قرآن وسنت کے حوالے سے شروع کرو، جب تک ذمہ داریوں پر ہو جو چاہو گوا ہیاں لے لو اور کام اور فیصلے کروالو۔ شوریٰ کی اہمیت اور آداب سمجھاتے ہوئے کہتیں کہ موقع پر کی گئی بات کی اہمیت اور ہے بعد میں وہی بات چاہے لاکھ روپے کی ہو کہنے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی''۔

ایک بہن ایک تربیت گاہ میں بنیان مرصوص کے موضوع پر ان کے پروگرام کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں'' نشست گاہ میں بیٹھی تھی کہ مقرر کی پرجوش آواز کانوں سے ٹکرائی۔ سب بہنیں کھڑی ہو جائیں آپ کو بنیان مرصوص بننا ہے ہر بہن اپنی برابر والی بہن کا ہاتھ تھام لے۔ ہاتھوں کو تھام کر اُوپر اُٹھائیں۔ اب آپ بنیان مرصوص بن گئی ہیں بس یہ بنیاد آپ کو اپنے نصب العین کی راہ میں فولاد سے زیادہ مضبوطی دے گی''۔ ہر ساتھی کے کام آنا ان کا شوق تھا کسی کے گھر جاتیں تو گھر داری میں اس کی مدد کراتیں کوئی قریب رہنے والی ساتھی بیمار ہوئی تو اس کے گھر پہنچ کر اسے بستر پر لٹا کر گھر کے کھانے پکانے کے ساتھ ساتھ گھر میں ہونے والے مردانہ اجتماع کے لیے ریفریشمنٹ بھی تیار کر دیتیں۔ تعلقات میں گرمجوشی پیدا کرنے کے لیے تحائف دیتیں لیکن اس میں بھی سوچ یہی غالب ہوتی کہ ضرورت میں کام آئے اور اقامت دین کی جدوجہد کے لیے ساتھی کا وقت بچے۔ ساتھیوں کے ساتھ مل بیٹھنا، ہنسی مذاق کرنا اور ہلکے پھلکے ماحول میں کام کرنا انہیں بے حد پسند تھا۔ دعوت کا کام سکھانے کے لیے تحریکی بہنوں کو ساتھ لے کر قریبی گھروں میں جاتیں۔ ساتھ کوئی کتاب، میگزین یا دعاؤں کے اسٹکرز لے جاتیں۔ پہلے رسالہ یا کتاب میں سے کوئی اچھی بات پڑھ کر سناتیں پھر اسے پڑھنے کے لیے دیتیں۔ عید کے موقع پر پوری مسلم کمیونٹی کو جمع کر کے خوشی منانے کی کوشش رہتی۔

تحریکی امانتوں کی حساسیت:

بیت المال کے حوالے سے وہ بہت زیادہ حساس تھیں، اس سے بھی ڈرتی تھیں کہ حساب کتاب میں کوئی غلطی ہو اور اس سے بھی کہ آنے والی رقم کا استعمال صحیح نہ ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ ''اس کا بھی سوال ہوگا کہ پیسہ کہاں سے آیا کہاں استعمال ہوا اور اس کا بھی کہ جہاں استعمال ہونا تھا وہاں استعمال کیوں نہ ہوا؟'' ہر اجلاس میں خصوصی وقت وتوجہ بیت المال کو دیتی تھیں۔ تربیت گاہ میں بیت المال پر پروگرام بہت توجہ سے تیار کراتیں اور اگلی صف میں بیٹھ کر سنتی تھیں، کہتی تھیں کہ'' حساب کتاب میں لاپرواہی اور غیر ذمہ داری ہی سے تحریکوں میں شگاف پڑتا ہے''اسی حساسیت کے پیش نظر انہوں نے شدید بیماری کی حالت میں بھی مرکزی شوریٰ اور بیت المال کی انچارج کو ایک ساتھ بجٹ بنانے کا طریقہ سکھایا اور اپنے ہاتھوں سے لکھ کر بھی بھیجا۔ آپ نے شوریٰ کے ادارہ کو مضبوط ومنظم کرنے کی بھرپور سعی کی۔ شوریٰ کے اُصول و ضوابط کو تحریری شکل دی۔ شوریٰ سے قبل اس کا ایجنڈا روانہ کرتیں اور شوریٰ کو فکری تیاری کرنے کی ہدایت کرتیں۔ شرکا کے سامنے شوریٰ کے فرائض اور کردار واضح کرتیں۔ ہر بہن کی گفتگو بڑے غور سے سنتیں۔ جلد بات کی تہہ تک پہنچتیں اور گھنٹوں پر مشتمل بحث کو چند منٹوں میں بڑی خوبصورتی سے سمیٹ کر تجزیہ پیش کر دیتیں۔ فیصلے جلد بازی سے اور یکطرفہ طور پر کرنے کے بجائے پوری کوشش ہوتی کہ تمام فیصلے مرکزی شوریٰ کی دلجمعی اور یکسوئی سے ہوں۔ اپنی رائے سب سے آخر میں دیتیں اور اگر اکثریت ان کی رائے سے اتفاق نہ کرے تو خوشدلی سے اپنی رائے واپس لے لیتیں۔ اکنا خواتین مرکز کے لیے ایک جگہ خریدنے کا فیصلہ کیا، اس کے لیے فنڈ جمع کیا گیا پھر ایک جگہ کا انتخاب کیا گیا جس میں سالانہ تربیت گاہ رکھی گئی تاکہ سب لوگ اسے دیکھ لیں، خواتین کی اکثریت اسے خریدنے کے حق میں نہ تھی تو انہوں نے اسے خریدنے کا فیصلہ تبدیل کر دیا اس کے ساتھ جن افراد سے فنڈ لیا گیا تھا ان سب سے فون پر بات کی اور جنہیں رقم واپس کرنی تھی انہیں رقم واپس کر دی۔

محبت فاتح عالم:

بہترین مربیہ بننے کے لیے انہوں نے محبت فاتح عالم کا نسخہ اپنا رکھا تھا اس راہ کی ہر بہن سے انہیں بے حد لگاؤ تھا عمر میں بہت چھوٹوں اور بہت بڑوں سے بھی ان کی ایسی ہی دوستی ہو جاتی جیسے اپنی ہم عمر سہیلیوں سے ہوتی ہے۔ جانتی تھیں کہ کون سی بہن کس طرح بات سمجھتی اور متحرک ہوتی ہے۔ چیلنجز اس طرح پیش کرتیں کہ انسان مسابقت کے جذبے سے انہیں بڑھ کر قبول کر لینے پر مجبور ہو جائے۔ لوگوں کو ان کی طبیعت اور عادات کے ساتھ قبول کرتیں مگر جہاں تبدیلی کی ضرورت ہوتی اپنی محبت اور رفاقت کے ہتھیار سے انتہائی مہارت سے وہ تبدیلی لے آتیں۔ ہر بہن یہ سمجھتی تھی کہ آپ سب سے زیادہ اس سے ہی محبت کرتی ہیں۔ وہ کام تفویض کرتے ہوئے سوچ بچار کر کے دو ساتھیوں کا جوڑا بناتیں اور جب ان کا لگایا ہوا دوستی کا پودا پھل دینے لگتا تو بے انتہا خوش ہوتیں۔ ایک تحریکی بہن نے بتایا کہ میرے شوہر آٹھ ماہ سے بیروزگار تھے میں حالت حمل سے گزر رہی تھی وہ امریکا میں تھیں اور میں کینیڈا میں تھی وہ ہر ہفتہ مجھے فون کر کے میری خیریت لیتیں، کینیڈا کی تحریکی بہنوں کو میرا خیال رکھنے کی ہدایت کرتیں۔ میرا بیٹا ہوا تو امریکا سے تحائف بھیجے جس میں ان کے ہاتھ کا بنا ہوا سوئیٹر سیٹ بھی تھا، شوہر کو جاب ملنے پر میں نے انہیں فون کیا تو کہا کہ ''ٹھہرو۔ پہلے میں نفل پڑھ لوں پھر تمہیں دوبارہ فون کرتی ہوں''۔ اپنے اس حسن اخلاق سے ہر ساتھی کا دل موہ لیتی تھیں۔ ایک بہن کے جوان سال بھائی کا کراچی میں انتقال ہوا امریکا خبر پہنچی تو دل فگار ساتھی کو اپنا غم ہلکا کرنے کے لیے سب سے پہلے فوزیہ ناہید کا ہی خیال آیا۔ فوراً انہیں فون ملایا جبکہ وہاں رات کے دو بجے تھے اس بہن کے کہنے کے مطابق ''فوزیہ پوری رات میرا غم بانٹتی رہیں، کہتیں آپ مجھ سے اپنے بھائی کی خوبیاں بیان کریں فرشتے اس پر آمین کہیں گے''۔ وہ بہن کافی وقت گزر جانے کے بعد انہیں کہتی رہیں کہ آپ جا کر سو جائیں لیکن ڈاکٹر فوزیہ کا جواب تھا ''میں اگر سو بھی گئی تو آپ تو جاگتی رہیں گی۔ ہم مل کر غم بانٹتے ہیں، بالآخر فجر کا وقت ہو گیا اور وہ بھائی کے لیے مغفرت کی طویل دعا کرتے ہوئے رخصت ہوئیں''۔ خود بھی بہترین تعلق بناتی تھیں اور

ساتھیوں کے مابین بھی بہترین تعلق دیکھنے کی خواہشمند رہتی تھیں افراد کے مثبت پہلو پر نظر رکھتیں منفی بات نہ سننا پسند کرتیں نہ کسی کو کہنے دیتیں۔ ''میں لوگوں کا نام لے کر دعا کرتی ہوں اگر تمہیں بھی کسی کی طرف سے دکھ پہنچے تو اس فرد کا نام لے کر دعا کیا کرو''۔ ایک مرتبہ کسی ساتھی کو کسی پر غصہ آیا تو کہا ''اپنے ظرف کو سمندر کی طرح کر لو جس میں چھوٹے چھوٹے دریا آ کر ملتے ہیں تو شور نہیں ہوتا بلکہ وہ انہیں اپنے اندر سمو لیتا ہے جبکہ ندی نالوں میں ایک پتھر بھی پھینک دیا جائے تو اُبال آ جاتا ہے''۔

انہیں تحریک اسلامی کا کمپیوٹر کہا جاتا تھا ان تک اطلاع پہنچنے کا مطلب تھا کہ اب سارے نیٹ ورک کو اطلاع مل جائے گی کسی کی خوشی یا غم سے متعلق کوئی خبر سنتیں تو دوسری بہنوں سے کہتیں چلو ہم مل کر فون کر لیتے ہیں۔ خود بیمار تھیں لیکن ایک بہن کے بچے کے پیٹ میں درد کا سنا تو اسے فون کر کے دوا بتائی۔ صبح سویرے پانی پلانے کا مشورہ دیا اور روز صبح سات بجے فون کر کے اسے یاد دلاتیں کہ بچے کو پانی پلانا بھول نہ جانا۔ ایک دوسری بہن کو کینسر کی تکلیف کا سنا تو اپنی بیماری بھول کر فوراً سے فون کیا ہمت بڑھائی غذا اور آرام کے متعلق دیر تک مشورے دیے اور اللہ کے ذکر کی تاکید کی۔ ایک بہن کے حج پر جانے کا سنا تو اسے مشورہ دیا کہ ''یہ دعا بھی اپنی دعاؤں میں شامل کر لو کہ اللہ ایسی یادداشت عطا کر جس میں لوگوں کی طرف سے کیے گئے اچھے عمل اور اچھی یادیں باقی رہیں، لیکن ان کی تکلیف دہ باتیں محو ہو جائیں''۔ ایک بہن کے شوہر کی تحریکی ذمہ داری میں اضافہ ہوا تو اسے نصیحت کی کہ تمہیں تو اس موقع پر حضرت خدیجہؓ کا کردار ادا کرنا ہے۔ ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کا بھی انہیں خوب ہی خیال رہتا۔ ہر بڑے پروگرام کے اختتام پر کارکنان کو خوب مبارکباد دیتیں اور کہتیں دیکھو۔ ''اللہ نے تم سے یہ کام لے لیا اب اگلے کی تیاری کرو''، ساتھ ہی ساتھ کہتیں ''قیادت نہ بیٹھتی ہے نہ سست پڑتی ہے اگر قائد ہی سست پڑ جائے گا تو پھر کارکنان کہاں جائیں گے؟'' غیر ملکی بہنوں کا بھی خیال رہتا تھا۔ جرمنی میں مقیم بہن لکھتی ہیں کہ ''میں ایک غیر مسلم ملک میں تنہا مختلف قسم کے مسائل سے دوچار انتہائی اداس رہتی تھی انہی حالات میں گھرے ہوئے ایک دفعہ ان کو فون کر لیا۔ ان کی باتوں سے مجھے ایسے لگا جیسے میں نے دیارِ غیر میں اپنی ماں کو پا لیا ہو۔ پھر وہ ہمیشہ مجھے خود فون کرتیں اور فون

کے ذریعے زندگی بخش توانائی دیتیں۔ میرے ہر چھوٹے بڑے مسئلے کا حل دیتیں۔ مجھے انہوں نے نصیحت کی کہ خود دین کا کام شروع کر دو اور بچوں کو بھی اس میں لگا لو اور کسی کی پروا نہ کرو۔ ان ہی کے ہمت بندھانے پر میں نے آہستہ آہستہ اپنے مقام پر اس کام کا آغاز کیا۔ ان کے مشورے میرے لیے رہنما ہوتے تھے اور اگر مالی مدد کی ضرورت پڑی تو وہ بھی انہوں نے فراہم کی اور نیکی کے اس کام میں ہمیشہ اپنا حصہ ڈالتی رہیں'۔

تھوڑی سی مدت میں انہوں نے ہر سطح اور ہر سمت میں تحریک کو پھیلانے اور استحکام دینے کی کوششیں کیں۔ وہ صرف دوسروں کو نصیحت نہیں کرتی تھیں بلکہ خود عملی مثال پیش کرتی تھیں، متعارف کرائے گئے مختلف نئے پراجیکٹس میں انہوں نے سب سے پہلے خود آگے بڑھ کر کام کیا۔ کہتی تھیں: ''مجھے کیا حق ہے کہ میں کسی کو یہ سب کام کرنے کا سالانہ پلاننگ کے ذریعہ حکم دے دوں اور پہلے سے خود میدان میں موجود نہ ہوں۔ ایک اچھا لیڈر تو پہلے خود میدان میں اُترتا ہے اور پھر آواز لگاتا ہے کہ آؤ میرے ساتھ چلو، میرا ساتھ دو' ان کے اسی عمل کے پیش نظر ان کی بات میں اللہ نے تاثیر رکھ دی تھی جب ہی ان کے ساتھی بھی پوری طرح متحرک نظر آتے۔

تعلق باللہ:

بندوں سے بہترین تعلق کی بنیاد دراصل ان کا اللہ سے بہترین تعلق تھا جو انہیں ہر حال میں کھڑا رکھتا۔ وہ عزیمت کی راہی تھیں۔ کبھی کام کی زیادتی کا شکوہ نہیں کیا۔ اکثر کہتیں۔ اللہ کے دین کا کام 'آہ' سے نہیں 'واہ' سے کرنے کی چیز ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے انہیں انتہائی محبت تھی، جو اُن کے انداز و اطوار، اُن کے شب و روز، ان کی دعاؤں اور ان کی اداؤں میں نظر آتی تھی۔ اس محبت نے ان کے دل اور ان کی باتوں میں ایسا سوز پیدا کر دیا تھا کہ سننے والے بھی متاثر ہو جاتے اور نیکی میں آگے بڑھنے کے لیے مستعد ہو جاتے۔

ذوقِ مطالعہ:

ان کے اوقات کا ایک بڑا حصہ قرآن و حدیث کے مطالعہ پر صرف ہوتا۔ گہرائی سے مطالعہ کرتیں۔ نوٹس بناتیں اور عمل کی پوری کوشش کرتیں۔ زندگی میں چھوٹی بڑی سنتوں پر اہتمام کا عمل نظر آتا تھا خصوصاً آپؐ کی دعاؤں کو یاد کر کے موقع کی مناسبت سے انہیں پڑھا کرتی تھیں یاد کرنے والی دعاؤں کو لکھ کر فریج پر لگا لیتیں تاکہ یاد کرنے اور رکھنے میں آسانی رہے۔

ہر چھوٹی بڑی ضرورت کے لیے صلوۃ الحاجت پڑھنا معمول تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ زندگی میں کوئی بھی چیز محبت کا مرکز نہیں بننا چاہیے، سوائے اللہ کی ذات کے۔ ایک دل میں دو محبتیں جمع نہیں ہوسکتیں، یا اس دنیا کی یا اللہ کی محبت ہوگی۔ دنیا کو بس اتنا حاصل کرنا چاہیے جتنی آخرت بنانے میں مددگار ثابت ہو سکے''۔ سرعت کے ساتھ نیکی کو اپنانے کی قائل تھیں دوسروں کو بھی سمجھاتی تھیں کہ ''نیکی جب دستک دے تو دروازہ فوراً کھول دینا چاہیے ورنہ وہ کسی اور دروازے پر چلی جائے گی''۔ قرآن و سنّت سے صبر، شکر، توکل اور استقامت کے درس حاصل کیے اور انہیں اپنی زندگی کا حصہ بنالیا۔

ازدواجی زندگی:

ان کے شوہر گواہی دیتے ہیں کہ ''۱۹۹۷ء میں جب ہم نیویارک کی نواحی بستی نیوروسٹیل میں منتقل ہوئے تو اکنا کا سالانہ کنونشن پیٹرز برگ میں منعقد ہونے والا تھا میرے لیے جاب سے رخصت لینا ممکن نہیں تھا، تو وہ دوسرے تحریکی افراد کے ساتھ پانچ چھوٹے بچوں کو لے کر وہاں پہنچ گئی اور واپسی میں دعوتی کام کی امنگ اور آئندہ کام کا نقشہ لے کر واپس پلٹی اسی دوران میں میری ریذیڈنسی کے مصروف اور مشکل مراحل تھے اور چھوٹے بچوں کی لامتناہی مصروفیات بھی تھیں، لیکن فوزیہ نے ایک توازن کے ساتھ سب معاملات کو نبھایا۔ میرے آرام کا خیال رکھنا اور میرے انکار کے باوجود گھر آنے پر تازہ کھانا تیار رکھنا اس کا معمول تھا۔ ایک شام اس نے قریبی اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر ایک اور ڈاکٹر کو بھی کھانے پر بلالیا جس نے کھانے کی میز پر نظر ڈالتے ہی پوچھا کہ What is the Occasion? (کون سی تقریب ہے؟) تو اس کا فوری

جواب دیا My Husband is at home (میرے شوہر گھر پر ہیں) اپنی شادی شدہ زندگی میں اس نے لطافتوں اور حسن اخلاق کے رنگوں سے محبت کے پودے کی مسلسل آبیاری کی اور اسے توانا رکھا۔ سسرال سے ڈاکٹر فوزیہ کے تعلقات معمول اور روایت سے بڑھ کر بہت قریبی تھے، میرے تمام بہن بھائیوں کے ساتھ خلوص کا رشتہ تھا اور سب کو اپنے ہاں اصرار سے آنے کی دعوت دیتی تھیں ان کے آنے پر ان کی خاطر داری کرنا، ان کے لیے خوش ذائقہ کھانے پکانا، پکنک پر لے کر جانا ان کی خوشیوں کو دوبالا کرتی تھی۔ ساتھ ہی پورے خاندان کو دین سے قریب کرنے کی فکر رہتی تھی۔ اپنے انتقال سے پہلے خالہ، ساس، نندوں سب کو بلا کر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ''آپ سب نے مجھ سے اپنے تعلق کا حق ادا کر دیا''۔

تربیت اولاد:

ڈاکٹر فوزیہ ایک بیٹے اور چار بیٹیوں کی ماں تھیں۔ بچوں کی تربیت کے لیے ان کی سوچ کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ انہیں محبت کی اتنی مضبوط ڈوریوں سے باندھ کر رکھا جائے کہ کوئی اور کشش ان کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے، اسی صورت میں وہ آپ کی بات اور نصیحت کا وزن محسوس کریں گے اور من کی چاہت کے ساتھ نیکی کی طرف آگے بڑھیں گے۔ ان کے بچے بیان کرتے ہیں کہ ''امی نے ہمیں اپنا بہترین وقت دیا اگر ہمارے آنے کے اوقات میں وہ فون پر بھی مصروف ہوتیں تو ہولڈ کرا کے ہمیں اچھی طرح سلام کرتیں اور دعا پڑھ کر استقبال کرتیں۔ ہر دن کا کچھ حصہ وہ ہمارے ساتھ بیٹھتیں اور باتیں کرتیں، کبھی الگ الگ کبھی مشترکہ، ہماری خوشیوں سے لطف اندوز ہوتیں، کامیابیوں کی تقریب منعقد کرتیں، ہماری مشکلات کو سمجھتیں اور اس طرح دلاسہ دیتیں کہ دل ہلکا ہو جاتا، صبح کی سیر کے لیے وہ بچوں کو فجر کے بعد ساتھ لے کر جاتیں، سیدھے ہاتھ سے شروع کرتیں اور صبح کی دعاؤں کا ورد کرتی جاتیں اس طرح ہم کو بھی دعائیں یاد ہو گئیں۔ ہفتہ کی صبح تربیتی کلاس رکھتیں اپنے والد کا اُصول یاد کراتیں کہ ''کل کا کام آج کرو اور آج کا ابھی کرو'' کہتی تھیں کہ ''پانچ بچے ہاتھ کی پانچ انگلیوں کی طرح ہیں، ایک بھی ٹوٹ جائے تو ہاتھ پوری طرح کام نہیں کر سکتا''۔ ان کی

بیٹی بتاتی ہیں کہ امی نے ہمیں مضبوط بنانے کے لیے اعتماد اور آزادی دی۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ تمہیں اتنا طاقتور ہونا چاہیے کہ کوئی تم سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ معاف کرو اور بھول جاؤ ان کا پسندیدہ مقولہ تھا۔ ہم میں سے کسی کی آپس میں لڑائی ہو جاتی تو وہ ہمیں بٹھاتیں، پانی پلاتیں، وضو کراتیں اور پھر صبر کے ساتھ پوری تفصیل سن کر حل کے لیے مشورہ دیتیں۔ وہ توانا تخلیقی صلاحیتوں کی حامل تھیں۔ ہر وقت کچھ نیا کرنے کے لیے تیار رہتیں، خوش مزاج تھیں اور ان کی کھنکھناتی ہنسی ہمیں بھی مسکرانے پر مجبور کر دیتی اور پورا کمرہ روشن ہو جاتا۔ ہمارے ساتھ کھیلتیں، کچن میں نئی ڈشز بنانے کا تجربہ کرتیں ہمارے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام بناتیں۔ ہم چاروں بہنوں کو بڑا ہونے پر ایک ساتھ کھڑا کر کے پاکستانی کھانے بنانے سکھائے۔ گھر کے کاموں کو ہمارے درمیان تقسیم کر دیا تھا اور اگر ہم اپنے کسی کام کی زیادتی کی شکایت کرتے تو اس وقت کام کرنے سے روک دیتیں کہتیں ''ابھی یہ کام مت کرو صفائی کرنے سے خوش ہونا چاہیے نہ کہ غصہ آنا چاہیے وہ خود ایک وقت میں کئی کام کرنا پسند کرتی تھیں، کھانا بھی پکاتی جاتیں اور ساتھ ساتھ تحریکی بہنوں سے ہیڈ فون کے ذریعے گفتگو بھی جاری رہتی۔ وہ ہمارے لیے صرف ماں ہی نہیں بلکہ دوست اور استاد بھی تھیں''۔

بستر مرگ پر صبر اور داعیانہ کردار:

ڈاکٹر فوزیہ ناہید کو قرآنی سورتوں میں سب سے زیادہ سورۃ واقعہ ''سابقون الاولون'' کے بلند مرتبہ اور مقام کے تصور کے باعث متاثر کرتی تھی اور وہ خود اس مرتبے تک جدوجہد کے راستے کو اپنائے ہوئے تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کینسر کی بیماری کی تکلیف میں آزما کر اس مرتبہ تک پہنچنے کا راستہ فراہم کر دیا۔ ۲۰۰۳ء میں انہیں شوگر کے مرض کی تشخیص ہوئی اور ۲۰۰۵ء میں سرطان۔ ہر مشکل میں صبر سے کام لینے والی ڈاکٹر فوزیہ نے اس بیماری کے آگے بھی صبر کو ڈھال بنا لیا۔ ان کی خالہ بتاتی ہیں کہ بیماری کے بعد مایوسی کا کوئی جملہ تو درکنار اس کا ہلکا سا شائبہ تک اس کے چہرے پر کبھی نہ دیکھا۔ اس نے کبھی ہمت نہ ہاری، ڈٹ کر بیماری کا مقابلہ کیا۔ ہمیشہ زبان پر الحمدللہ کا کلمہ تھا حالانکہ ڈاکٹرز نے پہلے ہی انہیں اس بات سے آگاہ

کر دیا تھا کہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے لیکن اللہ کی اس بندی نے کبھی بھی کسی قسم کی گھبراہٹ یا بے چینی کا اظہار نہ ہونے دیا حتیٰ کہ اس حال میں بھی اس عزم کا اظہار کیا کہ میں تحریک کے لیے گھر پر رہ کر ہی اپنی ذہنی صلاحیتوں کے ذریعہ جو کچھ کر سکتی ہوں ضرور کروں گی۔ اپنی بیماری کی اطلاع دیتے ہوئے ذمہ داری سے رخصت لینے کے لیے اِکنا کی ناظمہ اعلیٰ کو خط میں تحریر کیا کہ:

''میں آپ کو یہی نصیحت کروں گی کہ، ''لاتحزن ان اللہ معنا'' میری گزارش ہے کہ مجھ پر موجود تمام ذمہ داریاں اچھے اوصاف رکھنے والی بہنوں میں بانٹ دیں۔ بنی اسرائیل کا زوال امانت کے ضیاع سے شروع ہوا تھا اور میں امت مسلمہ کے زوال کا نہیں عروج کا زینہ بننا چاہتی ہوں میں سب کی محبت دعاؤں اور خلوص کی قدر دان ہوں مجھے آپ سب کے عمل ہی کی ٹھنڈ درکار ہے مجھے ہر شعبہ پیارا لگتا ہے میری خوشی ہے کہ ہر شعبہ ترقی کرے اور ہر شعبے کی ہر نیکی میں اجر ملے''۔

ذمہ داری سے فراغت لینے کے بعد بحیثیت کارکن اپنی بیماری کو کبھی عذر نہیں بنایا، ضرورت پڑنے پر ہر شعبہ اور ہر میٹنگ میں ان کا پرخلوص وجود شامل ہوتا۔ جب شعبہ دعوۃ نے حج کے بارے میں ایک پروگرام کی آڈیو کیسٹ ڈاکٹر فوزیہ سے ریکارڈ کروانے کا فیصلہ کیا تو اپنی بیماری کے باوجود انہوں نے اس کی ریکارڈنگ مکمل کروائی۔ فون پر ریکارڈنگ کی جاتی۔ اس کام کی نگران بہن بتاتی ہیں کہ ہم انہیں کہتے تھے کہ جب بھی آپ بہتری محسوس کریں تھوڑا تھوڑا ریکارڈ کروادیا کریں پندرہ بیس دنوں میں انہوں نے یہ کیسٹ ریکارڈ کروادی ریکارڈنگ کے دوران ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ تھک گئی ہوں لیکن پھر ہمت جمع کر کے اسی جوش و جذبہ سے ریکارڈنگ شروع کر دیتیں پورا پروگرام ریکارڈ کروایا، جس کی ''میں حاضر ہوں یا رب'' کے عنوان سے سی ڈی اکنا کے کنونشن میں جاری کی گئی۔

اسپتال میں داخل ہونے سے کئی روز پہلے ایک دفعہ پیٹ سے پانی نکلوا کر گھر آئیں تو ڈائری میں لکھا۔ اس ساری بیماری کے شدید مراحل میں اپنے اوپر بیتنے والی تکلیف کی شدت پر غور کرتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ جانکنی کا عالم اس سے بھی زیادہ سخت ہوسکتا ہے اس لیے یہ دعا

کثرت سے کرنی چاہیے۔ **اللھم اعنی سکرات الموت اللھم اعنی علی غمرات الموت اللھم الرفیق الاعلیٰ.**

پہلی بار کیموتھراپی کے بعد طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ اِکنا کے دعوتی پراجیکٹ Why Islam? میں مرکزی سطح پر بھی شامل ہوگئیں اور اس کام میں خواتین کے نظم کا بھرپور منصوبہ تیار کرایا مقامی آبادی میں تیزی سے کام کرنے کے حوالے سے کارکنان کے اندر جذبہ بیدار کیا اور Why Islam پراجیکٹ کے لیے مرکزی ٹیم تیار کی۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ اس پراجیکٹ کے ذریعے مسلمان ہونے والی کسی بہن کو وہ خود کلمہ شہادت پڑھائیں، جب ایسا ایک موقع فراہم ہوا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی انہوں نے اس فون کال میں دیگر چند بہنوں کو بھی شریک کیا اور ایک نومسلم خاتون کو کلمہ شہادت پڑھانے کی سعادت حاصل کی۔ طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اکنا کی سرگرمیوں میں شرکت سے قاصر ہوگئیں اسی عرصے میں اکنا کا سالانہ کنونشن منعقد ہوا جس کے بعد انہوں نے ناظمہ کو خط لکھ کر اپنے احساسات کا اظہار کیا۔ ''میں اس کنونشن میں نہ جانے کے باوجود بھی آپ کے ساتھ ہی رہی ہوں آپ سے استدعا ہے کہ جب بھی نیکی کا کام کریں تو مجھے یاد کر لیا کریں مجھے آپ کے حصے میں سے اپنا حصہ لینا ہے۔ زندگی کے ہر دور میں انسان کی خواہشات نئے عزم کا روپ دھار لیتی ہیں اور بیماری بھی نئے عزائم دیتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ میرے اللہ تو مجھے صحت اور زندگی کی ہمت وطاقت سے نوازتا رہے تو میں اپنے جسم کے ایک ایک خلیہ کو تیری راہ میں تھکانا چاہتی ہوں اس طرح کہ ہر سیل پکار پکار کر یہ کہے مجھے تو اللہ کی راہ کی محنتوں اور تھکاوٹوں نے نڈھال کر دیا ہے اور جب میرا رب مجھ سے پوچھے کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ تو میں بار بار یہی زبان حال، زبان قال سے کہوں گی اے رب تیری محبت میں .....اے رب تیری محبت میں''۔

علاج کے باوجود کینسر آہستہ آہستہ اتنا پھیل چکا تھا کہ مزید سرجری ممکن نہیں رہی ڈاکٹر نے جب حالات کی سنگینی اور بیماری کے پھیلاؤ سے آگاہ کیا تو اسے مکمل سکون کے ساتھ جواب دیا کہ ''میں اپنے اللہ کے فیصلوں پر اور اس کی رضا پر پوری طرح راضی ہوں۔ آپ اور آپ کے رفقا کی ٹیم اور اسپتال کے دیگر عملے نے جس تندہی اور مہربانی سے میرا علاج کیا ہے اس پر آپ

کی بے حد مشکور رہوں''۔ بیماری کی شدت، درد کش دواؤں کے باوجود بعض اوقات بے حال کر دیتی ایسے میں مستقل ڈاکٹر فوزیہ کی زبان پر استغفار کے کلمات جاری رہتے ساتھ کھڑے لوگ بھی درد کی شدت سے ناواقف رہتے۔ایک بہن بتاتی ہیں کہ''ان کے انتقال سے نو دن پہلے ہم ان کے گھر پہنچے اور طبیعت پوچھی تو کہنے لگیں اللہ کا شکر ہے اس کے بعد بیماری کا کوئی تذکرہ نہیں کیا پاؤں بے انتہا سوجے ہوئے تھے کہنے لگیں دیکھیں تو بھلا مجھے کیسا پہلوانی کا شوق ہوا ہے اپنی بچیوں اور نند کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگیں انہوں نے یہاں بیوٹی پارلر کھول لیا ہے، دیکھیں مالش کر کے میرے ہاتھ کتنے خوبصورت بنا دیے ہیں۔اسی دوران ڈاکٹر آیا اور اس نے پوچھا How can you express your pain at a scale of 1-10 (اگر ۱۰۔ارتک کا پیمانہ ہو تو آپ اپنے درد کو کیسے بیان کر سکو گی؟) کہنے لگیں ۸ یا ۹ تب ہمیں معلوم ہوا ان کو کتنی شدید تکلیف ہے۔وہی کھنکتی ہوئی ہنسی جو اُن کی شخصیت کا خاصہ تھی موجود تھی۔ بیماری کی وجہ سے ہنسی میں ذرا کمزوری تھی لیکن بے ساختگی وہی تھی جب انہیں خدا حافظ کہنے گئی تو میرے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ کر کہنے لگیں''باجی بزرگی کے باوجود میں آپ کے یہاں آنے کی بڑی قدر کرتی ہوں'' دو بہنیں ان کے پاؤں دبا رہی تھیں میں نے اپنا حصہ ڈالنا چاہا مگر مجال ہے جو مجھے فوزیہ نے ہاتھ لگانے دیا ہو کہنے لگیں''باجی ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، آپ میری بزرگ ہیں مجھے آپ کی خدمت کرنی چاہیے''۔ بستر مرگ پر بھی ہر فون کرنے والی سے اس کی تحریکی ذمہ داری اور ذاتی حال احوال پوچھا کرتیں۔ ناظمہ اعلیٰ نے فون کیا تو پوچھا''کاموں کا کیا حال ہے؟ اسرۃ الماریہ (عیسائیوں میں کام) کیسا چل رہا ہے؟ میں چاہتی ہوں ہماری ناظمہ اعلیٰ اس کام میں خوب اوپر جائے اور ترقی کرے''۔اس سے قبل اسپتال سے گھر آنے پر تحریکی بہن کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

''یہ بیماری میرے لیے اچانک خبر تھی لیکن اللہ نے میرے دل کو تقویت دے دی یہ سوچ کر کہ جب میں بیمار ہوتی ہوں تو وہی مجھے شفا بھی دیتا ہے یہ بیماری میرے گناہ جھاڑ دے گی، اگر زندگی رہی تو بھی پاکیزہ۔موت آئی تو بھی پاکیزہ۔اگر پریشانی کے لمحات آئے تو دعائے حاجات سے تقویت ملتی تھی، وہم پاس پھٹکتا تو تعوذات کی کثرت اور جب نماز پڑھتی

تو شفا کی آیات کا ورد کرتی رہی اسی دوران کیموتھراپی کے دوران طبیعت خراب ہوتی رہی مگر دعا + دوا + صدقہ نے مل کر اس مشکل کو بھی گزار دیا اس طرح کہ ڈاکٹر بیکر جو میرا علاج کر رہا تھا کہنے لگا کہ آپ کے صبر و حوصلہ نے ہمارے سر ہی جھکا دیے ہیں حالانکہ یہ صبر و حوصلہ میرے رب نے دیا تھا''لمحات'' پڑھی''خرم مراد'' کی زندگی پر رشک آتا رہا اس دوران کئی بہنوں سے کتاب پر تبادلہ خیال بھی کیا، اسی دوران ڈاکٹر جیولی نے اسلام قبول کر لیا۔ رمضان المبارک کے اس تحفے نے میرے ذخیرۂ الفاظ گم کر دیے۔الحمدللہ رب العالمین آخرت ایک حقیقت بن کر سامنے آ گئی تھی رسول اللہؐ کی زندگی کے آخری ایام، سورۂ النصر کے بعد کا زمانہ بار بار پڑھنے لگی تھی۔''اسپتال میں سرہانے قرآن اور دعاؤں کی کتاب کے ساتھ ایک کتاب''حضور کی مسکراہٹیں'' رکھی تھی ایک ساتھی ملنے گئیں تو کہا اس میں سے کچھ پڑھ کر سناؤ۔ چند واقعات سنائے تو بہت مسرور ہوئیں پورا ماحول خوشگوار ہو گیا۔ اسپتال میں بھی ملنے آتیں تو پوچھتیں''تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو'' پھر ہر ایک کو اس کے مزاج کے مطابق کوئی کام تفویض کر دیتیں کسی کو نماز کی تلقین، کسی کو صدقہ کی نصیحت، کسی کو دعوت الی اللہ پر آمادہ کرنا تو کسی کو حجاب لینے کی ہدایت، ایک دن اسپتال کے کمرے میں اُردو اسپیکنگ سسٹرز کے ساتھ ایک انگلش اسپیکنگ بہن بھی بیٹھی تھی ایک بہن سے کہا''تم اس سے بات کرو، اسے تنہائی کا احساس نہ ہو'' جب بھی کسی بہن کو آزردہ دیکھتیں تو پاس بلا کر بٹھاتیں اور اس سے ہنسی مذاق کرتیں بستر پر لیٹے ہوئے بھی دوسروں کا درد محسوس کرتیں ایک بہن جن کے والد کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا ان سے ملنے گئیں تو کہا''دیکھو مجھے آنا چاہیے تھا لیکن تم آ گئیں چلو پہلے تمہارے والد کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں''۔

اختتامِ زندگی:

۸ مارچ ۲۰۰۸ء کو چند قریبی تحریکی بہنیں ان سے گھر پر ملنے پہنچیں ان سے ڈھیروں اِکنا کی باتیں کیں پھر اپنا زخم دکھا کر اطمینان سے اس موذی مرض کا تعارف کرایا اور ہاتھ کے اشارے سے دکھایا کہ وہ یہاں سے یہاں تک پھیل چکا ہے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا

کہ ''میں اپنے رب کے اس فیصلے پر راضی ہوں'' **رضیت باللہ ربا وبا الاسلام دیناً وبحمد نبیاً**'' نصیحت کے لیے کہا گیا تو کہا کہ ''تحریک میں جھوٹ اور ذاتیات کو کبھی مت آنے دینا''۔

انتقال سے پہلے چند دن درد، متلی، بے چینی اور قے سے جنگ کرتے گزرے، صرف پینے کی چیزیں دی جاتی تھیں اور وہ بھی چند منٹوں بعد ناک کے ذریعہ پیٹ میں ڈالی گئی نالی سے واپس آجاتی تھیں، تکلیف کے اس عالم میں بھی جب وہ ٹھنڈے پانی، جوس یا شہد ملے شربت کا گھونٹ لیتیں تو ایک سرشاری کے عالم میں کہتیں ''اللہ تیرا شکر ہے بہت مزہ آیا''۔ آخری دنوں میں ان کی ہدایت اور خواہش پر سب بچے ان کے قریب بیٹھ کر تلاوت کرتے تھے اور خصوصاً سورۂ بقرہ اور سورۂ رحمٰن پڑھی جاتی تھی ان کے شوہر کے مطابق ۱۳/مارچ ۲۰۰۸ء جمعرات کو دن کے پونے بارہ بجے جب بیٹا بستر کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھا اونچی آواز سے سورۂ بقرۃ کی تلاوت کر رہا تھا اور پورا کمرہ اس کے لحن سے معمور تھا تو فوزیہ کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے فوزیہ کو موت کے سکرات اور غمرات سے محفوظ کر دیا ہے وہ اپنے رفیق اعلیٰ سے ملاقات کے لیے ابدی سفر پر روانہ ہوئی تو اتنی خوشی اور سکون کے ساتھ کہ جیسے کوئی مخملیں فرش پر دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے سے باہر نکل جائے تاکہ گھر والوں کے آرام میں خلل نہ آئے''۔ ڈاکٹر فوزیہ جمعرات کے دن ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں لیکن امریکا کے قوانین اور کاغذی کارروائیوں کے سبب انہیں اگلے دن ابدی آرام گاہ لے جایا جا سکا۔ امریکا کے طول وعرض سے ان کے تحریکی بہن بھائی اور اس کے ساتھ لیگزنگٹن اور اردگرد کے شہروں سے مسلم آبادی جنازے میں شریک ہوئی۔ جب ڈاکٹر فوزیہ کا جنازہ نماز کی ادائیگی کے بعد قبرستان روانہ ہوا تو جمعہ میں شریک تقریباً سب نمازی قبرستان پہنچے جن میں شکاگو، نیویارک، نیوجرسی، کنساس اور دیگر مقامات سے آئے ہوئے احباب بھی شامل تھے میت کو قبر میں اتارتے وقت مسلسل بارش ہوتی رہی اردگرد سبزہ نکھرا ہوا تھا اور ایک بے پایاں سکون کا عالم تھا۔ فطری حسن دیکھ کر ماشاءاللہ اور واہ واہ کرنے والی روح فطرت سے ہم آہنگ ہو کر دوسری دنیا کے سفر پر چلی گئی۔ ڈاکٹر فوزیہ نے اپنی کلاس کی ساتھی اور بعد کی ناظمہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ

''میں نہ ہوں تب بھی قرآن کی کلاس اچھی طرح پڑھانا، میں چاہتی ہوں کہ جس روز میری پیٹھ بستر پر لگی ہو اس دن بھی میرے نامہ اعمال میں نیکیاں ہی نیکیاں لکھی جائیں''۔ اللہ نے ان کی دعا سن لی وہ بستر مرگ پر تھیں اور اس دن ان کے شاگرد کلام پاک کی کلاس سے گریجویٹ ہو رہے تھے۔ رب کریم نے اس دنیا میں ان کی عمر سینتالیس سال لکھی تھی شاید ان کے اندر سے کوئی نادیدہ آواز ان کی رہنمائی کر رہی تھی کہ جو کرنا ہے کم سے کم وقت میں کرنا ہے ستانے کا وقت نہیں ہے لہٰذا انہوں نے اس آواز پر لبیک کہا اور جلدی جلدی اپنا کام ختم کر کے اپنی جگہ اور کئی بہنوں کو کھڑا کر کے ان سے کہا کہ چاہے کچھ ہو جائے جھنڈا نیچے نہیں گرنا چاہیے اور خود اپنے رب کے پاس چلی گئیں۔

چلے وہ غنچوں کی مانند مسکرا کے چلے
پرائے چاہنے والوں کو خوب رُلا کے چلے
جھٹک دیا سر داماں سے گردِ دنیا کو
مبارک اپنے لیے عاقبت بنا کے چلے

ماخذات:

۱۔ رسالہ ''نور'' فوزیہ ناہید نمبر۔ شمارہ دوئم ۲۰۰۸ء نیویارک
۲۔ خواتین میگزین جولائی ۲۰۰۸ء
۳۔ کتابچہ ''ایک قابل رشک کردار''، یمن اینڈ فیملی کمیشن
۴۔ فلزہ حقیق صاحبہ۔ رکن پیا
۵۔ تاثرات خالہ جان فوزیہ ناہید
۵۔ دختران فوزیہ ناہید
۶۔ کتاب: ڈاکٹر فوزیہ ناہید حیات وخدمات۔ اِکنا

کلثوم عبیدی

۱۹۳۹ء تا ۲۰۰۷ء

۱۹۶۵ء میں اپنا تمام زیور جو تقریباً پچاس تولے ہوگا، دفاع پاکستان فنڈ میں دے دیا۔ بعد میں ایک دفعہ بڑے شوق سے خود ڈیزائن کر کے چھ جڑاؤ چوڑیاں بنوائیں۔ سنار نے ڈیزائن صحیح نہیں بنایا تو خود جا کر مرضی کے مطابق بنوایا۔ جب بن کر آئیں تو بہت ہی خوبصورت اور انتہائی چمکدار چوڑیاں تھیں۔ دس پندرہ دن ہی پہنی ہوں گی کہ ۲۰۰۵ء میں کشمیر اور سرحد میں خوفناک زلزلہ آ گیا۔ خاموشی سے جا کر چوڑیاں فنڈ میں دے دیں۔ بیٹیوں نے کہا کہ چوڑیاں کہاں گئیں تو کہا کہ حفاظت سے رکھ دی ہیں۔ جب بار بار پوچھا تو بتایا کہ فنڈ میں دے دی ہیں۔ بیٹوں نے کہا آپ ہمیں کہتیں، ہم اتنے پیسے فنڈ میں دے دیتے، آپ نے اتنے شوق سے بنوائیں اور اتنی کم پہنی تھیں۔ تو کہا اللہ نے دل پسند شے اپنی راہ میں دینے کا کہا ہے، پسند تو وہ چوڑیاں تھیں پیسے تو نہ تھے۔ اس لیے انہیں ہی اللہ کی راہ میں دے دیا۔

۱۹۷۷ء کے الیکشن کا موقع تھا۔ پیپلز پارٹی اپنی حکومت کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزمانے پر مصر تھی۔ سندھ تو اس کا آبائی گڑھ تھا۔ بڑے بڑے جاگیردار، زمیندار سب ہمنوا تھے۔ بیوروکریسی بے دام غلام تھی۔ سندھ کے دیہی علاقہ جات سے جیتنے کی خواہش جوان تھی تاکہ پیپلز پارٹی کو سندھ کی مقبول ترین جماعت ثابت کیا جا سکے۔ اس ماحول میں کسی اور جماعت کا اپنے امیدوار کھڑے کرنا بڑی ہمت کی بات تھی۔ صالح افراد کو حکومت کے ایوانوں میں بھیجنے کا عزم رکھنے والی جماعت اسلامی نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اپنے نمائندوں کو الیکشن میں کھڑا کر دیا۔ ایسا بھی ہوا کہ اس کے نمائندوں کو اغوا کر کے کاغذات جمع کرانے کی تاریخ کے بعد چھوڑ دیا گیا تاکہ بلا مقابلہ جیتنے کے عزائم پورے ہو سکیں۔ ایسی تمام کوششوں کے باوجود جماعت اسلامی میدانِ انتخاب میں کھڑی رہی۔ اس کے پیچھے ان کارکنان کی قوت تھی جنہوں نے پورے شعور کے ساتھ کلمۂ شہادت پڑھا تھا اور جو اللہ کے آگے کسی اور کو بڑا ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی عزیمت کا کوہِ گراں بنی کھڑی تھیں۔

سکھر میں ایک ایسا ہی گھر موجود تھا، جہاں میاں، بیوی، بیٹے، بیٹیاں سب اس قافلۂ حق کے راہی تھے۔ حق کی سربلندی کے لیے ان کا گھر الیکشن کا مرکزی آفس بنا ہوا تھا۔ دروازے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے تھے۔ منصوبہ بندی کی جا رہی ہے، پولنگ ایجنٹس کی بریفنگ ہو رہی ہے، ووٹر لسٹیں چیک ہو رہی ہیں اور ان تمام سرگرمیوں کی روحِ رواں ایک انتہائی متحرک اور شفیق خاتون ہیں جنہیں سب باجی کے نام سے پکار رہے ہیں۔ یہ باجی ایک دیرینہ رکن جماعت اسلامی کلثوم عبیدی تھیں۔ جن کا وجود صبر، عاجزی، نرمی اور خدمت کے خمیر سے گوندھا گیا تھا۔ زمانہ انہیں باجی کہہ کر پکارتا تھا اور وہ باجی ہی کی طرح ہر ایک پر شفقت اور محبت کی چادر تانے رہتی تھیں۔ ان کے صبر و استقامت کی مثال کو کہیں پیش کیا جاتا تو لوگ کہہ اٹھتے، ''کلثوم باجی کی بات تو رہنے دو، ایسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' جن سے لوگ پوچھا کرتے تھے کہ آپ نے اتنا صبر کرنا کہاں سے سیکھا۔ جو خاموش مسکراہٹ کے ساتھ اس طرح زندگی گزار گئیں جیسے پانی راستے کی ہر بلند و بالا رکاوٹ کے باوجود اپنے بہنے کے لیے راستہ نکال لیتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو کم

بولتے اور کام زیادہ کرتے ہیں۔ ان کے سینے میں جذبات اور احساسات کا سمندر موجود تھا مگر اس کی لہریں لبوں تک آتے آتے مسکراہٹ میں ڈھل جاتی تھیں۔

خاموشی کا تصور ہو گئی ہوں
بہت گہرا سمندر ہو گئی ہوں

ابتدائی تعارف:

گہرے سمندر کی مانند زندگی گزارنے والی کلثوم عبیدی نے دسمبر ۱۹۳۹ء میں بریلی ہندوستان میں آنکھ کھولی۔ محض ڈیڑھ سال کی عمر میں ماں کی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا۔ والد نے دوسری شادی کی تو بچی کو کسی نفسیاتی صدمے سے محفوظ رکھنے اور بہترین تربیت کی خاطر اپنے دیرینہ دوست جماعت اسلامی کے ابتدائی رہنما عبدالغفار حسن صاحب کے پاس سیالکوٹ بھیج دیا۔ یہاں اسلامی ماحول میں دینی اور دنیاوی تعلیم حاصل کرتے ہوئے ایک مثالی دوشیزہ کی حیثیت سے شعور کو پہنچیں۔ صبر اور قناعت کے اسباق کی داستان یہیں سے حفظ کی۔ بڑی ہوئیں تو والد کے پاس سکھر آ گئیں۔ جہاں ان کا گھرانہ قیامِ پاکستان کے بعد مقیم ہو چکا تھا۔ والد کے پاس بیوہ پھپھو اپنے بیٹے کے ساتھ مقیم تھیں۔ بیٹے نے ماموں کے زیرِ سایہ تعلیم و معاش کے مراحل طے کیے۔ اور والد نے چودہ سال کی عمر میں اپنے اسی بھتیجے عبدالقیوم سے ان کی شادی کر دی۔ پہلے بیٹی اور داماد کو اوپر کی منزل میں اپنے ساتھ رکھا اور بعد میں برابر میں مکان بنا کر وہاں منتقل کر دیا۔ ان کے والد حکیم عبیداللہ عبیدی صاحب جماعت اسلامی کے ابتدائی ارکان میں سے تھے۔ اور سکھر کے امیر ضلع بھی رہ چکے تھے۔ لیکن برادری جماعت اسلامی سے فکری مخالفت رکھتی تھی۔

گھریلو محاذ:

کلثوم عبیدی نے جماعت کے لٹریچر کو پڑھا اور جذب کیا۔ وہ اسی راہ کی راہرو تھیں لیکن ابھی شوہر کی راہ دوسری تھی۔ انہوں نے خاموشی سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ فکری اختلاف کو موضوعِ بحث بنانے کے بجائے، خدمت کے ہتھیار کو آزمایا۔ ہر سسرالی گھر پہنچیں، ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک ہوئیں، سب سے دوستی کی اور اس طرح کی کہ ہر ایک انہیں اپنا سب سے قریبی ہمدرد سمجھتا تھا اور فکری لحاظ سے جماعت کا شدید مخالف ہونے کے باوجود ان کے سامنے مخالفت نہیں کر پاتا

تھا۔ اپنے گھر اجتماع کا آغاز کیا، سب کو بلایا، پڑوسی اور رشتہ دار بھی اس میں شریک ہونے لگے۔ ۱۹۷۰ء میں ایسے حالات تھے کہ الیکشن میں کلثوم عبیدی کام جماعت اسلامی کا کر رہی تھیں لیکن گھر کے اوپر جھنڈا جمعیت علمائے پاکستان کا لگا ہوا تھا۔ شوہر اس کیمپ میں تھے اور ان کا حکم تھا کہ ووٹ JUP کو ڈالنا ہے۔ سوانہوں نے کسی کو ووٹ نہیں ڈالا۔ آہستہ آہستہ شوہر کو بھی اسی راہ پر لانے کی جدو جہد میں لگی رہیں یہاں تک کہ جب سات سال بعد ۱۹۷۷ء کے الیکشن کا وقت آیا تو شوہر خود جماعت اسلامی کے کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ خدمت، حکمت، محبت اور استقامت شوہر کو بھی اس راہ پر لے آئی تھی۔ یہ تعاون حاصل ہوا تو کام کا جذبہ جو ابھی محلے، پڑوس اور برادری تک مقید تھا، اب وسعت پا کر سندھ کے دیگر علاقوں تک دراز ہو گیا۔

۱۹۷۸ء میں رکنیت اختیار کی تو سب سے پہلے خود گھر کو اپنے اسلامی رنگ دیا۔ وقت اور توجہ بچانے کے لیے وسائل ہونے کے باوجود سادگی اختیار کی۔ گھر آرائشی اشیا سے پاک تھا۔ پردے بھی صرف وہیں لگائے جہاں بے پردگی کا اندیشہ تھا۔ صفائی کا بے حد خیال رکھتیں تا کہ آنے والی پر دعوت کا اچھا اثر پڑے۔ مخلوط معاشرت اور تقریبات کا خاتمہ کیا۔ پانچ بیٹیوں اور دو بیٹوں کی پرورش اور تربیت کے لیے دعا اور عمل کا سہارا لیا۔ نرمی مزاج کا لازمی حصہ تھی اسی سے بات سمجھانے اور تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ بچوں کو کھلا ماحول دیا تا کہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ البتہ کچھ اصول طے تھے جن پر عمل لازمی تھا۔ کبھی کسی کے سامنے بچوں کی برائی نہیں کی اور بچوں کو بھی کسی کی برائی نہیں کرنے دی۔ اگر وہ کبھی کسی کے متعلق کچھ کہنا بھی چاہتیں تو ساتھ میں وضاحتیں دیتیں کہ فلاں وجہ ہو گئی ہو گی، تم بدگمان نہ ہو۔ بچوں کی شادی میں بھی برادری، منصب اور دولت کے بجائے دین داری کو معیار بنایا۔ شادیوں میں غیر شرعی رسم و رواج سے ہٹ کر سادگی اور پابندی وقت کو ملحوظ رکھا۔ بیٹیاں جمعیت میں شامل ہوئیں تو بہت خوش ہوئیں۔ ان کے کاموں میں بہت تعاون کرتیں، تربیت گاہوں اور دوروں میں ان کے ساتھ جاتیں۔ اس طرح دیگر بچیوں کو بھی ساتھ جانے کی اجازت مل جاتی۔

خاندان میں کردار:

خاندان کے افراد کے ساتھ رویہ مثالی تھا۔ چار بہنیں اور ایک بھائی دوسری والدہ سے

تھے۔ لیکن کلثوم عبیدی نے اپنی اولاد سے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ بچوں کا کہنا ہے کہ امی نے ہمیں کبھی یہ نہیں بتایا کہ یہ حقیقی خالائیں اور ماموں نہیں۔ بعد میں کسی اور ذریعے سے پتا چلا تو ہمیں یقین نہ آیا۔ ساری زندگی اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ بہترین حسنِ سلوک کا معاملہ کیا۔ ان کے دکھ سکھ میں بڑھ چڑھ کر ساتھ دینے والی بیٹی اور بہن کا کردار ادا کیا۔ بہن گواہی دیتی ہیں کہ باجی کی شکل میں ہمیں بہترین استاد اور چاہنے والی بہن ملیں۔ والدہ کی آنکھوں میں تکلیف ہوئی تو اسپتال لے کر گئیں۔ ڈاکٹر نے داخل کر لیا تو خود ان کے پاس رہیں اور کسی دوسرے کو رکنے سے منع کیا۔ ان کی خدمت کرتی رہیں۔ کہتی تھیں کہ ''مجھے بڑا سکون ملا ہے کہ ان کی خدمت کی''۔ ۱۹۷۵ء میں چھوٹی بہن کے ہاں بچی پیدا ہوئی تو اس کی طبیعت کافی خراب ہو گئی۔ اس کے لیے مسلسل دعا اور عیادت کا برتاؤ تھا۔ حسنِ سلوک کا یہ معاملہ گھر والوں سے بڑھ کر خاندان اور دیگر بندگانِ خدا تک وسیع تھا۔

کبھی بیٹیوں اور بہوؤں میں فرق نہیں کیا۔ بہنوں اور بہوؤں کے ہاں ولادت کے مراحل سے گزرنے کے وقت ان کے پاس جاتیں خواہ ہوائی سفر کرنا پڑے۔ اتنی خدمت کرتیں کہ وہ پکار اٹھتیں کہ ہمیں اپنی ماؤں سے اتنا سکون نہیں ملا جتنا کلثوم باجی سے ملا ہے۔ بہترین ساس تھیں۔ بہو کہتی ہیں کہ ''میری ماں بھی ایسی نہ تھیں جیسی میری ساس ہیں''۔ نیکی اور شرافت کی بنیاد پر بیٹیوں کی شادی کی۔ برادری کے اصول ''شادی برادری میں ہو گی'' کو توڑ دیا۔ بعد میں جیسے بھی حالات رہے، دخل اندازی نہیں کی۔ تمام بیٹیوں کی ساسوں کا کہنا تھا کہ کلثوم باجی جیسا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا وہ تو کچھ اور ہی تھیں۔ ہر ایک کی عزت کی، کبھی کسی کی غیبت نہ کی۔ کسی کے بھی گھر، بچوں، کھانے پینے پر تبصرہ نہیں کرتی تھیں۔ ہر ایک کا حق نبھایا۔ خوشی غمی میں ضرور جاتی تھیں۔ تحائف دیتیں، درسِ قرآن کی دعوت دیتیں۔ کوئی جماعت کی طرف مائل نہ بھی ہوتا تو تعلق ختم نہیں کیا بلکہ اور بڑھانے کی کوشش کی۔ کہتیں، ''ہم تو اللہ کے لیے کر رہے ہیں۔ یہ تو اللہ کا حکم ہے کہ جو تم سے کٹے تم اس سے جڑو''۔ ایک بہنوئی کا تعلق تبلیغی جماعت سے تھا، ان سے کہا کرتیں کہ ''اپنے ساتھیوں سے کہو کہ الیکشن میں جماعت اسلامی کو ووٹ ڈالیں اور حکومت بنانے کا موقع دیں۔ تبلیغی جماعت کے لوگ لاکھوں میں ہیں لیکن افسوس کہ ووٹ نہیں ڈالتے''۔

تحریکی زندگی:

تحریکی زندگی کی نمایاں خوبی سمع واطاعت تھی۔ نظم کی جانب سے جو بھی کام دیا گیا، اس کی ادائیگی کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں استعمال کر دیتیں۔ کبھی کسی پالیسی پر تبصرہ اور تنقید نہیں کی۔ طویل دورے جو شدید گرمی کے موسم میں ہائی روف اور بس سے کیے اور راستے میں حاجت پیش نہ آئے اس لیے پانی کا استعمال کم سے کم کرتیں۔ آخری عمر میں گردوں کی تکلیف ہوئی تو باتوں باتوں میں کہا کہ پانی کم پیتے تھے اور موسم گرم ہوتا تھا۔ کوئی مہم آتی تو ہر مصروفیت چھوڑ کر اس میں تن من دھن سے لگ جاتیں۔ گھر، بچے، بیماری، موسم کی شدت کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی تھی۔ درس دینے کے لیے بہت تیاری کرتی تھیں۔ حساب کتاب کے معاملے میں بے حد متفکر رہتیں۔ ایک روپے کا پان بھی منگوایا ہو تو وہ بھی درج کرتیں۔ جب حساب بنا کر آگے دیتیں تو اپنی طرف سے مزید پیسے ملا دیتیں کہ کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔

سکھر اور اردگرد کے بے شمار گاؤں گوٹھوں میں دین کی دعوت پہنچائی۔ جب سکھر ڈویژن کی نظامت کے بعد نائب ناظمہ صوبۂ سندھ کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی تو شکار پور، خیر پور، نواب شاہ، رتو ڈیرو، جنڈو ڈیرو، ڈھرکی، کندھ کوٹ، جیکب آباد، لاڑکانہ، شہداد پور اور نوشہرو فیروز تک آپ کی دعوتی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

خدمت، محنت اور صبر:

یہ ان کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ صوبے کے نظم سے خواتین آپ کے گھر آ کر رکتیں۔ فجر میں اٹھ کر ان کا ناشتہ بناتیں۔ پھر بچوں کو ناشتہ کرا کے ۱۱ بجے تک دوپہر کا کھانا بنا کر نظمِ خواتین کے ساتھ دوروں پر چلی جاتیں۔ رات کو واپس آ کر پھر مہمانوں کی خدمت اور گھر کے کاموں میں لگ جاتیں۔ دعوتِ حق کے مہمانوں کے اکرام و مہمان نوازی کا عمل اس وقت سے جاری تھا جب والدِ محترم کے پاس نظمِ جماعت کے افراد آیا کرتے تھے۔ پھر شوہر صاحب کے پاس لوگ آ کر مقیم ہونے لگے۔ شوہر کے دوستوں کا بھی حلقہ وسیع اور دل کھلا تھا۔ کبھی فرمائش کہ آٹھ پیالی چائے بنا کر بھیج دو، کبھی فرمائش کہ چھ آدمیوں کا کھانا تیار کر دو"۔ کلثوم عبیدی بلا کسی شکوے کے ہر لمحہ مہمان داری پر تیار رہتیں۔ جب رہنے کے لیے مرد حضرات آتے تو گھر والے نیچے کا

گھر خالی کر کے اوپر مقیم ہو جاتے۔ بچوں کو کبھی پروفیسر غفور احمد صاحب اور کبھی جان محمد عباسی صاحب جھاڑو دیتے نظر آتے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے وقت جب وہاں سے آنے والوں کے لیے سکھر میں کیمپ قائم ہوئے تو وہاں جا کر ان کی خدمت کرتیں۔ ایک ضعیف خاتون کو جن کے سامنے ان کے خاندان کے ۳۶ افراد کو شہید کیا گیا تھا اور انہیں ان پر رونے کے لیے زندہ چھوڑ دیا تھا، اس سے ان کا ذہنی توازن متاثر ہو گیا، اپنے گھر ساتھ لے آئیں۔ وہ گھر میں کبھی گندگی کر دیتیں، کبھی ڈنڈے سے بچوں کی پٹائی کر دیتیں۔ بچے شکایت کرتے تو انہیں سمجھاتیں کہ آج ان بے سہاروں کو تم سکون دو گے تو کل اللہ تمہیں محلوں میں سکون عطا کرے گا۔

انفاق فی سبیل اللہ:

جمع کر کے رکھنا ان کی زندگی میں نہ تھا۔ مالی حالات بہت اچھے تھے تو سب کو دینے میں کبھی کمی نہیں کی۔ لیکن اپنے لیے جمع نہیں کیا۔ ۱۹۶۵ء میں اپنا تمام زیور جو تقریباً پچاس تولے تھا، فنڈ میں دے دیا۔ بعد میں ایک دفعہ بڑے شوق سے خود ڈیزائن کر کے چھ جڑاؤ چوڑیاں بنوائیں۔ سنار نے ڈیزائن صحیح نہیں بنایا تو خود جا کر مرضی کے مطابق بنوایا۔ جب بن کر آئیں تو بہت ہی خوبصورت اور انتہائی چمکدار چوڑیاں تھیں۔ دس پندرہ دن ہی پہنی ہوں گی کہ ۲۰۰۵ء میں کشمیر اور سرحد میں خوفناک زلزلہ آ گیا۔ خاموشی سے جا کر چوڑیاں فنڈ میں دے دیں۔ بیٹیوں نے کہا کہ چوڑیاں کہاں گئیں تو کہا کہ حفاظت سے رکھ دی ہیں۔ جب بار بار پوچھا تو بتایا کہ فنڈ میں دے دی ہیں۔ بیٹوں نے کہا "آپ ہمیں کہتیں، ہم اتنے پیسے فنڈ میں دے دیتے۔ آپ نے اتنے شوق سے بنوائیں اور اتنی کم پہنی تھیں"۔ تو کہا "اللہ نے دل پسند شے اپنی راہ میں دینے کا کہا ہے۔ پسند تو وہ چوڑیاں تھیں پیسے تو نہ تھے۔ اس لیے انہیں ہی اللہ کی راہ میں دے دیا"۔

انتخابات میں بے مثال سرگرمی:

کارنر میٹنگز سے لے کر پولنگ ایجنٹس کی میٹنگ اور ووٹرز کو کنونس کرنے سے لے کر کام کرنے والوں کی مہمان نوازی، ہر فریضہ باجی کے سپرد ہے۔ پولنگ کا دن آ جاتا ہے۔ باجی ووٹرز کو روانہ کر رہی ہیں، کبھی پولنگ بوتھ کا دورہ کر رہی ہیں۔ حکمرانی کے زعم کا شکار جیالے ہاتھوں میں بلیڈ لے کر پولنگ بوتھ میں گھس جاتے اور اپنی کارروائی کر کے فرار ہو جاتے۔ کسی

کے ہاتھ زخمی ہوئے تو کسی کا برقعہ پھٹا اور کسی کی ٹانگوں پر زخم آیا۔ ہر ایک کی زبان پر باجی کی پکار ہے۔ باجی سب کو تسلی دے رہی ہیں۔قرآن واحادیث سے عزیمت واستقامت کا درس دے رہی ہیں۔خوفزدہ خواتین کو گھر لے جا کر ان کی میزبانی کی جارہی ہے۔ جب جیالوں کا یہ حربہ بھی حوصلوں کی شکست کا باعث نہ بن سکا تو انہوں نے خوف وہراس پیدا کرنے کے لیے خواتین پولنگ ایجنٹس کے اغوا کا گھٹیا منصوبہ تیار کیا اور ایک بیگم صاحبہ ایک بڑی سے گاڑی میں چند جیالوں سمیت خواتین پولنگ کیمپس کی طرف روانہ کردی گئیں۔مردانہ نظم نے اس موقع پر اپنی ایجنٹس کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے انہیں واپس بلانے کی ہدایت کی تو باجی اس تیزی سے اس پر عمل درآمد کے لیے آگے بڑھیں کہ بیگم صاحبہ کی گاڑی بعد میں پہنچتی، باجی پہلے ہی اپنی کارکنان کو وہاں سے نکال چکی ہوتی۔ اس ہزیمت پر شرمندہ ایک جیالے نے فائرنگ کرکے خوف وہراس پیدا کرنا چاہا لیکن اس کے اپنے ہاتھ سے پستول اس طرح چلا کہ وہ خود ہی زخمی ہوگیا اور بعد میں دم توڑ گیا۔

انتخابات میں بے مثال دھاندلی کے بعد جماعت اسلامی ''پاکستان قومی اتحاد'' کے پلیٹ فارم سے احتجاجی تحریک چلانے میں مصروف ہوگئی۔ باجی دن بھر شہر میں خواتین کے جلسے اور جلوس کے انعقاد کی تیاری کرتیں، آیتِ کریمہ کے ختم کرائے جاتے اور رات میں پہرے داری کرتیں۔ الیکشن میں گھر کو آفس بنائے جانے کا عمل حکومت کو سخت کھٹک رہا تھا۔ ہر وقت خطرے کا ڈر تھا۔ وہ اور بچیاں برقع پہن کر سوتی تھیں کہ نہ جانے کس وقت گھر سے نکلنا پڑ جائے۔ شوہر رات بھر دیواروں کو پانی سے بھگوتے رہتے کہ کوئی آگ لگانا چاہے تو نہ لگ سکے۔ ایسے میں ایک زخمی جیالا جو اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا، دم توڑ گیا تو اس کے ورثانے باجی کے شوہر اور بیٹے پر قتل کا مقدمہ درج کرادیا۔ انہیں روپوش ہونا پڑا۔ مہینوں اپنے گھر والوں سے بھی رابطہ نہ رہا۔لیکن باجی اسی حوصلے اور استقامت کے ساتھ کھڑی رہیں۔ نہ کسی سے گلہ نہ شکوہ، نہ رفتار میں کمی، نہ سوچوں میں جمود۔ وہاں تو وہی دل آویز مسکراہٹ موجود تھی جو ان کی شخصیت کی پہچان تھی اور وہی پیغام لبوں سے ادا ہو رہا تھا جسے زندگی کا نصب العین سمجھ کر اختیار کیا تھا۔

شام زندگی:

زندگی کے آخری کچھ سال سخت آزمائش میں گزرے۔ بچوں کی بہتر تعلیم اور معاش کے لیے ۱۹۹۷ء میں کراچی منتقل ہونا پڑا۔ گھر چھوڑا، شہر چھوڑا، مالی، ذہنی، صحت، اولاد ہر طرح کی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر نہ مزاج میں فرق آیا نہ اللہ کے دین سے لگاؤ میں۔ ان کے صبر، اخلاص اور اخلاق کا وہی حال رہا۔ سنگین ترین حالات میں بھی ایک غلط لفظ منہ سے نہ نکلا۔ سارے غم دل میں سمو کر لبوں پر مسکراہٹ چھائی رہی۔ ہر ایک کی خدمت کرنے کے باوجود اپنی خدمت کروانے کی قائل نہ تھیں۔ بیماری میں بھی بچوں سے کبھی پانی نہیں منگوایا۔ اپنی بیماری اور تکلیف کو کبھی موضوعِ گفتگو نہیں بنایا۔ حق تلفی پر بھی فرائض کی ادائیگی کی فکر رہی۔ ۶۵ سال کی عمر میں بھی بسوں میں اکیلے سفر کر کے برادری میں ہر اہم موقع پر جاتی رہیں۔ مارچ ۲۰۰۷ء میں ایک شادی کے موقع پر سکھر آئیں تو تمام ملنے والیوں کے ہاں گئیں۔ کہنے لگیں کہ اس دفعہ میرا دل چاہ رہا ہے کہ سب سے مل کر جاؤں پھر پتا نہیں آنا ہوگا یا نہیں۔

ساری زندگی کھلے دل اور کھلے ہاتھ کے ساتھ اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے والی، کلثوم عبیدی کا دنیا سے جاتے ہوئے کل سرمایہ ایک برقع، دو جوڑی چپل، دو شالیں اور چند استعمال شدہ کپڑے تھے۔ ایک لونگ، ایک جوڑی بالیاں، ایک چین اور تین باریک چوڑیاں مع بے شمار یادوں کے وہ یہیں چھوڑ گئیں۔ اللہ نے انہیں زندگی میں بہت نوازا تھا اور اس سرمائے کا زیادہ حصہ وہ اپنے ساتھ ہی لے گئیں کہ سرمایہ دراصل دارِ آخرت کے لیے ہی جمع کرنا چاہیے۔ اگست ۲۰۰۷ء میں انتقال کرنے والی اس صابر بندی نے اپنی نرمی اور برداشت کے باعث بہت سے دنیاوی نقصانات بھی اٹھائے۔ دنیا کے نقصانات یہیں رہ گئے اور وہ ان کا دگنا، چوگنا نفع حاصل کرنے اپنے رب کے پاس پہنچ گئیں۔ ان کے انتقال پر برادری والے پکار اٹھے کہ آج ہماری برادری کی سب سے نیک عورت چلی گئی۔

ماخذات

۱۔ عائشہ محتشم صاحبہ، شاہدہ صاحبہ، عالیہ صاحبہ (بیٹیاں) ۲۔ شاکرہ عبیدی صاحبہ، خالدہ عبیدی صاحبہ (بہن)
۳۔ راشدہ نذیر صاحبہ (کارکن حلقہ خواتین) ۴۔ رقیہ فردوس صاحبہ (سابقہ ناظمہ صوبہ سندھ)

&

سیدہ میمونہ رضوی

۱۹۴۰ء تا ۲۰۰۶ء

)

4

میمونہ رضوی صاحبہ کا پورا گھرانہ اپنا وقت، مال اور محبتیں لیے ہر گام پر جماعت اسلامی کے پرچم کو تھامے رہا۔ حلقہ خواتین نے کوئٹہ میں بچیوں کے لیے جامعۃ المحصنات کے قیام کی منصوبہ بندی کی تو میمونہ صاحبہ اس حوالے سے بھی بہت سرگرم رہیں۔

جامعہ کے قیام سے اس کے استحکام تک ہر ہر مرحلے پر وہ پوری طرح سے اس میں شریک رہیں۔ وہ نہ صرف خود اس کے لیے تیار رہتیں بلکہ ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں کو بھی اس کارِ خیر میں شریک رکھنے کی کوشش کرتیں، خصوصاً اپنی بہو کو اپنے سے آگے دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ ہمیشہ اس کے لیے اچھے جذبات کا اظہار کیا اور ہر ایک کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ''اللہ کرے میری رخسانہ بھی رکن بن جائے'' اسی طرح جب ان کی بیٹی سعودی عرب سے تشریف لاتیں تو انہیں لے کر ہر اجتماع میں جاتیں اور انہیں جماعت کے کاموں میں شریک کرنے کی پوری کوشش کرتیں۔

4

حلقہ خواتین کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کا سہ روزہ اجلاس ختم ہو چکا تھا۔ ملک بھر سے آئی ہوئی بہنیں اپنے اپنے شہروں کو واپسی کے لیے سامان باندھ رہی تھیں۔ ایسے میں دو خواتین لبوں پہ مسکراہٹیں لیے سب بہنوں کو جانے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ان کی مدد بھی کراتی جا رہی تھیں۔ کراچی سے پہلی مرتبہ اجلاس میں شرکت کے لیے آئی ہوئی ایک بہن نے ان سے دریافت کیا کہ ''کیا آپ نے اپنا سامان باندھ لیا ہے؟'' تو جواب ملا: ''ابھی تو ہم یہیں ہیں۔ جاتے وقت باندھیں گے''۔ آپ کب واپس جائیں گی؟ یہ سوال پوچھا تو جواب ملا' 'ہماری روانگی دو دن بعد ہے''۔ اس بہن نے دریافت کیا: ''کیا آپ کو یہاں کچھ اور کام بھی ہے؟'' اس پر کوئٹہ (بلوچستان) سے اجلاس میں شرکت کے لیے آئی ہوئی نمائندہ بلوچستان بہن عذرا نذیر نے بتایا کہ ''بات دراصل یہ ہے کہ کوئٹہ سے لاہور تک ٹرین کا سفر دو دن کا ہوتا ہے، بعض دفعہ ٹرین لیٹ بھی ہوتی ہے اس لیے ہم ایک دن پہلے پہنچنے کی پلاننگ کرتے ہیں اور اجلاس ختم ہوتے ہوئے اس دن کوئٹہ جانے والی ٹرین جا چکی ہوتی ہے لہٰذا ہم اگلے دن کی ٹرین سے واپسی کی بکنگ کراتے ہیں۔ اور میرے ساتھ یہ میری تحریکی بہن میمونہ رضوی ہیں جو اس سفر و حضر میں میرا ساتھ دیتی ہیں''۔

پُرخلوص رفاقت:

مجلسِ شوریٰ کے لیے ہر تین ماہ بعد ناظماتِ صوبہ کے جائزہ اجلاس میں ان دونوں بہنوں کو اپنے وقت کا سب سے زیادہ ایثار کر کے شریک ہونا پڑتا تھا لیکن ان کے حوصلے بلوچستان کے پہاڑوں کی مانند بلند تھے۔ عذرا بہن تو اپنے فرض کو نبھانے کے لیے اس محنت و شفقت کو شعار بنائے ہوئے تھیں لیکن میمونہ بہن محض ان کی ہمسفری کے لیے ہفتہ بھر کا یہ ایثار ہمیشہ انتہائی خوشدلی سے انجام دیتی تھیں اور اس بات کو ثابت کرتی تھیں کہ دین کا یہ رشتہ ہر دنیاوی رشتے سے بھاری ہوتا ہے۔

اللہ رب العالمین کا احسان ہے کہ اس نے ملک کے ہر خطّے میں ایسی سعید روحیں پیدا کیں جو جماعت اسلامی کی پکار سن کر تن من دھن سے اس قافلہ حق میں اس طرح شریک ہوئیں کہ رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ بلوچستان کی سنگلاخ سرزمین جہاں ایک طرف حقوق سے محروم بے بس عوام ہیں تو دوسری طرف خوانین کی سرداری اور عصبیت کی تیز آندھی ہے جو آپس کی باہمی

محبت کو اڑائے لیے جا رہی ہے لیکن اس ہوائے تند و تیز میں بھی چراغ جلانے والے اور چراغ جلانے والیاں اس مبارک قافلے کو اپنے وجود سے تابانی بخشتی رہیں۔ سیّدہ میمونہ رضوی کا تعلق بھی انہیں سعید روحوں میں سے ہے۔

تعارف:

سیّدہ میمونہ رضوی ۱۹۴۰ء میں یوپی انڈیا کے ایک گاؤں میرپور میں پیدا ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب عورتوں کو پڑھانے کا رواج بہت ہی کم پایا جاتا تھا لیکن انہیں علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا اور بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کے باعث لاڈلی بھی تھیں۔ آپ کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے والد محسن علی رضوی نے خاندان سے مخفی رکھ کہ تعلیم دلوائی۔ بتاتی ہیں کہ گھر اور اسکول کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں تو آپ اپنے گھر کی چھت کے ذریعہ اسکول چلی جاتی تھیں۔ اس طرح ششم جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ ہندی رسم الخط میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اردو لکھ پڑھ سکتی تھیں۔ چھوٹی عمر میں ہی قرآن پاک پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اپنے شوق سے احادیث یاد کر کے بھی لکھا کرتی تھیں۔

آغازِ سفر:

۱۹۵۵ء میں ان کی شادی سیّد یونس علی رضوی صاحب سے ہوئی جو جماعت اسلامی کے کارکن تھے۔ اس کے بعد آپ پاکستان آ گئیں اور کوئٹہ میں مقیم ہوئیں۔ شوہر صاحب کی وساطت سے محترم مولانا مودودی کا لٹریچر پڑھا تو اس سے بے حد متاثر ہوئیں اور شوہر سے جماعت اسلامی میں شمولیت کی اجازت چاہنے کے بعد باقاعدہ تحریک کا حصّہ بن گئیں۔ یہاں تک کہ آپ نے حلفِ رکنیت اٹھالیا۔

استقامت:

دبلا پتلا سراپا روشن آنکھیں، چہرے پہ تازگی لیے ایک مضبوط شخصیت کی جھلک دکھاتا تھا۔ آپ ہر لمحہ ڈیوٹی پر موجود سپاہی کی مانند نظر آتی تھیں اور تحریک کو جس کام کے لیے بھی ضرورت پڑتی اسے نبھانے کے لیے کھڑی ہو جاتیں۔ ان کی تحریک میں شمولیت کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب جماعت اسلامی میں شامل بیشتر خواتین راہ بدل کر دوسری جماعت میں شامل ہو

گئیں یہاں تک کہ بلوچستان کا خواتین نظم بھی اپنے مقام پہ ثابت قدم نہ رہا۔شکوک وشبہات کی ہر طرف پھیلی ہوئی دھند میں جو لوگ اس وقت بھی چٹان کی مانند اپنی جگہ جمے رہے اور اطمینان قلب کے ساتھ پر جوش انداز میں دین کی دعوت کی سربلندی میں مصروف رہے وہ بڑے قابل قدر ہیں اور آپ ان میں شامل تھیں۔

پُر جوش تعاون:

میمونہ رضوی صاحبہ کا پورا گھرانہ اپنا وقت، مال، اور محبتیں لیے ہر گام پر جماعت اسلامی کے پرچم کو تھامے رہا۔ ایسے ہی دنوں میں حلقہ خواتین نے کوئٹہ میں بچّیوں کے لیے جامعۃ المحصنات کے قیام کی منصوبہ بندی کی۔ میمونہ صاحبہ اس حوالے سے بھی بہت سرگرم رہیں۔ جامعہ کے قیام سے اس کے استحکام تک ہر ہر مرحلے پر وہ پوری طرح سے اس میں شریک رہیں۔ وہ نہ صرف خود اس کے لیے تیاّر رہتیں بلکہ ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں کو بھی اس کارِ خیر میں شریک رکھنے کی کوشش کرتیں خصوصاً اپنی بہو کے حوالے سے خواہاں رہتیں کہ اسے یہ کام دیا جائے، وہ ضرور کر لے گی۔ اپنی بہو کو اپنے سے آگے دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ ہمیشہ اس کے لیے اچھے جذبات کا اظہار کیا اور ہر ایک کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ''اللہ کرے میری رخسانہ بھی رکن بن جائے'' اسی طرح جب ان کی بیٹی سعودی عرب سے تشریف لاتیں تو انہیں لے کر ہر اجتماع میں جاتیں اور انھیں جماعت کے کاموں میں شریک کرنے کی پوری کوشش کرتیں۔ آج آپ کی بیٹی اور بہو امیدوار رکنیت اور شوہر اور بیٹے رکنِ جماعت ہیں۔

جامعہ کی سابقہ پرنسپل ثمینہ عرفان کہتی ہیں کہ ''میں اس بات کی گواہی دیتی ہوں کہ ۱۹۹۷ء میں جب جامعہ کی ذمہّ داری دی گئی تو میں نے جامعہ کے مسائل حل کرنے میں ہمیشہ میمونہ خالہ کو پیش پیش دیکھا۔ جامعہ سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتی تھیں یہاں تک کہ انتقال کے وقت اپنی اولاد کو اپنی جانب سے مالی اعانت کی وصّیت کر کے گئیں جسے ان کی اولاد نے پورا کیا۔ ہم سے عمر میں زیادہ ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ ہم سے دوستانہ انداز میں ملتیں۔ میں نے انہیں کبھی غصّے میں نہیں دیکھا بلکہ ہمیشہ مسکراتی آنکھوں اور چہرے کے ساتھ ہی نظر آئیں۔ بھاگ دوڑ کے کاموں میں کبھی اپنی عمر کو درمیان میں نہ لاتیں بلکہ ہر لحظہ توانا اور پرعزم نظر آتیں۔

سابقہ ناظمہ صوبہ بلوچستان عذرا نذیر صاحبہ بتاتی ہیں کہ میمونہ بہن کو رب کائنات نے جتنی صلاحیتیں دی تھیں وہ ان کا بھرپور فائدہ تحریک کو دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ ان کا اپنا وجود دیکھنے میں تو کمزور لیکن جذبوں کی حرارت اور خلوص کی فراوانی سے مضبوط تھا۔ وہ ان کارکنان میں تھیں جو آگے بڑھ کر تحریک کا کام کرنے اور سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیشہ حوصلہ مند رہتیں اور حوصلہ دیتی تھیں۔ مالیات کے حوالے سے تحریک کی ضروریات کو تندہی سے پورا کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ باہمی تعلقات اور میل ملاپ میں محبت واخوت کی مثال تھیں۔ کوئٹہ جیسے علاقے میں جہاں کام کرنا آسان نہیں تھا مختلف طبقوں اور زبان کے افراد کے ساتھ ربط بڑھانا اور ان افراد کو تحریک کے لیے سرمایہ بنانا انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔

ایک ایسے وقت میں جب جماعت کا کام کرنے والے افراد انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ ہر طرح کی مشکلات ومسائل کا سامنا تھا۔ میمونہ خالہ نے اپنی بیش بہا قربانیوں سے پیچھے آنے والیوں کے لیے اس راستہ کو ہموار کیا۔ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں کو بھی اس راہ میں لگانے کی کوششیں کیں۔ بہترین ماں اور بہترین ساس بن کر دکھایا۔ پوری زندگی سادگی سے گزاری اور قرآن وسنت کے مطابق اپنے گھر کو چلانے کی کوشش کی۔ اپنی تحریکی بہنوں سے بھی ازحد محبت ولگاؤ رکھتی تھیں۔

راہِ حق پر چلتے چلتے ۱۰ ستمبر ۲۰۰۶ء کو وہ خالق حقیقی کے حضور پہنچ گئیں۔ آج بھی ان کی یادیں بلوچستان کی کارکن بہنوں کے دلوں میں موجود ہیں۔ ان کی نواسی فریحہ نے بتایا کہ ''ہمیں اپنی نانی کی وفات پر تحریکی بہنوں اور خالاؤں کی ان سے محبت کا اندازہ ہوا جب وہ ہم سے بھی پہلے نانی کے گھر موجود تھیں اور ان کے آنسو اس محبت کو ظاہر کر رہے تھے جو انھیں ہماری نانی سے تھی''۔

بلوچستان کی یہ عظیم بہن اپنے کردار کی روشنی سے اپنے ماحول کو جگمگا کر چلی گئیں اور اپنی جگہ پر کھڑے ہونے کے لیے سپاہی تیار کر گئیں۔ اللہ ان کی مساعی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور وادیٔ بلوچستان کو حق کی مہک سے گلستاں کر دے۔ آمین!

ماخذات

۱۔ عذرا نذیر صاحبہ۔۔۔سابقہ ناظمہ بلوچستان

۲۔ ثمینہ عرفان صاحبہ۔۔۔سابقہ پرنسپل جامعۃ المحصنات کوئٹہ

مسعودہ افضل

۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۷ء

4

اللہ نے انہیں بیٹی نہیں دی تھی لیکن وہ سیکڑوں بیٹیوں کی ماں تھیں، لاہور میں پورے ٹاؤن شپ کے علاقے میں مسعودہ باجی سے قرآن کا ترجمہ پڑھنے والی لڑکیاں انہیں بیٹیوں سے زیادہ عزیز تھیں۔ جو طالبہ ایک باران کے درس میں آنا شروع کر دیتی ،اس سے ہمیشہ تعلق رکھتیں۔خوشی غمی میں شرکت ،اس کی ضروریات کا خیال، اخلاقی ،فکری اور مالی امداد یہاں تک کہ اس طالبہ کے تمام گھر والے بھی مداح ہو جاتے کہ تمہاری استاد تم سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ ہر ایک سے محبت کا اتنا اظہار کرتیں کہ وہ خود کو ان سے بہت قریب سمجھتا۔ لوگ اپنے دل کی باتیں انہیں بے جھجک بتا دیا کرتے اور وہ حکمت کے ساتھ اصلاح کا سبق سکھانے کی کوشش کرتیں۔

4

حج کا فارم ہاتھ میں لیے ایک خاتون فکر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ایک جانب اس مقدس سفر پہ جانے کی آرزو تھی اور دوسری طرف گھر میں بہو کے یہاں ولادت کا مرحلہ قریب تھا۔ایک مرتبہ حج کی سعادت سے سرفراز ہونے کے بعد اب دوبارہ دیارِ پاک کی زیارت کی تمنا پوری ہونے کا مرحلہ قریب تھا۔ دین کے آئینہ میں اہم اور اہم تر مصروفیت کو پرکھا،تو دل نے کہا کہ اس وقت بہو کی خبر گیری کا فرض مقدم ہے۔نفلی حج تو بعد میں بھی کیا جا سکتا ہے،لیکن بہو کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کو مؤخر نہیں کیا جا سکتا۔لہٰذا آپ دل کی خواہش کو قربان کر کے بہو کی خبر گیری میں مصروف ہو گئیں۔ بہو اور نومولود بچی کے کام انتہائی خوشدلی سے انجام دیے اور اظہار کیا کہ یہ سب کام تو میں عبادت سمجھ کر کر رہی ہوں اور اس میں خوش ہوں۔ دین کی ترجیحات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی فکر رکھنے والی اس خاتون کو زمانہ مسعودہ افضل کے نام سے جانتا ہے، جن کے انتقال کو کئی برس بیت جانے کے باوجود لاہور کی تحریکی بہنوں کی مجلسیں ان کی باتوں سے آباد رہتی ہیں اور ان کا ذکر آنے پر آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں اور ان کی یادوں سے جذبۂ فروزاں پاتے ہیں۔

ابتدائی تعارف:

انتہائی مخلص اور سادہ دل مسعودہ آپا کی شخصیت میں اپنے دین دار اور وضعدار والدین کی جھلک تھی۔والد ماسٹر یعقوب ایک بااصول، سچے،نظم وضبط کے پابند اور صفائی پسند شخصیت کے مالک تھے۔مسعودہ آپا بھی انہی خوبیوں کے ساتھ پروان چڑھیں۔ساتھ ہی ساتھ ہمدردی وغم گساری اور مہر ومروت کا خزانہ بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔اسلامیہ کالج سے گریجویشن کی تعلیم کے دوران ۱۸ربرس کی عمر میں ۱۹۶۵ء میں آپ کی شادی ہو گئی۔مشترکہ خاندانی رہائش والے گھر میں آپ نے اپنی محبت کی چاشنی سمو دی۔ ساس کو بیٹی اور دیورانی جٹھانی کو بہن کی رفاقت عطا کی۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک بیٹا عطا کیا جو چند ماہ بعد انتقال کر گیا۔آپ اس سے بہت غمگین ہوئیں۔حج کا زمانہ قریب تھا۔آپ کے خاندان کے کچھ افراد حج کرنے جا رہے

تھے جس میں آپ کی خالہ محمدی بیگم صاحبہ بھی شامل تھیں، جو جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کر چکی تھیں۔گھر والوں نے آپ کا غم ہلکا کرنے کے لیے ان کے ساتھ آپ کو بھی حج پر بھیج دیا۔حج کے دوران آپ نے اپنے رب سے عہد کیا کہ یہاں سے جا کر دین کی خدمت کروں گی۔محمدی بیگم صاحبہ نے انہیں جماعت کی دعوت سے آشنا کرایا اور زور دیا کہ واپس جا کر جماعت میں شمولیت کا فارم پُر کرو اور دین کے کام میں لگ جاؤ۔آپ نے اس کی حامی بھر لی اور وطن واپسی پر اپنے عہد کو نبھاتے ہوئے جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی۔ جماعت اسلامی سے منسلک ہونے کے بعد تحریک کے ساتھ ان کی محبت کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا اور دین کے کاموں میں وہ بہت سوں سے آگے نکل گئیں۔

آغازِ سفر:

انہوں نے اپنے کام کی ابتدا ٹاؤن شپ لاہور کے علاقے سے کی جو اس وقت آباد ہونا شروع ہوا تھا۔

منہ بولی بھتیجی نغمی بتاتی ہیں کہ ''میں صبح نو بجے آنٹی کے گھر پہنچ جاتی،ہم دونوں ناشتا اکٹھے کرتے، پھر وہیں سارے دن کی پلاننگ کر لیتے اور ایک ساتھ گھر سے نکلتے۔ میں جمعیت اور وہ جماعت کا کام کرتی جاتیں۔جس گھر میں جاتیں اس کے مسئلہ کو سمجھ کر اس میں تعاون کرتیں۔کہیں لڑائی ہوتی تو آپ ان میں صلح کرا دیتیں،کسی کو مالی مدد کی ضرورت ہوتی تو مالی تعاون فراہم کرتیں،کسی کو بچیوں کے رشتوں کی تلاش ہوتی تو اس میں ان کی مدد کرتیں۔لوگ ان پر اعتبار کرتے تھے اور ان کی بات کو قبول کرتے تھے۔

انہوں نے بہنوں سے رابطے میں رہنے کے لیے ایک طریقہ یہ نکالا کہ میری امی کے ساتھ مل کر ایک کمیٹی ڈال لی۔خواتین کو اس میں شریک کرتیں اور جو زیادہ ضرورت مند ہوتی اسے پہلی کمیٹی دے دیتیں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک دوسری کمیٹی ڈالی ہوتی جس کا نام انہوں نے ''اللہ والی کمیٹی'' رکھا تھا۔اس میں ہر ایک کو ہر ماہ سو روپے ڈالنے ہوتے تھے اور جتنی رقم اکٹھی ہوتی اس سے کسی غریب کی مدد کر دی جاتی۔آنٹی انہیں درس کی دعوت بھی دیتیں

اور آہستہ آہستہ درسِ قرآن میں حاضری زیادہ ہوتی چلی گئی‘‘۔

ٹاؤن شپ میں ان کی قریبی ساتھی حمیرا احتشام صاحبہ بتاتی ہیں کہ میں کراچی سے شفٹ ہوکر ٹاؤن شپ لاہور آئی تو مسعودہ آپا سے واقفیت ہوئی۔ ہم نے مل کر ٹاؤن شپ میں کام کو مضبوط بنانے کی پلاننگ کی۔ اس وقت انہیں گھر سے زیادہ نکلنے کی اجازت نہیں تھی، ہم نے کارکنان کا اجتماع ان کے گھر رکھنا شروع کر دیا۔ طے شدہ کاموں کو وہ پوری تندہی سے انجام دینے کی کوشش کرتیں۔ پڑوسنوں سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے، ہر موقع پر انہیں لٹریچر پہنچاتیں اور خواتین دعوت کو قبول کرتی تھیں۔ رمضان المبارک میں دورۂ قرآن شروع کیا تو اتنی خواتین شریک ہوئیں کہ کمرے سے باہر تک چٹائیاں بچھائی جاتیں۔ بک اسٹال لگایا جاتا ہزاروں روپے کی کتب فروخت ہوتیں۔ سب کارکنان کو تاکید کرتیں کہ رمضان میں تحفے میں کسی بھی دوسری چیز کے بجائے کتابوں کا تحفہ دیا جائے۔

ہر موقع پر درسِ قرآن دینے اور دلوانے کی فکر میں رہتی تھیں۔ اے ون اور اے ٹو ٹاؤن شپ میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جو انہیں نہ جانتا ہو۔ جو بہن بھی اپنے یا اپنے کسی رشتہ دار کے گھر درس رکھوانا چاہتیں فوراً حامی بھر لیتیں۔ درس کے بعد کتب پڑھنے دیتیں، رسائل لگوا دیتیں، اعانت کے لیے معاون بنا لیتیں۔ پھر جہاں بیج ڈالتیں انہیں چھوڑ نہیں دیتی تھیں بلکہ ان کی نگہداشت کر کے انہیں تناور درخت بنانے کی فکر میں لگی رہتی تھیں۔

وقت کا مؤثر استعمال:

وقت کی قدر داں تھیں۔ ہر لمحہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے کوشاں رہتی تھیں۔ گھر کے کاموں کے سلسلہ میں وہ اکثر کہتی تھیں کہ ’’میں رات کو ہی سوچ لیتی ہوں کہ صبح کیا پکانا ہے، تاکہ صبح ناشتہ کے ساتھ ہی کھانا چڑھا دوں اور سوچنے میں وقت ضائع نہ ہو۔ گھر میں لوگ ملنے آتے تو ملاقات کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کرتی جاتیں، کپڑے تہہ کر لیے، الماری ٹھیک کر لی، ان کا گھر بھی ہمیشہ صاف ستھرا چمکتا ہوا ہوتا جہاں ہر چیز جگہ پر رکھی ملتی۔ جماعت کی گاڑی جتنے وقت کے لیے انہیں ملتی وہ اس کے مؤثر استعمال کے لیے پہلے سے کاموں کی لسٹ بنا کر راستہ

متعین کر لیتیں جس میں گاڑی کے زیادہ چکر نہ لگیں اور سارے کام بھی ترتیب سے انجام پا جائیں۔ گاڑی کا وقت بچانے کے لیے بسا اوقات دروازے پر ہی کام کی گفتگو کر کے آگے روانہ ہو جاتیں۔

باہمی تعلقات:

مسعودہ آپا ’’مومن سراپا الفت ہوتا ہے‘‘ کی مکمل مثال تھیں۔ ہر ایک سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ کبھی کسی اجتماع یا ملاقات میں کوئی بہن انہیں خاموش یا لیا دیا رویہ رکھتی نظر آتی تو انہیں فکر لگ جاتی کہ کہیں میری تو کوئی بات اسے بری نہیں لگ گئی؟ چلو میں جا کر اسے گلے لگا کر اور معافی مانگ کر آتی ہوں اور وہ اس سے ملنے بھی پہنچ جاتی تھیں۔ حلقے علاقے کے جس کارکن سے ملے ہوئے کئی دن ہو جاتے تو کہتیں کہ ’’چلو ذرا اس کے گھر چلتے ہیں، اس کی اور اس کے بچوں کی خیریت دریافت کر کے آتے ہیں‘‘۔

منہ بولی بھتیجی نغمی بتاتی ہیں کہ جس سے تعلق بنایا ہر دکھ سکھ میں اس کا ساتھ دیا اور اسے اس کے رشتہ داروں سے بڑھ کر پیار دیا۔ آپ ہر کسی کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس کی کردار سازی کے لیے کوششیں کرتیں۔ شروع شروع میں جب وہ مجھے دین سے جوڑنے کی کوششیں کر رہی تھیں تو مجھے بتایا کہ میں نے ایک خاتون سے سنا ہے کہ رات کو ستاروں کی چھاؤں میں آسمان تلے جو دعا کی جائے وہ رب ضرور سنتا ہے۔ میں تمہارے لیے دعا کرنے آدھی رات کو کمرے سے باہر نکل کر صحن میں آ گئی، حالانکہ ڈر بھی لگ رہا تھا، لیکن میں نے سوچا چاہے چور آئیں چاہے ڈاکو۔ دعا تو میں نے کرنی ہے اور یہ ان کی دعاؤں کا ہی اثر تھا کہ میں بھی راہِ حق میں ساتھ چلنے والوں میں شامل ہو گئی۔ مجھے انہوں نے جمعیت طالبات میں شامل کروایا۔ جب میری سرگرمیاں بڑھیں تو گھر والے پریشان ہوئے کہ اس کی شادی کیسے ہو گی؟ اس پر انہوں نے گھر والوں کو بھی تسلی دی۔ انہیں بھی دین کی دعوت سے روشناس کرایا، یہاں تک کہ ہمارے گھر میں درس قرآن ہونے لگا اور امی ابو بھائی بھی میرا ساتھ دینے لگے۔ پھر انہوں نے میرے لیے تحریکی گھرانے کا رشتہ ڈھونڈا اور شادی کے

دنوں میں جب ہمارے گھر مہمانوں کی آمد و رفت تھی تو وہ کبھی چاول، کبھی سالن بنا کر لے آتیں کہ تم لوگوں کو آسانی ہو جائے۔ ان کا حسنِ سلوک ہر اس فرد کے ساتھ تھا جو اقامتِ دین کی راہ پر چلنے والا ہو''۔

ناظمہ پنجاب حمیرا اشرف صاحبہ بتاتی ہیں کہ ''اللہ نے انہیں بیٹی نہیں دی تھی، لیکن وہ سیکڑوں بیٹیوں کی ماں تھیں۔ لاہور میں پورے ٹاؤن شپ کے علاقے میں مسعودہ باجی سے قرآن کا ترجمہ پڑھنے والی لڑکیاں انہیں بیٹیوں سے زیادہ عزیز تھیں۔ جو طالبہ ایک بار ان کے درس میں آنا شروع کر دیتی، اس سے ہمیشہ تعلق قائم رکھتیں۔ خوشی غمی میں شرکت، اس کی ضروریات کا خیال، اخلاقی، فکری اور مالی امداد یہاں تک کہ اس طالبہ کے تمام گھر والے بھی مداح ہو جاتے کہ تمہاری استاد تم سے کتنا پیار کرتی ہیں۔ اگر کبھی کوئی ان کے دوپٹے، پرس یا ڈائری کی تعریف کر دیتا تو فوراً اسے وہ چیز دینے پر تیار ہو جاتیں کہ تمہارے اوپر یہ زیادہ اچھی لگے گی۔ ہر ایک سے محبت کا اتنا اظہار کرتیں کہ وہ خود کو ان سے بہت قریب سمجھتا۔ لوگ اپنے دل کی باتیں بے جھجک انہیں بتا دیا کرتے، یہاں تک کہ ایک گھر کی ساس بہو دونوں ایک دوسرے کی شکایتیں الگ الگ انہیں بتاتیں اور وہ حکمت کے ساتھ کبھی انفرادی کبھی درس میں دونوں کو اصلاح کا سبق سکھانے کی کوشش کرتیں۔ وہ کہتی تھیں کہ جو جماعت میں جتنا زیادہ فعال ہے وہ میری دوستی کا اتنا ہی زیادہ حق دار ہے۔ میں ذاتی دوستیوں پر وقت خرچ نہیں کر سکتی۔

نوجوان کارکنان کو کبھی بغیر آرائش اجتماعات میں نہیں جانے دیتی تھیں۔ ان کے کپڑوں، جوتوں پر نظر رکھتیں۔ انہیں اچھے کپڑے اور جوتے پہننے ولپ اسٹک لگانے کی تلقین کرتیں، کہتیں! یہ کوئی عمر ہے تمہارے ایسے سادہ رہنے کی؟ ازدواجی زندگی کی بہتری کے لیے انہیں قیمتی مشورے دیتیں۔ شوہروں کا خیال رکھنے کی تاکید کرتیں، کارکنان کے شوہروں پر بھی ان کی شخصیت کا اثر تھا اور وہ ان کی بات کو قبول کیا کرتے تھے۔ تحریکی بہنوں کے ساتھ ساتھ ان سارے افراد سے بھی انہیں لگاؤ تھا جو اس کام میں ان کے معاون تھے۔ ایک مرتبہ ان کے زیر استعمال گاڑی کا معمولی ایکسیڈنٹ ہو گیا تو بعد میں گاڑی کے ڈرائیور نے کہا کہ ''سب نے مجھ

سے گاڑی کے بارے میں پوچھا، لیکن مسعودہ باجی نے مجھ سے پوچھا کہ تم ٹھیک ہو؟ گاڑی سے زیادہ تم ہمارے لیے اہم ہو.....''۔

اطاعتِ نظم:

وہ ان افراد میں سے تھیں جو اطاعتِ نظم کی اہمیت کو دل سے سمجھتی اور اس پر عمل کرنے میں مثال ہوتی ہیں۔ ناظمہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ دل سے اس کی عزت و احترام کا معاملہ بھی کرتی تھیں۔ ناظمہ پنجاب حمیرا اشرف کہتی ہیں کہ مسعودہ آپا کوئی کام نظم سے پوچھے بغیر نہیں کرتی تھیں۔ انتقال سے ایک دن قبل مردانہ نظم نے انہیں کسی کام کا کہا تو اس پر بھی انہوں نے یہی جواب دیا کہ میں پہلے اپنے نظم سے دریافت کروں گی، پھر آپ کو بتاؤں گی۔ چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے سے پہلے ہم سے اجازت لیتی تھیں یا مشورہ کرتی تھیں، تو میں ان سے کہتی تھی کہ آپ میری استاد ہیں، ہم نے آپ سے ہر کام سیکھا ہے۔ آپ اتنی اتنی سی بات ہم سے نہ پوچھا کریں، تو وہ کہتیں کہ مجھے نظم سے بات کر کے تسلی ہو جاتی ہے۔ جب بھی میں ٹاؤن شپ امی کے گھر جاتی تو وہ ضرور ہی ملنے آتیں، کبھی یہ نہیں کہا کہ تم ملنے آجاؤ۔ کہتیں! تمہاری بڑی مصروفیت ہے، اس لیے میں خود آ جاتی ہوں تاکہ تمہارا وقت بچ جائے۔ اگر کبھی کسی کام کے لیے ہم گاڑی میں ساتھ ہوتے تو واپسی میں ہمیشہ پہلے مجھے اتارتیں اور کہتیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی ناظمہ سے پہلے اتر جائیں؟ نظم کی جانب سے جو بھی پالیسی یا منصوبہ آتا اس پر عمل میں لگ جاتیں، کبھی اس پر بحث یا اختلاف نہیں کیا، دوسروں کو یہی سمجھاتیں اور عمل کے لیے تیار کرتیں۔

خدمتِ خلق:

اُن کا دل ہمدردی سے بھرا تھا، جو ہر ایک کی غمگساری کے لیے تیار رہتا، جو خاتون رابطے میں آجاتیں، اس کے مسائل کو بھی اپنے مسائل سمجھتیں اور انہیں حل کرنے کی جدوجہد میں لگ جاتیں۔ درس میں آنے والی بہنوں سے قریبی تعلق رکھتیں، ان میں سے ایک خاتون جب کینسر کی بیماری میں مبتلا ہوئیں تو آپ اکثر ان کی خیریت دریافت کرنے جاتیں، انہوں نے مسعودہ

آپا سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ میرے بیٹے کی شادی ہو جائے تا کہ میری بہو سب آ کر سنبھال لے۔ مسعودہ آپا نے ان کی مرضی کے مطابق گھرانہ تلاش کرنے کے لیے بہت دوڑ دھوپ کی اور ان کے بیٹے کا رشتہ کروایا۔

اُن کے وسیع تعلقات کے سبب لوگ اپنے کپڑے، جوتے اور دیگر اشیا مستحق گھرانوں میں تقسیم کے لیے پہنچا دیتے تھے۔ تمام چیزوں کو الگ الگ کر کے ان کی مرمت یا دھلائی و استری کر کے انہیں پیک کرتی تھیں اور جس کے لیے جو چیز مناسب ہوتی تھی اسے پہنچا کر آتی تھیں۔ خود بھی ہر وقت انفاق کے لیے تیار رہتیں، لیکن اگر ایک جوڑا بھی کسی کو دیتیں تو یہ ضرور کہتیں کہ یہ جماعت اسلامی کی طرف سے ہے۔

قریب ہی واقع مسجد میں عورتوں کا حصہ بغیر چھت کے تھا، تو ہر ممکن کوشش کر کے اتنا فنڈ جمع کر لیا کہ نماز کے علاوہ حفظ کرنے والے بچوں اور بچیوں کا حصہ بھی مکمل ہو گیا۔

کسی کی پریشانی علم میں آتی تو اس کے لیے انتہائی خلوص سے دعائیں بھی کرتیں، مستحق بچیوں کی شادی کے لیے جہیز جمع کرتیں، لوگ ان پر بہت بھروسا کرتے تھے اور انہوں نے بھی کبھی کسی کے بھروسے کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔

مالیات:

جماعت اسلامی کے بیت المال کو مضبوط بنانے کے لیے انتہائی دوڑ دھوپ کرتی تھیں۔ جب کہیں سے اعانت یا خصوصی فنڈ میں بڑی رقم مل جاتی تو بہت خوش ہوتی تھیں۔ اس کے لیے بہانے بہانے سے موقع تلاش کرتی تھیں۔ رکن جماعت نائلہ اشرف بتاتی ہیں کہ ایک مرتبہ خوش خوش ہمارے گھر آئیں، بتایا کہ ''فلاں کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے اسے دیکھنے گئی تھی۔ انہوں نے اس کا نام تجویز کرنے کا کہا تو میں نے بچے کے دادا کا نام پوچھ کر وہی اس کا نام رکھ دیا۔ سب بڑے خوش ہوئے تو میں نے کہا اب اس کے نام کا صدقہ نکال دو، تو یہ پیسے انہوں نے پکڑائے ہیں، اسے تم بیت المال میں ڈال دو''۔

اسی طرح کسی کے گھر جاتیں تو کہتیں کہ یہ گاڑی دین کے کام کے لیے چلتی ہے، ایسا کرو تم

کچھ پیسے نکالو تو ہم پیٹرول میں تمہارا حصہ ڈال دیتے ہیں، گاڑی جتنا چلے گی تمہیں اتنا ہی ثواب ملے گا۔ ہر ایک سے اس کے مزاج اور استطاعت کے مطابق بات کرتیں، لوگوں سے بھرپور اعتماد سے مانگتی تھیں اور اللہ ان کی بات پوری کروا بھی دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اپنے ساتھ بہن حمیرا اشرف کو لے کر کسی کے گھر فنڈ لینے گئیں اور کہا کہ ''مجھے تو آپ سے گیارہ لاکھ روپے لینے ہیں اس سے کم بالکل نہیں لوں گی'' اور ان خاتون نے یکمشت گیارہ لاکھ روپے انہیں پکڑا دیے۔ یہ بھی فکر رہتی تھی کہ میں جہاں جہاں سے فنڈ لیتی ہوں نظم کو ان خواتین سے متعارف کرا دوں تا کہ میرے بعد بھی یہاں سے بیت المال کو تعاون ملتا رہے۔ ناظمہ اگر اپنی کسی ضرورت کا تذکرہ کر دیتی تو اسے پورا کرنے کی دھن سوار ہو جاتی۔ حمیرا اشرف کہتی ہیں کہ ان کی وفات سے دو دن پہلے میں نے انہیں دفتر کے لیے فی ظلال القرآن اور معارف القرآن کے سیٹ کے لیے کہا۔ کہنے لگیں، رمضان میں مل جائے گا ان شاء اللہ۔ زندگی کی آخری رات ان کا فون آیا کہ تم نے پتا نہیں کس خلوص سے مانگا تھا فی ظلال القرآن کا سیٹ آ گیا ہے۔ کل تمہارے دفتر پہنچا دوں گی اور کچھ دنوں میں معارف القرآن کا سیٹ بھی آ جائے گا۔ اعانت، صدقات، زکوٰۃ سب کے حسابات ایک رجسٹر میں واضح درج کرتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ امانتوں کو فوراً اس کے مقام تک منتقل کرنے کی فکر بھی رہا کرتی۔ ٹاؤن شپ میں بیٹھک اسکولز کے قیام اور ان کے چلانے میں بھی ان کا بہت تعاون رہا۔

تربیت سازی:

کارکنان سے محبت کے ساتھ ان کی تربیت کی فکر بھی دامن گیر رہتی، اپنی جگہ کھڑی کرنے کے لیے افراد کی تیاری کی سوچ غالب رہتی تھی۔ کسی پروگرام میں فرد کو بھیجنا ہوتا تو بڑی محبت سے سمجھاتی تھیں ''بڑا اہم پروگرام ہے اس میں چلی جاؤ، انکار نہ کرنا''۔ اجتماع کارکنان میں یا ویسے ہی کارکنان کے سامنے کوئی کام آنے پر اگر کوئی آگے نہ بڑھتا تو دلسوزی سے کہتیں کہ ''کوئی نہیں کر رہا تو چلو میں کر لیتی ہوں''۔ اس پر باقی افراد بھی کام کرنے کھڑی ہو جاتیں۔ مشاورت کی بے حد قائل تھیں۔ کہتی تھیں کہ بجٹ میں فون کے لیے خصوصاً رقم رکھتی ہوں تا کہ

سب سے رابطہ رکھنے میں آسانی رہے۔

حلقوں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ آپ وہاں کارکنان کی ذمہ داری لگاتی جاتیں۔خود ہر حلقہ میں جا کر دس پندرہ منٹ گفتگو کر کے پھر کسی کارکن کے سپرد کر کے حلقے میں چلی جاتیں۔آنے والی نئی کارکنان کو بولنے اور درس دینے کا طریقہ سکھاتیں۔اگر کوئی گھبراتی تو اسے تسلی دیتیں کہ کوئی انسان کامل نہیں ہوتا۔چھوٹی موٹی غلطیاں سب سے ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے، ہم درس دیں گے تو اس کے ذریعے ہمارے معاملات خود ہی درست اور بہتر ہوتے چلے جائیں گے۔

صاحبِ عزیمت:

ملاقاتوں کے لیے اکثر پیدل جاتیں، بعض اوقات زیادہ چلنے سے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے، تحریکی بہنیں پیدل چلنے سے منع کرتیں تو کہتیں ''یہ چھالے قیامت کے دن گواہی دیں گے''۔دوپہر میں تپتی دھوپ میں گھر سے نکلتیں تو ہمیشہ دعا کرتیں کہ ''اللہ اس کے بدلے جہنم کی آگ سے بچالینا''۔شوگر بڑھی ہوئی تھی، پاؤں سوجے ہوئے، چھالے پڑے ہوئے، دل کی بیماری بھی ہوگئی تھی لیکن زندگی میں آرام کا نام نہیں تھا۔کبھی کسی کام کو منع نہیں کیا۔خواہ طبیعت خراب ہو یا کوئی اور عذر ہو لیکن اگر آپ کو کوئی بھی ڈیوٹی دے دی جاتی تو آپ اسے نبھانے کی کوشش میں لگ جاتیں۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ آپ کے بیٹے کو اغوا کر کے لے گئے آپ صبر کے ساتھ پوری رات قرآن کی تلاوت کرتی رہیں۔صبح انہیں واپس سڑک پر چھوڑ گئے۔دوسرے بیٹے پر پولیس نے جھوٹا مقدمہ قائم کر کے گرفتار کرلیا۔اس پریشانی میں بھی صبر کیا اور پوری رات قرآن پاک کی تلاوت اور کتاب ''رودادِ قفس'' کا مطالعہ کیا اور ساتھیوں سے اس اللہ کی راہ میں آنے والے امتحانات اور زینب الغزالی کی استقامت پر بات کرتی رہیں۔

شوقِ مطالعہ:

مطالعہ کی بہت شوقین تھیں۔پلنگ کے ساتھ میز پر ہمیشہ ترجمان القرآن، بتول، زیر

مطالعہ تفہیم کی جلد، نئی شائع ہونے والی تحریکی کتاب اور ایک رجسٹر مع قلم موجود ہوتا۔رجسٹر میں تمام کتابوں کی مدد سے نوٹس تیار کرتیں، کہتیں یہ میں اس لیے بنا رہی ہوں تاکہ میرے بعد میری بہوؤں کو اس سے درس دینے میں آسانی ہو جائے۔وسیع المطالعہ ہونے کے سبب ان کا درس حالاتِ حاضرہ سے بھی واقفیت کرا دیتا تھا اور غور و فکر کے نئے نئے پہلو سامنے آتے تھے۔کسی سے ملنے جاتیں تو پڑھی ہوئی کتاب سے لیے گئے نوٹس سناتی تھیں۔

گھر کی غازی:

انسان کی شخصیت کا اصل رنگ اس کے اپنے گھر میں ظاہر ہوتا ہے، اس لحاظ سے وہ جس قدر گھر سے باہر خلیق تھیں اس سے زیادہ گھر والوں کے حق میں رحیم و شفیق تھیں۔شادی ہو کر آئیں تو مشترکہ خاندان میں ساس کے علاوہ دیورانیوں جٹھانیوں کے ساتھ معاملات نبھائے اور اس طرح نبھائے کہ آپس میں حسن سلوک کی دلفریبی چھائی رہی۔نندوں کے ساتھ بھی بہترین تعلقات برقرار رکھے اور اپنے دونوں بیٹوں کی شادی اپنی نندوں کی بیٹیوں سے کی۔جہیز لینے سے انکار کر دیا، بہو گھر آئی تو اسے پورا اختیار دیا کہ یہ تمہارا گھر ہے جہاں دل چاہے رہو، جو فرنیچر رکھنا چاہو رکھو، جو نکالنا ہے نکال دو۔چھ ماہ تک بہو اوپر رہی، اپنی مرضی کی سیٹنگ کی پھر نیچے منتقل ہونا چاہا تو اس پر بھی بڑی کشادہ دلی سے اسے نیچے سیٹ کیا اور خود اوپر چلی گئیں۔لوگ حیران ہوتے تو کہتیں اگر بہو اپنی مرضی سے کام نہیں کر سکے گی تو اسے کیسے لگے گا کہ یہ اس کا گھر ہے؟ بیٹے اور بہو میں سے ہمیشہ بہو کی طرف داری کرتیں، بیٹا کہیں باہر جا رہا ہوتا تو کہتیں بہو کو بھی ساتھ لے کر جاؤ۔دن بھر تم آفس میں ہوتے ہو یہ اکیلی رہتی ہے اب اس کو اکیلا نہ چھوڑو، ساتھ لے کر جاؤ۔

گھر والوں کے آرام کا یہاں تک خیال تھا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد جلد گھر سے نکل جاتیں تاکہ گھر والوں کو بعد میں سوتے سے اٹھ کر دروازے کی کنڈی نہ لگانی پڑے۔خود یہ وقت ملاقاتوں میں استعمال کر کے سہ پہر میں درس کے لیے چلی جاتیں۔

شوہر محترم گواہی دیتے ہیں کہ ''گھر میں شجر سایہ دار تھیں۔ان کے اچھے کاموں سے متاثر

ہو کر میں بھی جماعت اسلامی کا کارکن بنا، جس کی انہیں ازحد خوشی تھی، ان کی گفتگو ہر ایک کو گرویدہ کر لیتی تھی۔ اچھے اخلاق کی وجہ سے اہل خانہ، ہمسائیوں اور رشتہ داروں سب کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ سب بات سنتے اور مانتے تھے۔ زندگی کے آخری پانچ سالوں میں صحت خراب رہتی تھی۔ بلڈ پریشر، شوگر اور پھر انجیو گرافی بھی ہوئی۔ دن بھر میں دوا کی ۱۴ گولیاں استعمال کرتیں، لیکن کبھی اپنی تکلیفوں کا ذکر نہیں کرتی تھیں بلکہ ہر وقت خود کو تازہ دم رکھتی تھیں، اور دین کے کاموں میں خوشی محسوس کرتیں۔ روزانہ تہجد کے وقت اٹھتیں، نماز تہجد اور فجر کے بعد تفہیم القرآن کا مطالعہ کرتیں، درس کی تیاری کرتیں، پھر گھر کے کاموں میں لگ جاتیں۔ سلیقہ شعار اور وفادار بیوی تھیں، کبھی کوئی ناجائز فرمائش نہ کرتیں۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ وقت تھوڑا ہے اور کام بہت زیادہ ہیں، ان کے پاس چوبیس گھنٹوں کی پلاننگ ہوتی تھی۔ تھوڑے وقت میں زیادہ کام سمیٹتیں اور وقت ضائع نہ کرتیں۔ دونوں بیٹوں کی تربیت بھی بہت اچھی کی اور دونوں انتہائی فرماں بردار ہیں‘‘۔

ان کی بڑی بہو شازیہ بتاتی ہیں کہ ان میں روایتی ساسوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ میں گھر سجاتی تو بے حد خوش ہوتیں، کچن کا کوئی کام کرتی تو بے حد تعریف کرتیں، میری چھوٹی بڑی غلطیوں کو کشادہ دلی سے درگزر کر دیتیں۔ شادی کے چند ماہ بعد جب میرے والد کا انتقال ہو گیا تو میری بہت دلجوئی کی۔ اپنی ساس جو میری نانی تھیں بڑی محبت سے ذکر کیا کرتیں۔ میرے تینوں بچوں کی پیدائش پر وہ آگے بڑھ کر ہر معاملے میں میری مددگار ہوئیں۔ بچوں کو بھرپور وقت دیتیں، انہیں کہانیاں سناتیں، ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کھیل کھیلتیں، ان کو انعام دیتیں، اکثر دینی کتب لاتیں تو ہم میں سے کسی کا نام لکھ کر اسے تحفہ میں دیتیں، میں حج کرنے گئی تو بہت خوش دلی سے بچوں کو رکھا حالانکہ اس وقت میری چھوٹی بیٹی صرف دو سال کی تھی۔

ان کا حوصلہ اور صبر مثالی تھا۔ انہیں بستر پر لیٹنا پسند نہیں تھا، خود ہر کسی کے کام آتی تھیں لیکن اپنی خدمت کروانا انہیں اچھا نہیں لگتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے ہر نعمت ملنے پر میں نے انہیں شکر کرتے اور دعائیں دیتے ہی پایا۔ اکثر اپنے دروس میں کہتیں کہ نبیؐ نے مکہ فتح کرنے سے

پہلے لوگوں کے دلوں کو فتح کیا تھا۔ زندگی بھر خود انہوں نے بھی اس سنت پر عمل کیا۔ ہر ایک سے محبت سے پیش آتیں اور ہر ایک کو فوراً بیٹی بنا لیتیں۔ رشتہ داروں اور ہمسائیوں کے حقوق پورے کرتیں، چمکتے چہرے اور اجلے دل کی مالک تھیں۔

دن بھر اللہ کی خاطر دوڑ دھوپ کرتیں، لیکن میں نے کبھی ان کے چہرے پر تھکن یا بیزاری نہیں دیکھی۔ خود خوش رہنے والی اور دوسروں کو خوش رکھنے والی تھیں، کبھی کسی کے لیے بُرا نہ سوچتیں، اگر ہم کبھی کہہ بھی دیتے کہ فلاں یوں اور یوں ہے تو کہتیں چھوڑو یہ اس کی عادت ہے، ہمیشہ دوسروں کی خوبیوں پر نظر رکھتیں۔

گھر کے معاملات میں بھرپور انداز میں شریک ہوتیں۔ ہمیں بہترین مشورہ دیتیں، شام کی چائے اکٹھے پینے کو ترجیح دیتیں اور اس میں پروگرامز میں سنی ہوئی خاص خاص باتیں بھی سنا جاتیں۔ انہوں نے غیر محسوس انداز میں گھر کے ہر فرد کی تربیت کی اور اس میں مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔

شرم وحیا کی بے حد پاسداری کرتی تھیں۔ منہ بولی بیٹیوں کے بچے جب بڑے ہو گئے تو ان سے پردہ کرنا شروع کر دیا۔ جب شدید ہارٹ اٹیک کی حالت میں انہیں اسپتال لے جا رہے تھے جب بھی وہ اپنا برقع مانگ رہی تھیں۔ وہ ہمارے لیے ایک شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتی تھیں۔

چھوٹی بہو عافیہ بتاتی ہیں کہ ’’اِن کی شخصیت کی نمایاں خوبی ہر ایک سے محبت کرنا تھی۔ ان کی تعزیت کے لیے آنے والی اکثر خواتین کی زبان پر یہی بات تھی کہ آپا جی ہم سے بہت محبت کرتی تھیں اور ہم اپنے دل کی ہر بات ان سے کر لیتے تھے۔ ہمیشہ گھر والوں کو جوڑ کر رکھتی تھیں۔ وہ نڈر اور صاف گو تھیں، بچوں کی تربیت پر آپ نے خصوصی توجہ دی اور اگر اپنے بیٹوں میں کوئی غلط بات دیکھی تو کبھی اس کی طرف داری نہیں کی بلکہ اصلاح کی کوشش کی۔ میں نے انہیں کبھی فارغ بیٹھے نہیں دیکھا۔ جب گھر میں ہوتیں تو ہمارے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتیں۔ بچوں کو اپنے ساتھ کھیل میں مصروف رکھتیں اپنے سارے کام خود کرتیں اور کہتیں کام کرنے سے انسان چست رہتا ہے۔ وہ تھوڑے وقت میں زیادہ کام کرتی تھیں۔

ہمسائیوں اور رشتہ داروں کی ہر خوشی غمی میں شریک ہوتیں اور دعوتِ حق پیش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتیں۔ جب عمرہ کرنے گئیں تو خاص طور پر گھر میں کام کرنے والیوں کی طرف سے طواف کیے اور پھر واپس آ کر انہیں بتایا۔ وہ ہر ایک سے محبت کرتیں اور اس کا اظہار بھی کرتی تھیں، میں شادی کے بعد مختلف شہروں میں مقیم رہی وہ ہر مقام پر جب بھی میرے پاس رہنے آتیں تو ان کی بھرپور کوشش ہوتی کہ وہاں بھی جماعت کا کام کرلیں۔ جب میں ان سے ملنے لاہور آتی تو واپس جاتے ہوئے میرے ہاتھ میں کچھ پیسے ضرور پکڑا دیتیں، اگر میں منع کرتی تو کہتیں کہ بڑے جب دیں تو انکار نہیں کرتے۔

زندگی کے آخری چند سالوں میں آپ شدید بیمار رہیں، لیکن آپ نے ہمیشہ صبر و ہمت کا بہترین مظاہرہ کیا، بلکہ بیماری سے آپ میں دعوتِ دین کا جذبہ پہلے سے دوچند ہو جاتا تھا اور طبیعت ذرا بہتر محسوس ہوتی تو آپ پہلے سے بڑھ کر دین کا کام کرنے لگتیں۔ آخری دنوں میں ان کی جماعتی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی تھیں اور گھر میں ان کا وقت کم گزرتا تھا۔ جب گھر میں آتیں تو کہتیں، میں تم لوگوں کو زیادہ وقت نہیں دے سکتی آؤ میں تمہیں پیار کروں۔ پھر سب کو گلے لگا کر پیار کرتیں۔ آخری کچھ عرصے میں وقتاً فوقتاً ہم سے کہتی رہتیں مجھے معاف کر دو۔ میں ان سے کہتی آپ کی ذات سے تو ہمیں کبھی تکلیف نہیں ہوئی آپ کس بات کی معافی مانگتی ہیں؟ اکثر یہ دعا کرتیں کہ اللہ مجھے کسی کا محتاج نہ کرنا اور چلتے پھرتے اپنے پاس بلا لینا اور اللہ نے اپنی اس بندی کی اس دعا کو قبول بھی فرما لیا''۔

بچوں کی تربیت:

اپنے گھر کے بچوں کے ساتھ ساتھ خواتین کارکنان کے بچوں کی تربیت کے لیے بھی فکرمند رہتیں اور انہیں سمجھاتیں کہ بچے عمل سے نمونہ سیکھتے ہیں۔ انہیں اچھا کر کے دکھاؤ گی تو وہی کریں گے۔ اپنے گھر میں بچوں کے بیٹھنے اور سونے کی جگہوں پر سبق آموز کہانیوں کی کتابیں اور تحریکی لٹریچر کے چھوٹے پمفلٹس رکھ دیتیں تاکہ جب موقع ملے تو بچے پڑھ لیں۔ مختلف مواقع پر بچوں کو تحفے میں کتابیں دیتیں۔ آدابِ زندگی پڑھ کر سناتیں اور

آداب اور دعائیں یاد کرواتیں۔ دروازوں پر دعاؤں کے اسٹیکرز لگا دیتیں تاکہ سب کی نظر پڑتی رہے اور دعا یاد ہو جائے۔ بچوں کو سلاتے وقت بھی قرآنی آیات یا دعائیں پڑھتی رہتیں۔ انہوں نے گھر کے بیرونی دروازے کے پاس ایک اسکارف رکھا ہوا تھا اگر کسی مرد سے کوئی چیز وصول کرنی ہوتی تو وہ اسکارف پہن کر وصول کرتیں۔ وہ خود دوسروں کو بتاتی تھیں کہ ایک بار دروازے کی بیل بجی تو میری تین سالہ پوتی بھاگی بھاگی گئی اور اسکارف پہن کر گیٹ کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر وہ چیز لی۔ اس طرح سے بچے عملی نمونے سے اثرات قبول کرتے ہیں۔

نوجوان بچیوں کی بھی اس سلسلہ میں رہنمائی کرتی رہتی تھیں۔ کہتی تھیں بچوں کو ہمیشہ دائیں ہاتھ سے دھو کر اور ممکن ہو تو باوضو ہو کر کھانا کھانے کی تلقین کرو۔

سیاسی جدوجہد:

سال ۲۰۰۳ء میں جماعت اسلامی کی طرف سے بلدیاتی الیکشن میں حصہ لیا اور یوسی سے کامیابی حاصل کی۔ سٹی گورنمنٹ لاہور میں ڈسٹرکٹ ممبر کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دیے۔ ٹاؤن ہال لاہور میں اجلاس کے دوران اپنی تقریروں سے حکومت کی مستقل توجہ حل طلب امور کی جانب دلاتی رہتی تھیں۔

قومی انتخابات کے دنوں میں بھرپور مہم چلاتیں۔ انتخابی مہم کے دوران جو لوگ اعتراضات کرتے اور ووٹ دینے کے حامی نہ ہوتے، جب ان سے مسعودہ باجی ملنے چلی جاتیں تو گھر والیاں فوراً کہہ دیتیں کہ اب آپ آ گئی ہیں تو ہم انکار نہیں کر سکتے۔ ٹاؤن شپ کے حلقے میں جماعت کے ووٹ بنک میں ان کا کلیدی کردار تھا۔ ریلی میں مظاہروں میں ٹاؤن شپ کے حلقے سے کئی بسیں بھر کر جاتی تھیں۔ لوگ ان پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ ان کے نام سے ہر کام کی اجازت دے دیتے تھے۔ ان کے برابر میں مسلم لیگ کا گھرانہ تھا لیکن ان کے گھر کی بچیاں الیکشن میں جماعت اسلامی کے کیمپ میں کام کرتی تھیں۔ گھروں کے مرد بھی کہہ دیتے تھے کہ تمہاری درس والی باجی نے کہا ہے تو یہ کام کرلو۔

لیاقت بلوچ صاحب الیکشن میں کھڑے ہوئے تو الیکشن سے قبل کی رات پتا چلا کہ صبح جو گاڑیاں ووٹرز کو لانے کے لیے استعمال ہونی ہیں ان کے اوپر لگانے والے جھنڈے نہیں ہیں تو ساری رات مشین چلا کر سو جھنڈے سی کر تیار کیے۔ ہر الیکشن میں دل و جان سے وقت، صلاحیت اور مال خرچ کرتی تھیں۔

ہمہ گیر اثرات:

وہ ایک سادہ دل گھریلو خاتون تھیں، لیکن اخلاص اور حسنِ اخلاق سے ایک عالم اُن کا گرویدہ تھا۔ اس میں نہ عمر کی قید تھی نہ طبقے کی اور نہ تعلیم کی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، اونچے اسٹیٹس والی خواتین ہوں یا غریب، اَن پڑھ، دیہاتوں مضافات میں رہنے والی عورتیں ہوں، ہر ایک سے قریبی تعلق بن جاتا تھا۔ لوگوں کی نفسیات اور مزاج کے مطابق ان کے سامنے دین کی دعوت پیش کیا کرتیں۔ خواتین کہا کرتی تھیں کہ کوئی اور کام چاہے ہم سے چھوٹ جائے لیکن ہم مسعودہ باجی کا مؤثر اور دلنشین درس نہیں چھوڑ سکتے۔

سفرِ آخرت:

زندگی کے آخر تک وہ ایک مستعد سپاہی کی طرح اپنی ڈیوٹی ادا کرتی رہیں۔ ۱۵/جون ۲۰۰۷ء جمعہ کا دن تھا۔ صبح اپنا اور شوہر محترم کا ناشتہ بنایا۔ ۸ بجے ناشتہ سے فارغ ہو کر معمول کے کام کیے۔ ٹیلی فون پر درس کے سلسلہ میں کچھ خواتین سے رابطے کیے۔ گاڑی ان کو پروگرام میں لے جانے کے لیے گیٹ پر آ گئی، تو نو بجے کے قریب انہیں دل کی شدید تکلیف ہوئی۔ طبیعت کی خرابی کی شدت کے باعث برقع نہ پہنا سکے اور ہاسپٹل لے گئے تو اس عالم میں بھی بار بار دوپٹہ کھینچ کر اپنا منہ ڈھانپ لیتیں۔ گیارہ بجے کے قریب کلمہ پڑھتے پڑھتے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کے مطابق انہیں چلتے پھرتے اپنے پاس واپس بلا لیا۔ وہ خود چلی گئیں لیکن ہزاروں سوگواروں کے دلوں میں اپنی یادوں کا خزانہ چھوڑ گئیں۔ آج ان کے شوہر، بیٹے اور بہویں اِن کے اختیار کردہ مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ان شاء اللہ اس کا اجر بھی انہیں مل رہا ہوگا۔

ٹاؤن شپ میں ان کی ہر وقت کی ساتھی نائلہ کہتی ہیں کہ ''وہ کاموں سے واپسی پر اکثر مغرب کے وقت دروازہ کھٹکھٹاتیں اور جو ضروری باتیں مجھ تک منتقل کرنی ہوتیں مجھے بتا کر اپنے گھر جاتیں۔ آج اتنے سال گزرنے پر بھی مغرب کے وقت ایسا لگتا ہے جیسے ابھی دستک ہوگی اور ان کی مشفقانہ صدا سنائی دے گی۔ لوگوں کے دل آج بھی ان کی یادوں سے معمور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو شرفِ قبولیت عطا کرے۔ آمین!

ماخذات

۱۔ حمیرا اشرف صاحبہ۔ نائب قیمہ حلقہ خواتین۔
۲۔ حمیرا احتشام صاحبہ۔ سابق ناظمہ علاقہ
۳۔ نائلہ اشرف صاحبہ۔ رکن جماعت اسلامی
۴۔ نغمانہ صاحبہ۔ کارکن جماعت اسلامی
۵۔ محمد افضل صاحب۔ شوہر
۶۔ شاذیہ محسن صاحبہ۔ بہو
۷۔ عافیہ فیصل صاحبہ۔ بہو

&

مشعل پروین

۱۹۵۰ء تا ۲۰۱۲ء

)

4

منجھلے بیٹے کاشف کو جب جمعیت کا کام کرنے پر مخالف جماعت نے فائرنگ کر کے شدید زخمی کر دیا تو ساتھی اٹھا کر پرائیویٹ اسپتال لے گئے، جنہوں نے داخل کرنے سے انکار کرتے ہوئے سرکاری اسپتال لے جانے کا کہا۔ ایسے میں بڑے بھائی نے ڈاکٹرز پر غصہ کیا تو اسے ڈانٹا اور کہا ”بدتمیزی کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے، تم داعی ہو تمہارا اخلاق خراب نہیں ہونا چاہیے۔ بیٹا اگر مرتا ہے تو مر جائے، میں صبر کر لوں گی لیکن تمہیں اپنا رویہ درست رکھنا چاہیے“۔

4

روز کی طرح بڑے تھیلے کو کاندھے پہ لٹکائے، وہ بچہ گلیوں سے کچرا چن چن کر اس میں ڈال رہا تھا۔ کونے والے گھر سے مڑ کر دوسری گلی میں آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ایک آواز لگا کر اس نے گلی والوں کو گویا اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اور گلی کا کچرا چن کر ایک مخصوص دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو ہاتھ برآمد ہوئے جو اس کے لیے شربت کا ٹھنڈا گلاس تھامے ہوئے تھے۔ بچے نے پہلے گلاس اور پھر گلاس تھامے ہوئے خاتون کو دیکھا اور بصد ناز بولا، ''باجی آج تو شربت کے بجائے چائے ہو جائے''۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں'' کہہ کر وہ خاتون پلٹیں اور کچھ ہی دیر بعد وہ بچے کے لیے چائے کا گرم کپ لے کر پلٹیں۔ بچے نے تھیلا نیچے رکھ کر اطمینان سے چائے پی اور پھر تھیلے سمیت آگے بڑھ گیا۔ اس غریب بچے کو روزانہ مہمان نوازی کا شرف بخشنے والی یہ خاتون جماعت اسلامی کی دیرینہ رکن مشعل پروین تھیں۔ جن کے خمیر میں انسان دوستی اور مہمان داری اس طرح رچی بسی تھی کہ گلی کے جمعدار اور کچرا چننے والے تک اس سے فیض رسانی حاصل کر سکتے تھے۔ وہ بھی اس عزت کے ساتھ کہ ان میں فرمائش کا حوصلہ بھی جواں رہتا تھا۔ انسان اور اس سے وابستہ حقوق ان کی نظر میں انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ بھرپور گھریلو اور تحریکی زندگی گزارتے ہوئے اپنے سے وابستہ ہر شخص کی فکر رہا کرتی تھی۔

ابتدائی زندگی:

انسانی خدمت اور محبت کو اپنا شعار بنانے والی مشعل پروین کو اللہ تعالیٰ نے حسنِ صورت اور سیرت دونوں سے آراستہ کیا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں لکھنو میں آنکھ کھولنے والی مشعل پروین نے ابتدا ہی سے تحریک کو اپنے گھر میں موجود پایا۔ والد اشفاق حسین اور والدہ روشن نسرین جماعت اسلامی کے ابتدائی ارکان میں سے تھے۔ پانچ بہن بھائیوں کے اس خاندان میں آپ سب سے بڑی تھیں۔ ابھی انٹر تک تعلیم حاصل کی تھی کہ ازدواجی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ شادی ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو مکمل تحریکی تھا۔ شوہر اسامہ مراد، تحریک اسلامی کے معروف رہنما، اسلامی اسکالر و مفکر خرم مراد صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ مشترکہ رہائش والے اس گھرانے

میں اپنی ساس کی بہترین مددگار ثابت ہوئیں اور تمام اہلِ خانہ کی ضروریات اور مزاجوں کے مطابق گھرداری کے فرائض احسن انداز سے سرانجام دیتی رہیں۔ ساتھ ہی اپنے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے گریجویشن کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے پانچ بیٹیوں اور تین بیٹوں سے نوازا۔ محنت کی عادت تھی۔ ماسی سے گھر کے بہت سے کام نہیں کرواتی تھیں۔ جھاڑو پونچھا کروا کر باقی کام خود کرتی تھیں تاکہ کام کی عادت رہے۔ برتن دھونا، کھانا پکانا، کپڑے دھونا، باغبانی، ڈرائیونگ کرنے کے فرائض تک خود سرانجام دیتی تھیں۔

بچوں کی تربیت:

شوہر کی تحریکی مصروفیت کے باعث بچوں کو خود زیادہ وقت دیا۔ مزاج شناسائی ان کی خاص خوبی تھی جس کے باعث وہ ہر بچے سے یکساں قریب تھیں۔ بچوں کی خامیوں پر نظر رکھنے کے بجائے وہ ان کی خوبیوں کو زیادہ نمایاں بنا کر پیش کیا کرتی تھیں تاکہ وہ خوب سے خوب تر بننے پر متوجہ رہیں۔ بچوں کے ذہن میں اقامتِ دین کی جدوجہد کو نصب العین بنانے کے تصور کو جمایا لیکن اس طرح کہ انہیں کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ ان سے زبردستی کوئی کام کروایا جا رہا ہے۔ تعلیمی سلسلے میں اپنی مرضی اور خواہش، بچوں کے دلوں میں ڈالنے کی بجائے، انہیں اپنی خواہش پر پڑھنے کے لیے آزاد چھوڑا۔ ابتدائی کلاسز بچوں کو خود گھر پہ پڑھائیں تاکہ ذہن میں مثبت نقوش راسخ ہو سکیں۔ پھر اردو میڈیم اسکول میں بچوں کو داخل کروا دیا۔ دوسری بیٹی عائشہ بتاتی ہے کہ امی نے بعد میں بتایا کہ میں نے تمہیں اردو میڈیم اسکول میں اس لیے داخل کروایا کہ تم لوگ اپنی پڑھائی آسانی سے کر سکو۔ اگر انگلش میڈیم میں داخل کرواتی تو تمہارے ساتھ مجھے بھی بہت وقت لگانا پڑتا اور میں درس و تدریس اور دیگر تحریکی کاموں کے لیے وقت نہ نکال پاتی۔ بچوں کو قسمت پر پورا یقین دلایا کہ دنیا جتنی اللہ نے لکھی ہے تمہیں ضرور ملے گی البتہ جنت کے لیے تمہیں خود محنت کرنی پڑے گی۔ الحمدللہ! آج ان کے سارے بچے جہاں تحریک سے سرشار ہیں وہاں تعلیم اور معاش کے اعتبار سے بھی بہترین مقام پر فائز ہیں۔

دنیاوی معاملات میں بچوں کو مکمل آزادی دینے کے ساتھ ساتھ اخلاقی صورتحال پر ہمیشہ نظر رکھی۔ یہاں تک کہ انتہائی مشکل وقت میں بھی ممتا کے تقاضے سے بلند ہو کر اخلاقیات کا

درس دیا۔ منجھلے بیٹے کاشف کو جب جمعیت کا کام کرنے پر مخالف جماعت نے فائرنگ کر کے شدید زخمی کر دیا تو ساتھی اٹھا کر پرائیوٹ اسپتال لے گئے جنہوں نے داخل کرنے سے انکار کرتے ہوئے سرکاری اسپتال لے جانے کا کہا۔ ایسے میں بڑے بیٹے نے ڈاکٹرز پر غصہ کیا تو اسے ڈانٹا اور کہا، ''بدتمیزی کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔ تم داعی ہو تمہارا اخلاق خراب نہیں ہونا چاہیے۔ بیٹا اگر مرتا ہے تو مر جائے میں صبر کرلوں گی لیکن تمہیں اپنا رویہ درست رکھنا چاہیے۔ بچوں نے مسلسل اس راہ میں مار کھائی، تشدد سہا، سگریٹ سے داغے گئے، گولیاں کھائیں لیکن جمعیت کے کام سے انہیں کبھی نہیں روکا۔

بچوں کی شادیوں میں تحریکی وابستگی اور تعلیم کا خصوصی خیال رکھا۔ وہ جائز حد میں بھرپور خوشیاں منانے کی قائل تھیں لیکن خوشیوں کے لیے زیرِ بار ہونے کی قائل نہ تھیں۔ بہوؤں کو بھی بیٹیوں کی طرح رکھا۔ شادی کے بعد انہیں مزید پڑھنے کی ترغیب دی۔ مکمل حوصلہ افزائی اور گھریلو کاموں میں سہولت فراہم کرتے ہوئے انہیں ماسٹرز تک تعلیم دلائی۔ چھوٹی بہو اسماء کہتی ہیں کہ ''وہ میری ساس تھیں لیکن ماں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سراپا محبت، رحمت اور شفقت۔ انہوں نے ہمیں اپنی بیٹیوں کی طرح رکھا اور سمجھا، صحیح اور غلط کی پہچان دی، ہمارے بچوں کے مزاج کو ہم ماؤں سے بہتر سمجھتی تھیں۔ سب کے مزاج کو سمجھتے ہوئے ان میں گھل مل جانا ان کی خوبی تھی''۔ دوسری بہو صفیرہ کہتی ہیں کہ ''شادی کے بعد جب انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا تو میں سمجھی کہ گھریلو ذمہ داریوں کے حوالے سے مجھے بتائیں گی لیکن انہوں نے ساتھ بٹھا کر سورۃ کہف پڑھائی اور سمجھائی''۔ گھریلو کاموں کے لیے کہا کہ ''وہ تو ہوتے ہی رہیں گے، تم قرآن پڑھو اور سیکھو''۔ بچے چھوٹے تھے تو سمجھایا کہ انہیں زیادہ وقت دو۔ بڑے بچے کی اچھی تربیت کرو گی تو چھوٹے ان کو دیکھ کر ہی اچھے ہو جائیں گے۔ بچوں کے ذریعے ان کی ٹیچرز تک دعوت پہنچاؤ۔ رشتہ داروں کو خدمت کے ذریعے دعوت دو۔ جب بچے بڑے ہو جائیں تو کام کے دائرے کو بڑھا دینا۔ بیٹیوں میں بھی اپنے اوصاف منتقل کیے۔ لوگوں کو کھلانے پلانے کی بہت شوقین تھیں لیکن اپنے اور بچوں کے لیے ''سب کچھ کھاؤ لیکن کم مقدار میں کھاؤ'' کا اصول نافذ کیا ہوا تھا''۔

خاندان میں کردار:

ان کے شوہر اسامہ مراد صاحب جماعت اسلامی کراچی کے نظم میں کام کرنے کی وجہ سے اپنے آفس سے تقریباً روزانہ جماعت کے دفتر چلے جاتے اور رات دیر سے گھر واپس آتے۔ اس وجہ سے ان ہی کو گھر اور بچوں سے متعلق زیادہ ذمہ داریاں انجام دینی پڑتی تھیں۔ اس چیز نے ان کے اندر ایسی پھرتی پیدا کر دی تھی جسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے ان کے پاس ترجیحات کی طویل فہرست ہے جس کے مطابق وہ جلدی جلدی تمام کام نمٹا رہی ہیں۔ اپنے گھر کے ساتھ ساتھ والدہ کی بیماری کے دنوں میں تین سال تک معمول رہا کہ گھر کی ذمہ داریوں کو سمیٹنے کے بعد شوہر کے ساتھ والدہ کے گھر جاتیں۔ کیونکہ صرف ایک چھوٹی بہن غزالہ ان کے پاس تھی۔ والدہ کے تمام کام سرانجام دیتیں اور پھر اپنے گھر واپس آتیں۔ مرحومہ نے اپنے خاندان کو جوڑ کر رکھا۔ خاندان والوں کی بہت دعوتیں کرتی تھیں جس میں میکے اور سسرال کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ ہر فرد کی پسند کا خیال رکھ کر کھانا پکاتیں۔ خاندان میں کسی کو بھی مشکل پیش آتی تو ان کی کوشش ہوتی کہ معاملے کو حل کرلیا جائے۔ بہنوں، نندوں دونوں طرف کی بھابھیوں اور دیگر اعزہ سے خوشگوار تعلقات رکھتیں اور اُن کو گھریلو تجربوں کی بنیاد پر اپنے مشورے دیتی رہتیں۔

ان کی بھابھی معزز فاطمہ بتاتی ہیں کہ ''میری ساس (والدہ مشعل، روشن نسرین) بیماری کے باعث ہسپتال میں داخل تھیں۔ میں تیمارداری کے لیے ان کے ساتھ موجود تھی۔ بینچ پہ نقاب لگائے بیٹھی تھی کہ مشعل باجی عیادت کے لیے آئیں۔ والدہ کی عیادت کے بعد وہاں داخل سب خواتین سے ملیں۔ جن کے ہاں ولادت ہوئی تھی انہیں مبارکباد دی۔ بیمار خواتین سے تسلی تشفی کے الفاظ کہے اور مجھے نصیحت کی کہ سارا دن اس طرح نقاب لگا کر نہ بیٹھی رہو۔ چلو پھرو، سب سے ملو تاکہ عیادت کا ثواب بھی حاصل ہو اور تمہارا وقت بھی اچھا گزرے۔ گھریلو امور میں بھی مشوروں سے نوازتی رہتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ اپنی ذاتی ضروریات شوہر کے سامنے رکھو تاکہ اسے احساس رہے کہ تم اس کی ذمہ داری ہو۔ شوہر کی خدمت ضرور کرو لیکن اسے خدمت کا عادی نہ بناؤ۔ ان کی نصیحتوں میں ہمیشہ بہن کی خیرخواہی محسوس ہوتی تھی۔

بہترین مہمان نواز:

مہمان نوازی پہ بہت زور دیتی تھیں۔ بیٹی فارحہ کہتی ہیں،'' میں بیمار تھی اور امی میرے پاس آئی ہوئی تھیں۔ ایک خاتون مختصر وقت کے لیے عیادت کرنے آئیں تو امی تھوڑی دیر انتظار کے بعد ہی کچن میں جا کر ان کے لیے کچھ لے آئیں اور بعد میں مجھ سے کہا کہ کوئی تم سے ملنے آئے اور تم اس کی خاطر داری نہ کرو، یہ اچھی بات نہیں ہوتی ۔تم بیمار تھیں پھر بھی کچھ نہ کچھ پیش کرنا چاہیے تھا''۔

دوسری بیٹی عائشہ، جو امریکا میں مقیم تھیں اور وہاں تحریک کا کام بھی کر رہی تھیں، اسے مشورہ دیا کہ دوستیاں بڑھانے اور محبت پیدا کرنے کے لیے تم اجتماعِ کارکنان میں کھانے کی کوئی چیز لے جایا کرو۔ سب مل کر کھائیں تو واقعی اچھا ماحول بن جاتا ہے۔'' عائشہ کہتی ہیں کہ'' میں نے ایسا کیا تو دوسری کارکنان بھی ایسا کرنے لگیں اور اچھا ماحول بن گیا اور قریبی تعلقات قائم ہو گئے۔

امریکا میں اپنے نواسے کے ساتھ پارک جانا ہوا، تو اس کے ہاتھ میں چپس کا پیکٹ تھا، ایک امریکی بچہ اسے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے نواسے سے کہا کہ اسے بھی چپس دو۔ ایسا کرنے پر بچہ بہت خوش ہوا۔ انہوں نے بیٹی سے کہا'' انسانی فطرت دنیا بھر میں ایک ہی ہوتی ہے''۔ تھوڑی دیر بعد بچے کا باپ کچھ خرید کر لایا تو ہمارے بچوں کو بھی یہ چیزیں پیش کیں۔

تحریکی زندگی:

تحریکی ماحول میں آنکھ کھلنے اور پرورش پانے کے باعث تحریک ان کی سرشت میں موجود تھی۔ اس نصب العین کے لیے ان کے جذبات ہمیشہ جوان رہے۔ ۱۹۶۸ء میں شادی کے بعد پی آئی بی کالونی میں جماعت کے کام کی توسیع کی بنیاد انہوں نے ہی رکھی۔ پہلا حلقہ درس شروع کیا۔ تو اس کے لیے ساتھی بہنوں کے ساتھ ملاقاتیں کر کے درس کی دعوتیں دیں اور سارے انتظامات کیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خواتین کو درس دینا نہیں آتا تھا اور مردانہ نظم سے کوئی فرد آ کر درس دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ جب خواتین سیکھ گئیں تو پھر خود درس دینے لگیں۔ بہت اہتمام سے تیاری کر کے درس کے لیے نکلتیں۔ طویل عرصہ گلشن اقبال کی نظامت کی ذمہ

داری سنبھالی۔ پیدل چل کر دور دور کے علاقوں میں درس کے لیے جاتیں۔ کئی جگہ درس کے حلقے قائم کیے، قرآنی کلاسز کا آغاز کیا۔ جماعت کی دیرینہ رکن امی جی (کرم النساء) سے قرآن ترجمے سے پڑھا تھا۔ پھر قرآن کے پیغام کو اوروں تک پہنچانا ان کا فرضِ اوّلین قرار پایا۔ درس یا کلاس میں جانے کے لیے نکلتیں تو گھروں کے دروازے پہ کھڑی خواتین سے دعا سلام کرتی جاتیں اور کہتیں،'' میں درسِ قرآن میں جا رہی ہوں۔ فلاں گھر میں درس ہوگا۔ آپ بھی آیئے گا۔'' ان کا گھر دعوت کا مرکز تھا۔ گھر کے دروازے لوگوں کے لیے ہمیشہ کھلے رکھتیں۔ اوپر گھر کی تعمیر کرواتے ہوئے، لاؤنج کو خصوصیت سے بڑا رکھوایا تاکہ اجتماعات رکھنے میں آسانی ہو۔ اجتماعِ کارکنان میں ماحول کی خوشگواری کے لیے کھانے پینے کا اہتمام کیا کرتیں۔

کارکنان سے غیر رسمی انداز میں کارکردگی دریافت کر کے اس کی رپورٹ تیار کر لیا کرتیں۔ قرآن و حدیث کی تشریح کے ساتھ لٹریچر پر ڈسکشن اور اہم اقتباسات کارکنوں کو باقاعدہ یاد کرواتیں تاکہ لوگوں کے سوالات کا مدلل جواب دیا جا سکے۔ بدھ کے دن قرآن کے ہفتہ وار درس کے علاوہ تین دن مسجدِ اقصیٰ میں صبح کلاس لیا کرتیں۔ زیادہ سے زیادہ اعانت جمع کرنے کی فکر میں رہتیں۔ لوگوں سے وصول کرنے کے بعد اپنی طرف سے ملا ملا کر اضافہ کرتیں۔

تحریکی بہنوں کے ساتھ متوازن رویہ تھا۔ اگر غلطیوں پر ڈانٹ دیتی تھیں تو بعد میں پیار و محبت دے کر اس کی تلافی کی کوشش بھی کرتی تھیں۔ کام کی وسعت اور بہتری کے لیے ہمیشہ سوچتی رہتیں۔ ناظمہ حلقہ بتاتی ہیں کہ میرا گھر ان ہی کی گلی میں ہے۔ جب بھی ان کے ذہن میں کام سے متعلق کوئی تجویز آتی تو وہ بتاتیں کہ اگر ایسا کر لیا جائے تو شاید کام بہتر ہو جائے گا۔

ضلع اور کراچی کی شوریٰ میں ایک عرصے تک رکن رہیں۔ دلیل کو سننے اور غور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتیں۔ جدیدیت کے تمام تر ادراک کے ساتھ ان کا کردار قدیم روایات کی ترجمانی بھی کرتا تھا۔ احتساب کے ضمن میں ان کی گرفت مضبوط اور بے لاگ ہوتی تھی۔ شریعت سے متصادم کسی بھی بات پہ سمجھوتہ نہ کرتی تھیں۔ تربیت اور انفرادی تعلقات کی مضبوطی

کو ترجیح اوّل دیتی تھیں اور تنظیمی بوجھ کو کم سے کم کرنے کی خواہش مند رہتی تھیں۔ جس فورم پر بھی خیالات کے اظہار کا موقع ملتا دلیل اور جرأت کے ساتھ بات رکھتیں۔ شوریٰ کے اجلاس میں زیرِ بحث موضوع پر جچی تلی رائے دلائل کے ساتھ دیتیں اور مداہنت کا شکار نہ ہوتیں۔ ہمیشہ کہتیں کہ ارکان کی ذمہ داری ہے کہ جماعت کو صحیح سمت میں گامزن رکھیں اور سیدھی راہ سے نہ ہٹنے دیں۔ جو بھی کمی دیکھیں اسے نظمِ بالا تک ضرور پہنچائیں۔

درسِ قرآن کے بعد حالاتِ حاضرہ کے بارے میں ضرور بات کرتیں۔ ہر حال میں اللہ پہ توکّل کرتیں اور نصیحت کرتیں کہ مایوس نہ ہو۔ نئی نئی جگہ درسِ قرآن کے پروگرامز رکھواتیں۔ انہیں اپنے مقصد سے بہت عشق تھا۔ نہ صرف خواتین بلکہ اکثر اپنے گھر میں لڑکیوں کا پروگرام بھی رکھتی تھیں جس میں علاقے کی لڑکیاں اور ان کی بیٹیاں شامل ہوتی تھیں۔ ملاقاتیں بہت زیادہ کرتیں۔ جلد دوستیاں قائم کرلیتیں۔

۲۰۰۱ء میں پہلی مرتبہ جماعت کے ناظم اور نائب ناظم کے ساتھ یوسی ۵ گلشنِ اقبال کی کونسلر منتخب ہوئیں۔ ۲۰۰۴ء میں ایم کیو ایم کے ناظم اور نائب ناظم کے ساتھ دوبارہ منتخب ہونے پہ اس ذمہ داری کو انجام دیتی رہیں۔ اس دوران یوسی کے تمام اسکولز میں جایا کرتیں۔ اسمبلی میں درسِ قرآن دیتیں۔ ٹیچرز کے کردار کو اہم جانتیں اور انہیں اس کا احساس دلاتیں رضا کارانہ طور پر ایک اسکول میں ٹیچر کے فرائض سرانجام دیے۔ تمام علاقہ ان سے واقف تھا۔ مخالف پارٹی والے بھی ان کا احترام کرتے۔

بھرپور حکمتِ عملی:

وہ انتہائی عزت، احترام اور محبت کے ساتھ لوگوں سے معاملہ کرتی تھیں۔ ملاقاتیں کرتیں تو ہنس کر، مسکرا کر، ہاتھ پکڑ کر بات کرتیں، انسان اپنی تکلیف ہی بھول جاتا تھا۔ تحریکی ساتھیوں سے تعلق صرف جماعت کے کاموں کی حد تک نہیں بلکہ ہر قسم کے دکھ سکھ میں شریک رہا کرتی تھیں۔ کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ترجمان، بتول، خواتین میگزین، ایشیا، نور سب ان کے گھر سے ہی علاقے میں تقسیم ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ تحریکی لٹریچر کے متعلق کسی کو کتاب کی ضرورت پڑتی تو وہ ان کے پاس سے دستیاب ہوا کرتی۔ علاقے کی

وہ خواتین جو درسِ قرآن میں نہیں آتی تھیں، ان کے لیے اکثر ٹی پارٹی کا اہتمام کرکے درسِ قرآن پہ بلایا کرتیں۔

قولی اور عملی جہاد کے ساتھ انہوں نے قلمی جہاد میں بھی اپنا حصہ ڈالا، مقصد کی راہ میں اس ذریعے کو معاون پاکر قلم کو بھی استعمال کیا اور الفاظ کے تانے بانے اس طرح بنے کے پڑھنے والا کوئی نہ کوئی سبق سیکھ کر ہی اٹھتا۔ اپنی بیٹی فارحہ کو انگلش میں ڈبل ماسٹرز کرنے کی ترغیب دے کر قلمی جہاد پر ابھارا کہ انگریزی پڑھنے والے طبقے میں بھی دعوت پہنچنی ضروری ہے اور وہ اب کینیڈا میں مصروفِ عمل ہے۔

باہمت مجاہدہ:

ایک اجتماعِ کارکنان میں شرکت کے لیے گھر سے نکلیں جو تقریباً پندرہ منٹ پیدل کی مسافت پہ تھا۔ وہاں پہنچیں تو دل میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو چکا تھا۔ گھنٹی بجائی تو بجلی نہ ہونے کے باعث آواز نہ جاسکی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی کوئی نہیں نکلا جو شاید تکلیف کی وجہ سے زور سے نہ کھٹکھٹایا جاسکا تو اسی حالت میں واپسی کا سفر شروع کردیا۔ دعا کرتی جاتی تھیں کہ ''یا اللہ عزت کے ساتھ گھر پہنچا دینا۔ راستے میں گر کے جماعت کی خواتین کی بدنامی کا باعث نہ بنوں''۔ درد اتنا شدید تھا بقول ان کے ''جیسے کوئی خنجر گھونپ کر نکال رہا ہو''۔ رکشہ بھی نہ روک سکیں کہ پاؤں اوپر اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ بمشکل گھر واپس پہنچیں اور لیٹ گئیں۔ چھوٹی بیٹی نے دیکھا لیکن اسے طبیعت کا اندازہ نہ ہوسکا۔ اسی دوران نماز کا وقت ہوا تو اٹھ کے نماز پڑھی اور لیٹ گئیں۔ منجھلے بیٹے نے دیکھا کہ امی کی حالت ٹھیک نہیں تو بہت اصرار کے بعد اسپتال جانے پر تیار ہوئیں۔ معائنے کے بعد ڈاکٹرز نے بتایا کہ دیر سے لانے کے باعث ان کا دل ۷۰ فیصد متاثر ہو چکا ہے اور آپریشن ممکن نہیں۔ دواؤں سے جس حد تک ممکن ہو علاج کیا جائے گا۔ وہ اس نقصان پہ افسردہ ہونے کے بجائے اللہ سے ملنے کے لیے بالکل تیار تھیں اور بچوں سے کہتیں ''میں اللہ سے ملنے کے لیے تیار ہوں، مجھے جانے دو''۔

حلقہ خواتین کی ذمہ دار افشاں نوید بتاتی ہیں کہ جب وہ ان کی عیادت کے لیے اسپتال پہنچیں تو گرم جوشی سے استقبال کیا پھر بولیں، ''سب ساتھی اپنا کام چھوڑ کر آرہے ہیں، یہ تو

بڑا نقصان ہو رہا ہے میری وجہ سے۔ آپ سب کا وقت قیمتی ہے کسی کو آنے کا نہ کہیں، بس دعاؤں میں یاد رکھیں''۔خرم مراد صاحب کی کتاب لمحات ان کے ہاتھوں میں تھی۔ دکھاتے ہوئے بولیں ''پڑھ لی ہے آپ نے؟'' پھر کچھ نشان زدہ اوراق الٹے اور کہا:''یہ ضرور پڑھیے گا''۔ پھر کارکنان میں مطالعے کے رجحان میں کمی پر تشویش کا اظہار کرنے لگیں۔ میں نے کہا،''زیادہ مطالعہ اور گفتگو نہ کیجئے، طبیعت سنبھل جانے دیں''۔ تو بولیں،''مطالعے سے تو مجھے زیادہ قوت ملتی ہے''۔

''اللہ کو ابھی ان سے مزید کام لینا تھا لہٰذا وہ ہسپتال سے واپس آ کر پھر آہستہ آہستہ اپنے مشن میں لگ گئیں۔خود کہتیں کہ یہ تو مجھے بونس میں زندگی ملی ہے، اسی لیے میں جتنا کام کر لوں کم ہے۔ جب ڈاکٹر نے چہل قدمی کی ہدایت کی تو فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد قریبی موجود پارک میں جانے لگیں اور وہاں موجود خواتین سے دوستیاں کیں۔ ان کی سرگرمیوں میں شرکت کی، ان سے محبت کے رشتے استوار کیے۔ اپنی بیٹیوں سے کہتی تھیں،''ان کا مزاج میرے مزاج سے بالکل الگ ہے۔لیکن ہم تو داعی ہیں، عام لوگوں کو بھی دعوت دینی ہے''۔ اس سوچ کے تحت باقاعدگی سے پارک جاتی رہیں اور ایک عرصہ ان خواتین کے ساتھ گزارنے کے بعد بتدریج اجتماعی مطالعے کا آغاز کیا۔روز گھر سے منتخب مواد لے جاتیں۔اور واک کے بعد بیٹھ کے انہیں سنایا کرتیں۔ عام لوگوں سے گھلنے ملنے پر بہت زور دیتی تھیں۔ بیٹیوں سے کہتیں،''آج کے دور میں ہر شخص پریشان ہے لیکن ان کے غم سننے والا کوئی نہیں۔ لوگوں کے پاس جایا کرو ان کے غم سنا کرو''۔ پارک کی خواتین کے ساتھ بیٹھ کر ان کے مسائل سنتیں اور استغفار کی تسبیح پڑھتی جاتیں۔ بھرپور حکمت کے ساتھ انہیں رب سے جوڑنے کی کوشش کرتی رہیں۔

سفرِ آخرت

دل کی بیماری کے بعد انہوں نے اللہ سے سیروا فی الارض کی دعا کی اور اللہ نے سن لی۔ وہ دبئی، سعودیہ اور امریکا میں مقیم اپنی بیٹیوں کے پاس گئیں تو وہاں بھی متحرک زندگی گزاری۔ جو اللہ کے کام میں لگ جاتا ہے اللہ اس کے کام میں لگ جاتا ہے۔ مشعل پروین جب اللہ کے کام

میں لگ گئیں تو اللہ ان کی ہر ضرورت کے لیے کافی ہو گیا۔ان کے بچے ان کا مشن بڑھانے کے لیے تیار ہو گئے تو اللہ نے ان کی عزت کے ساتھ جینے اور عزت کے ساتھ مرنے کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔ اور ۱۶ جون ۲۰۱۲ء کو نیند کی حالت میں ہی اپنے پاس بلا لیا۔ پارک میں خواتین ان کا انتظار کرتی رہ گئیں اور روحِ خاکی جسم کی قید سے آزاد ہو گئی۔ طویل عرصے تک اللہ کی طرف بلانے والی داعیہ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور ان کے حق میں اپنی گواہی ثبت کرانے کے لیے ہر ایک دوڑا چلا آیا۔ یہاں تک کہ گھر کے دونوں دروازے کھول دیے گئے۔خواتین ایک دروازے سے داخل ہوتیں اور دوسرے دروازے سے نکل جاتیں۔ ان کی اولاد صبر کا پیکر بنی، غمزدہ خواتین کو تسلی و دلاسہ دیتی نظر آتی۔ ایک مشعل بہت سی مشعلیں روشن کر گئی ہے۔ ان شاء اللہ اب اجالا ضرور ہوگا۔

ماخذات

۱۔ عائشہ صدف صاحبہ (صاحبزادی)
۲۔ فارحہ شبنم صاحبہ (صاحبزادی)
۳۔ غزالہ عزیز صاحبہ (بہن)
۴۔ اسماء شاہین صاحبہ (بہن)
۵۔ معزز فاطمہ صاحبہ (بھابی)
۶۔ صفیرا کاشف صاحبہ (بہو)
۷۔ سیرین صالحہ صاحبہ (ناظمہ حلقہ)
۸۔ خواتین میگزین اور جسارت (۲۸ اور ۲۶ جولائی ۲۰۱۲)

ڈاکٹر عذرا بتول

۱۹۵۹ء تا ۲۰۰۳ء

4

خود اپنے گھر میں چند قریبی طالبات اور خواتین کے لیے ترجمہ قرآن کی کلاس شروع کر رکھی تھی جو صبح اسپتال جانے سے پہلے لیا کرتیں اور خواہ رات بھر اسپتال سے جاگ کر آئی ہوتیں لیکن اس کلاس کی وجہ سے صبح نہ سوتیں۔ طالبات نے بتایا کہ ہم نے ان سے ایک سال میں سولہ سپارے پڑھے ہیں۔ رات بھر جاگ کر مریضاؤں کا خیال کرتیں اور صبح اسپتال میں بیٹھ کر اپنی تنظیمی رپورٹ تیار کر رہی ہوتیں۔ ان کی نائب بتاتی ہیں کہ جب نظم بالا سے دورہ پر افراد آئے ہوئے ہوتے تو ان کے سامنے انتہائی عاجزی کے ساتھ اپنی رپورٹ دیتیں۔ ذمہ داری کی بابت اللہ کے حضور جوابدہی کے احساس سے بہت ڈرتیں۔

4

ضلع جہلم کے ایک اسکول کے استاد کے گھر چوتھی بار خوشی آنے کا مرحلہ تھا۔ اس سے قبل گھر کے آنگن میں تین بیٹیاں ام کلثوم، سعیدہ جبین اور بشریٰ سعادت کے نام سے خوشبو پھیلا رہی تھیں۔ خاتونِ خانہ سے ملنے والی ہر عورت اس باران کے لیے بیٹے کی دعا دیتی لیکن وہ نہایت کریم النفس، شفیق وحلیم خاتونِ خانہ دل ہی دل میں اپنے رب سے یوں دعا گو تھیں کہ ''اے میرے رب! مجھے اس دفعہ بیٹا نہ دینا بیٹی ہی دینا ورنہ لوگوں میں یہ شرکیہ سوچ جڑ پکڑ جائے گی کہ بیٹی کا نام بشریٰ رکھنے سے اگلی مرتبہ بیٹا پیدا ہوتا ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس بندی کی دعا قبول کی اور اس گھرانے کو ایک اور بیٹی عطا کی۔

ابتدائی زندگی:

والدین نے بیٹی کا نام عذرا بتول رکھا۔ اسمِ بامسمّیٰ ثابت ہوئی۔ اِس کے آباؤ اجداد سیّد احمد شہید کی تحریک جہاد میں ساتھ دینے والوں میں شامل تھے۔ دین سے محبت اور جذبہ جہاد کو زندگی کا نصب العین بنا لینے کی یہ صفت نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے اس گھرانے میں موجود نظر آتی ہے۔ عذرا کی پیدائش کے چند ماہ بعد یہ گھرانہ لاہور منتقل ہو گیا۔

حصولِ علم کی مشکلات:

والدہ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی دی۔ اللہ تعالیٰ نے ذہانت وفطانت عذرا کو تحفے میں عطا کی تھی۔ نو سال کی عمر میں جب اسکول میں چھٹی کلاس میں داخلہ لینے پہنچیں تو پرنسپل کو یقین نہ آیا کہ اتنی چھوٹی بچّی چھٹی کلاس میں پڑھ سکتی ہے لیکن ٹیسٹ کامیابی سے پاس کرنے کے بعد اسے گورنمنٹ پائلٹ ہائی اسکول میں داخلہ مل گیا جہاں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے انٹر میں کامیاب ہونے پر راولپنڈی میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ ڈاکٹر عذرا تعلیمی فتوحات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی جمعیت طالبات سے منسلک ہو کر طالبات میں دعوت الی اللہ پہنچانے کا فرض بھی انجام دے رہی تھیں۔ گھر لاہور میں اور کالج پنڈی میں جہاں لڑکیوں کے لیے ہاسٹل کی سہولت بھی موجود نہ تھی باعثِ پریشانی امر تھا۔

ابتدائی چند ماہ سابق امیر جماعت اسلامی پنجاب مولانا فتح محمد صاحب کے ہاں قیام رہا جن کی بیٹی ان کے ساتھ زیرِ تعلیم تھی اور جنہیں بعد میں ڈاکٹر عذرا نے ہمیشہ اپنے روحانی باپ کا درجہ دیا۔ پھر یہ طے پایا کہ وہ روز کالج سے اپنے ماموں کے ہاں حسن ابدال چلی جایا کریں گی جو کالج سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میڈیکل کالج کی پُر مشقّت تعلیم کے ساتھ روز کے سفر کی یہ طوالت دراصل ڈاکٹر عذرا کو زندگی میں آنے والی آئندہ مشقتوں کے لیے تیار کر رہی تھی۔ بَلا کی صابر عذرا نے کبھی اس مشقّت پر شکوہ کیا نہ تھکن کا اظہار، بلکہ گھر پہنچنے کے بعد اپنی ممانی کے گھریلو کاموں میں جتنی ممکن ہوئی مدد کرانے کی کوشش ہی جاری رکھی۔ تین سالہ یہ سفر جاری رہا یہاں تک کہ ان کا تبادلہ فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور ہو گیا اور یہ مشقت ختم ہوئی۔ اس دوران جمعیت طالبات صوبہ پنجاب کی نظامت دے دی گئی تھی۔ اس وقت کی ساتھی ڈاکٹر گواہی دیتی ہیں کہ وہ دن کو سرگرم عمل رہتیں اور رات کو بھی تازہ دم۔ سادہ غذا، کم کھانا، اور رات کو کم سونا ان کا معمول تھا۔

عزم وہمت کی داستان:

بھرپور مشقّت کی زندگی اور جمعیت سے تعلق نے جسمانی وروحانی طور پر تازہ دم اور جواں ہمت رکھا۔ تعلیمی مصروفیات اسے کسی ذمہ داری کی ادائیگی سے باز نہ رکھ سکتیں تھیں۔ وہ کام کی زیادتی کا شکوہ کبھی زبان پر نہ لائی۔ وہ بندگی کا معیار بلند کرنے والی عزیمت کی راہی تھی جس نے ہر طرح کے چیلنجز خندہ پیشانی سے قبول کیے اور اس دوران تسلیم ورضا کی کیفیات کا اظہار کیا۔ بڑی بہن میڈیکل کی سخت پڑھائی کے دوران اسے حوصلہ دینے ہاسٹل پہنچیں تو کمرے میں اس کی پڑھنے کی میز کے سامنے دیوار پر خوبصورت سی دعا چسپاں تھی۔

الھم زدنا و لا تنقصنا. اے اللہ ہمیں زیادہ بنا دے اور نقصان نہ پہنچانا
وا کر منا و لا تھنا. اور ہمیں اکرام وعزت دینا، ذلیل نہ کرنا
و اعطنا و لا تحر منا. اور ہمیں عطا کرنا محروم نہ کرنا
وآثر نا و لا تو ثر علینا. اور ہمیں پسند کرنا دوسروں سے زیادہ

وارضنا وارض عنا. اورہمیں خود سے راضی رکھنا اور خود ہم سے راضی رہنا۔

بہن جو حوصلہ دینے گئی تھیں خود حوصلہ پا کر واپس پلٹیں۔ رب سے قریبی تعلق رکھنے والی ڈاکٹر عذرا کو کبھی روتا پایا تو اس کا سبب فجر کی نماز کا قضا ہو جانا پایا۔ ورنہ دنیا کے کسی غم نے اس کی آنکھوں میں آنسو نہ بھرے۔ اس وقت بھی جب اس سے تین سال چھوٹا بھائی ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو کر اس کے سامنے اسپتال آیا تو بھائی کے سرہانے کھڑے ہو کر اس نے بس اتنا کہا کہ ''مر گئے تو شہید۔ زندہ رہے تو غازی''۔ اس بات نے جہاں بھائی کے دل میں عزم و حوصلہ پیدا کیا وہاں ڈاکٹر عذرا کی اللہ کی مرضی میں اپنی مرضی گم کر دینے کی صفت بھی آشکار ہوئی۔ میڈیکل کی تعلیم مکمل ہوئی تو ۱۹۸۲ء میں ایک ایسے ڈاکٹر کے تحت سرجری میں ہاؤس جاب کی جو برقعہ پہننے والی ڈاکٹرز کے سخت خلاف تھے۔ لیکن نہ ان کا رعب عذرا کے پردے میں کوئی کمی لا سکا اور نہ وہ اپنی سخت مزاجی کے باوجود اس کی کارکردگی میں کوئی نقص تلاش کر سکے۔ ۱۹۸۳ء میں ہاؤس جاب مکمل کر کے وہ افغان سرجیکل ہسپتال برائے افغان مہاجر خواتین پشاور خدمات انجام دینے چلی گئیں۔ وہاں ایک مہینہ سروس کرنے کے بعد جب لاہور گھر والوں سے ملنے آئیں تو واپسی کے وقت والد سے اپنے اخراجات کے لیے پیسے مانگے۔ والد نے ان کی تنخواہ کے متعلق دریافت کیا تو کہا کہ ''وہ تو میں نے وہیں کسی ضرورت مند کو دے دی تھی''۔ سخاوت کی یہ روش ان کی پوری زندگی کی نمایاں صفت تھی۔

توکّل الی اللہ:

فروری ۱۹۸۵ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کا امتحان دوسری پوزیشن کے ساتھ پاس کیا اور جہلم کا ڈومیسائل ہونے کی بدولت پوسٹنگ راولپنڈی جنرل اسپتال میں ہوگئی۔ اسی سال شادی ہوئی۔ درویش صفت والد نے محض تحریک سے تعلق رکھنے پر اور اس بات کے اطمینان کے بعد کہ لڑکا پانچ وقت نماز پڑھتا ہے، اپنی بیٹی کے رشتے کی منظوری دے دی۔ جب لڑکے کے بھائی رشتہ لے کر آئے تو والد کے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ روز دو ڈھائی سو روپے کما لیتا ہے تو والد نے کہا ''ہماری بیٹی میں ذرا نخرہ نہیں ہے، وہ گزارہ کر لے گی۔ لڑکا نماز پڑھتا ہے، یہ

ہی کافی ہے۔ باقی جو ہماری بیٹی کی قسمت میں ہوگا اسے ملے گا''۔ یوں انتہائی سادگی کے ساتھ ۳۱/اکتوبر ۱۹۸۵ء کو لاہور میں پلنے بڑھنے والی، ذہین و فطین، پنجاب پبلک سروس کمیشن کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کرنے والی ڈاکٹر عذرا کی شادی اوکاڑہ کے ایک دور دراز دیہات دیپالپور جی۔ ڈی/۱۸ کے ڈاکٹر لیاقت علی کوثر سے ہوگئی۔ جب رخصتی کے وقت ایک رشتہ دار خاتون نے دلہن کے ساتھ جانا چاہا تو والدہ محترمہ نے کہا ''ہم شادی کرتے وقت بیٹیوں کو اللہ کے سپرد کر دیا کرتے ہیں''۔

والدین نے بیٹی، معاشرت اور ماحول کے بے انتہا فرق کے باوجود محض دین و تحریک کی بنیاد اور اللہ کے بھروسے پر دولہا کے حوالے کر دی۔ بیٹی نے بھی اللہ کی مرضی کہہ کر اس فیصلے پر سر جھکا دیا اور دل کی رضامندی کے ساتھ قبول کر لیا تو اللہ نے بھی اس بندی کی ایسی شان بڑھائی کہ بعد میں خود والد محترم فرماتے تھے کہ ''میں نے اپنی بیٹی کو کھوہ (کنویں) میں پھینک دیا تھا لیکن اللہ نے اسے سب سے زیادہ شان عطا کی''۔

خاندان سے حسن سلوک:

لاہور شہر سے بارات واپس گاؤں میں پہنچی جہاں کچی سڑکیں، دھول اور دیہاتی معاشرت کا سامنا تھا۔ شہر کی آسائشات پیچھے رہ گئی تھیں۔ لمبے سفر سے نڈھال شوہر جب دلہن سے ملاقات کے لیے کمرے میں داخل ہوئے تو غیر متوقع طور پر سلام دعا کے بعد دلہن کی جانب سے اس سوال کا سامنا کرنا پڑا کہ ''کیا آپ نے شکرانے کے نوافل پڑھ لیے ہیں؟'' اور نفی میں جواب سن کر دلہن نے نئی زندگی کو برکت کے ساتھ گزارنے کے لیے نماز پڑھنے پر ابھارا۔ شوہر محترم نے دلہن کو بتایا کہ بچپن میں ہی والدین سے محروم ہو جانے کے بعد بڑے دونوں بھائیوں نے چھوٹے دونوں بھائیوں کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پڑھایا لکھایا اور خود بھوکے رہ کر انھیں کھلایا ہے۔ اب وہ باقی زندگی ان دونوں بھائیوں کے ایثار و قربانی کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ شوہر کی اس ابتدائی بات کو ڈاکٹر عذرا نے اس طرح دل و دماغ میں جگہ دی کہ خود لیاقت صاحب نے گواہی دی کہ مجھ سے بڑھ کر عذرا میرے اہل خاندان کے ساتھ حسن سلوک کرنے

والی بن گئی۔ جیٹھ شہر سے بھائی کی دلہن لاتے ہوئے اس بات سے خائف تھے کہ اب شاید ہمارا بھائی بھی شہر چلا جائے گا یا بیوی کے آنے کے بعد ہم اس کے لیے پرائے بن جائیں گے، لیکن چند ہفتوں میں ہی عذرا کے حسن سلوک نے ان کے تمام خدشات دور کر دیے۔ انہوں نے شوہر کے بڑے بھائیوں کو باپ کا سا احترام دیا۔ بڑے جیٹھ بتاتے ہیں کہ ''اس نے کبھی ہمارے گاؤں کی معاشرت پر نہ تو تنقید کی اور نہ ہی کسی ناگواری کا اظہار کیا بلکہ آتے ہی سارے خاندان کے ساتھ اس طرح رچ بس گئی کہ چند دن بعد یہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ وہ عذرا ہے جسے ہم لاہور سے بیاہ کر لائے تھے۔ ہم سب بھائیوں کا اپنے بھائی سے زیادہ عذرا سے صلاح مشورہ ہوتا تھا۔ اس نے مجھے اور میری بیوی کو ۱۹۸۹ء میں حج کرنے کے لیے بھیجا جب کہ ابھی یہ دونوں میاں بیوی ایک کرائے کے چھوٹے سے گھر اور کلینک میں پریکٹس کر رہے تھے۔ اٹھارہ سال اس نے ہمارے گھر کی ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ جب اوکاڑہ میں ہسپتال اور گھر کی تعمیر کا مرحلہ آیا تو سارا حساب کتاب میرے ہاتھ میں تھا۔ میں سادہ چیک اس سے سائن کرواتا تھا اس نے کبھی نہیں پوچھا کہ بھائی جان اس کا کیا کرنا ہے؟ بلکہ گھر میں شفٹ ہونے کے بعد سب کو خوش خوش بتاتی تھی کہ ہمیں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑا۔ بھائی جان نے ہی گھر بنوایا اور ہمیں یہاں شفٹ کر دیا۔ جب میں دس بارہ دن بعد ان کے گھر کا چکّر لگاتا تھا تو زبردستی میرے جوتے اتروا کر ان پر پالش تک کیا کرتی تھی۔ میری خاطر مدارت، میری خدمت میں لگی رہتی۔ گھر میں گوشت آئے، پھل یا مٹھائی، اس نے ضرور سارے بھائیوں کے گھروں کا حصہ بنا کر بھجوانا ہوتا تھا۔ لاکھوں روپے بغیر کسی سے ذکر کیے خاندان پر خرچ کر دیتی تھی۔ اپنے گھر کے لیے جو سامان خریدتی بالکل وہی سامان دیگر بھائیوں کے لیے بھی خریدتی اور انھیں بھجواتی۔ اوکاڑہ میں گیس لگ گئی تو فوراً ہی گیس کا سلنڈر اور چولہا دوسرے بھائیوں کو بھی بھجوایا''۔

دوسرے جیٹھ بتاتے ہیں کہ ''۱۹۹۷ء میں میرے بازو میں حادثاتی طور پر گولی لگ گئی تو ایک ماہ اس نے میری جس طرح خدمت کی، میں بھلا نہیں سکتا۔ اسے ہم سب کے گھروں کی ضروریات کی اس طرح فکر رہا کرتی تھی جیسے خاندان کے سربراہ کو ہوتی ہے۔ اور ہمیں کوئی شک نہیں کہ وہ خاندان میں بہت چھوٹی ہونے کے باوجود اپنے بے پناہ جذبہ ایثار و قربانی سے اس

خاندان کے سربراہ کا رتبہ حاصل کر چکی تھی۔ دیپالپور فارم پر آنا اسے بہت پسند تھا۔ یہاں آ کر فصلیں دیکھ کہ بہت خوش ہوتی اور آیت الکرسی پڑھ کر دم کرتی اور فصلوں کا عشر نکال کر غریبوں کو دینے کی ہدایت کرتی۔ ہم سے کہتی کہ جو عشر ختم نہ ہو، اوکاڑہ بھیج دیں، میں تقسیم کر دوں گی۔ ہم نے دو ایکڑ گنّے کا گڑ بنا کر اسے بھیجا، اس نے وہ سب تحفے میں بانٹ کر ختم کر دیا''۔

چھوٹے جیٹھ بتاتے ہیں کہ ہسپتال کے حسابات کے لیے میں روز شام گھر اور ہسپتال آتا تھا۔ اس پورے عرصے میں اس کی پریکٹس کے سارے حسابات اور پیسے میرے پاس رہے، کبھی ان کے متعلق نہیں پوچھا۔ ویک اینڈ پر میرے اور مرحوم بھائی کے بچوں کو بلا کر گھر پر دعوت کا اہتمام کرتیں اور ہمیں یکجا دیکھ کر خوش ہوتیں۔ ۱۹۹۶ء میں جب انڈیا کے صدر واجپائی کی آمد پر جماعت اسلامی کے احتجاج کی بنا پر مظاہرین کو جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا تو ہمارے بھائی لیاقت بھی جیل میں تھے۔ اس زمانے میں حج درخواستیں جمع کرانے کا وقت آ گیا۔ میری بیوی کی خواہش تھی کہ ہم درخواست جمع کرا دیں۔ اس کو پتا چلا تو فوراً پیسے دے دیے کہ ''یہ لیں اور درخواست جمع کرا دیں''۔ ہم نے کہا کہ 'پہلے لیاقت سے تو پوچھ لو'۔ تو اس نے کہا 'انھوں نے کیا کہنا ہے۔ آپ پیسے لیں اور درخواست جمع کرا دیں''۔

بالعموم عورتیں ساس سسر کے نہ ہونے سے خوش ہوتی ہیں مگر اللہ کے خاص بندوں کا طرزِ عمل مختلف ہوا کرتا ہے۔ عذرا نے اپنے شوہر سے یہ انوکھی بات کہی تھی کہ ''میرے ساس سسر تو ہیں نہیں۔ میں ان کی خدمت سے محروم رہ گئی ہوں۔ میں آپ کے چچا اور چچی کو ساس سسر بنا لیتی ہوں''۔ شوہر کے دو چچا اور چچیوں کو ساس سسر والی عزت و احترام دیا۔ گرمیوں، سردیوں عیدین پر ہمیشہ کپڑے بھجوائے اور گھر آنے پر ان کی اہتمام سے خدمت کی۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کی طرف سے ہر سال کپڑے غریبوں میں تقسیم کیے۔

ایک جیٹھ کی تین بچّیوں اور ایک جیٹھ کی دو بچّیوں کو اپنے گھر میں رکھا اگرچہ خود کے نو بچّے تھے۔ انھیں لکھایا پڑھایا اور ان میں اور اپنے بچوں میں کوئی تفریق نہ رکھی۔ ماں جیسی شفقت کے ساتھ انھیں رکھا اور تربیت کی فکر کرتی رہیں۔ جب شوہر نے ایک مرتبہ کہا کہ ''بچے سرکاری اسکول میں پڑھتے ہیں بڑے ہو کر ہم سے شکایت کریں گے، انھیں کسی اچھے اسکول میں شفٹ

کروادیتے ہیں'' تو جواب میں کہا کہ ''یا تو اپنے سب بھائیوں کے بچّوں کو بھی پرائیوٹ اسکول میں پڑھوائیں یا پھر اپنے بچّوں کو بھی یہیں پڑھنے دیں۔ جو اِن کی قسمت میں ہوگا وہ بن جائیں گے لیکن میں بھائیوں کے دل میں ''کلاس'' کا فرق نہیں پیدا کرنا چاہتی''۔ ڈاکٹر عذرا کو اس بات کی خوشی تھی کہ لوگ صرف اپنا معیارِ زندگی بلند کرتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے پورے خاندان کی ترقی کے لیے کام کیا ہے۔ ہسپتال ترقی کرنے لگا تو اس کی آمدنی سے زمینیں خریدی گئیں۔ ہر بار کسی ایک بھائی کے نام سے زمین خریدی جاتی، آخری مرتبہ شوہر نے بڑے بھائی سے کہا کہ اب زمین خریدیں تو عذرا کے نام پر خرید لیجیے گا تو اس پر بھی ناراض ہوئیں کہ ''آپ نے ایسا کیوں کہا؟ بھائی جان کیا سوچتے ہوں گے؟'' سب جیٹھ جٹھانیوں کو حج پر بھیجا، ساس سسر کی طرف سے حج بدل کروایا۔ چچا کے حج میں حصہ ڈالا۔ ان کی جٹھانی کہتی ہیں کہ ''میری کوئی جٹھانی یا دیورانی میرے گھر گاؤں میں اتنی دفعہ نہیں آتی جتنی عذرا آتی تھی۔ جمعہ کو ہسپتال کی چھٹی ہوتی تھی تو وہ ہمارے گھر آجاتی اور آتے وقت اپنے گھر کے لیے لی گئی جیسی ہر چیز ہمارے لیے بھی لاتی۔ کوئی اچھا سالن بھی پکا ہوتا تو وہ بھی لنچ باکس میں ڈال کر ہمارے لیے لے آتی۔ میں کبھی بیمار ہوتی تو میرے شوہر کرایہ دے کر ویگن میں بٹھا دیتے اور میں جس حال میں بھی عذرا تک پہنچتی صرف وہی مجھے سنبھالتی اور ساتھ ساتھ تسلی بھی دیتی جاتی۔ آخری بار آئی تو ہمارے گھر کے لیے پردے لے کر آئی کہ اب آپ جلدی جلدی انہیں لٹکا دیں۔ میں تو ہر وقت اس بات پر خوش ہوتی تھی کہ میری بچّیاں اس کے زیرِ سایہ پروان چڑھ رہی ہیں''۔

ان کے پاس رہنے والی جیٹھ کی بچّی نے بتایا کہ انھوں نے نہ صرف ہمیں اپنے گھر میں رکھا بلکہ ہماری پڑھائی، کپڑوں، دوائی اور ہر طرح کے اخراجات وہ خود اٹھاتیں۔ اپنی قیمتی سے قیمتی اشیا ہمارے پاس رکھوا دیتیں۔ ذمہ داری پیدا کرنے کے لیے ہمیں رقم دے کر گھر کی ضروری اشیا لانے بھیجتیں اور اخراجات کا کبھی حساب نہ لیتیں۔ ملازمہ کو ہدایت دیتیں کہ ''باجیوں سے پوچھو کیا پکانا ہے۔ جو اُن کا دل چاہے وہ بنالو''۔ میں دیر سے اٹھتی تو ملازمہ سے کہتیں۔ ''اسے تازہ ناشتہ بنا کر دو اور خود میرے سامنے رات کی بچی ہوئی روٹی دودھ یا اچار کے ساتھ کھا کر ہسپتال چلی جاتیں۔ میں بیمار ہو جاتی تو ہر طرح سے خیال رکھتیں۔ کھانا، دوائی، پھل میرے

پاس خود ہی لے کر آتیں لیکن اپنی خدمت کبھی کسی سے نہ لیتیں۔ ایک دن طبیعت خراب تھی تو گولی لے کر، نل کے پاس گئیں اور گولی کھا کر دو گھونٹ پانی نل سے ہی پی لیا اور آ کر لیٹ گئیں۔ میں سامنے کھڑی تھی لیکن مجھ سے پانی لانے کو نہیں کہا۔ عید پر پورے خاندان کے لیے کپڑے خود خرید کر لاتیں اور ان کی سلائی تک خود دیتیں اور پھر سب کو تحفے بھجواتیں۔ ایک دفعہ کچن میں کام کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ''ہمارا جو سر تو لوگوں نے مانگ مانگ کر توڑ ہی دیا ہے''۔ تو ناراض ہوئیں اور کہا ''مشینری کا کیا ہے وہ تو خراب ہو ہی جاتی ہے، اصل چیز تعلقات ہیں، وہ خراب نہیں ہونے چاہئیں''۔ سسرالی رشتہ داروں کی بچّیاں امتحان دینے شہر آتیں تو ان کی بڑی خاطریں کرتیں۔ ڈرائیور کو سختی سے ہدایت کرتیں کہ انھیں وقت پر امتحانی سینٹر لے جائے اور واپس لائے اور ان کی گھروں کو واپسی کے وقت سوٹ بھی تحفے میں دیتیں۔ ہمارے پاس ہونے پر ہم سے بڑھ کر خوش ہوتیں۔ میں نے ایم اے کا امتحان پاس کیا تو خود مٹھائی منگوا کر پورے خاندان میں بانٹی۔

جیٹھ کے بیٹے عدنان نے بتایا کہ ''مجھے چھٹی کلاس سے ان کے ہاں رہنے کا موقع ملا، مجھ سے بالکل اپنے بچوں کی طرح پیار کرتی تھیں، کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی، وہ تلاوت قرآن اور دینی کتب کے مطالعہ کی تاکید کرتی تھیں اور پانچ وقت کی نمازوں کی ادائیگی پر بہت زور دیتی تھیں۔ فرسٹ ایئر میں میرے نمبر کم آئے تو انھوں نے ڈانٹنے کے بجائے میرا اتنا حوصلہ بڑھایا کہ دوسرے سال میں نے اپنے نمبروں میں سو سے بھی زیادہ نمبروں کا اضافہ کیا۔ خاندان کے ہر بچّے کی حوصلہ افزائی کرتیں۔ ہر بچّے کو اگلی کلاس میں جانے پر اسے تحفہ ضرور دیتیں تاکہ اس کے جذبے میں اضافہ ہو۔ میرے چچا کے بیٹے نے آٹھویں کلاس میں تحصیل دیپالپور میں ٹاپ کیا تو چچی جان نے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے دیپالپور میں دعوت کا اہتمام کیا جس میں خاندان کے ہر فرد نے شرکت کی۔ کھانے کی سب چیزیں اور تحائف وہ اوکاڑہ سے لے کر وہاں گئیں تاکہ اس کے جذبے اور ہمت میں اضافہ ہو۔

وفا شعار وصالح بیوی:

جہاں عذرا کے سسرال والے اپنے رہن سہن اور دیہاتی معاشرت کی وجہ سے ایک احساسِ کمتری دل میں رکھتے تھے، وہیں ان کے شوہر بھی اپنے مقابل ان کی علمی قابلیت اور تحریکی تجربے کی برتری کے قائل تھے۔لیکن انہیں بھی اس وقت انتہائی مسرّت کا احساس ہوا، جب عذرا نے خود ہی ان سے کہہ دیا ''میرے رب نے آپ کو میرا قوّام بنایا ہے۔آپ میرے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے،ان شاءاللہ مجھے اس کی پابندی کرنے والا پائیں گے''۔اگر کبھی شوہر کی طرف سے کوئی بات ناگوار بھی گزری تو چہرے سے تو اس کا اثر نظر آیا لیکن زبان پر شکوہ نہ آیا۔شادی کے تین چار دن بعد ہی شوہر صاحب نے آزمانے کے لیے انھیں کہہ دیا کہ ''تمہارے پاس سونے کی چوڑیوں کے دو سیٹ ہیں۔ایک میری بھابھی کو دے دو''۔تو فوراً ہی چار چوڑیاں اتار کر جٹھانی کو دے دیں اور کہا ''یہ بڑا اچھا ہو گیا اب مجھے ان کا حساب نہیں دینا پڑے گا''۔پھر ۱۹۹۶ء میں جب حج پر جانے کی سعادت ملی تو وہاں سے دوسری جٹھانی کے لیے چوڑیاں لے کر آئیں۔ ہر صبح اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود شوہر کے کپڑے تیار کرتیں، جوتے پالش کرتیں۔ ۱۹۸۶ء میں جب میاں بیوی ایک چھوٹے سے کلینک میں پریکٹس کرتے تھے تو شوہر نے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''شاید ہم ساری زندگی کرائے کی جگہیں بدلتے رہیں گے''۔اس پر ڈاکٹر عذرا نے کہا کہ ''مجھے یقین ہے اگر ہم اسی خلوص اور نیک نیتی سے مریضوں کی خدمت کرتے رہے تو اوکاڑہ میں سب سے بڑا ہسپتال ہمارا ہی ہو گا''۔اللہ نے اپنی اس بندی کی بات کو سچ کر دکھایا اور ۱۹۹۶ء میں وہ اپنے گھر اور ملحقہ ہسپتال واقع اوکاڑہ منتقل ہو گئیں۔

بہترین مسیحا:

ڈاکٹر عذرا ڈاکٹری کو پیشہ نہیں عبادت سمجھتی تھیں۔اکثر کہا کرتیں کہ میرا بس چلے تو میں سارے مریضوں کا مفت علاج کروں۔ان کے لیے سب سے مقدم اور اہم مریض وہ ہوتا جو سب سے زیادہ نادار اور بے نوا ہوتا۔ان کی پوری کوشش ہوتی کہ مریض کے اخراجات کم سے کم

ہوں۔آپریشن کا فیصلہ بالکل آخر میں کرتیں جس کی وجہ سے اسٹاف کو بعض دفعہ مشکل بھی ہوتی لیکن وہ کہتیں ''مجھے تو خدا کو جواب دینا ہے لہٰذا میں تو نارمل ڈلیوری کرانے کی اپنی آخری کوشش کروں گی''۔اس وجہ سے اوکاڑہ میں مشہور تھا کہ اگر کسی خاتون کو ڈاکٹر نے آپریشن کا مشورہ دیا ہے تو وہ ایک دفعہ ڈاکٹر عذرا بتول سے ضرور مشورہ کر لے۔وہ کبھی غلط مشورہ نہیں دیتیں۔عید کی رات بھی کوئی مریضہ آ گئی تو آپریشن کے متعلق سوچنے کے بجائے عید کا سارا دن مریضہ کے ساتھ بغیر کچھ کھائے پیئے گزار دیا اور نارمل ڈلیوری کرائی۔بعض اوقات خود ہی رات بھر جاگ کر اپنے فرائض انجام دیتیں جب بل لینے کا وقت آتا تو شوہر سے پیسے کم کرانے کے لیے مستحق مریضوں کی سفارش کرتیں۔کبھی کہتیں۔''یہ خاتون تو درس میں آتی ہیں ان کے ساتھ رعایت کریں''۔کبھی کہتیں۔''اس خاتون کی تیسری بیٹی ہوئی ہے۔اس کا خرچہ تو میکے والے دیں گے۔ان کے ساتھ نرمی کر دیں''۔ایک مرتبہ ایک مریضہ کا بل دس ہزار روپے بنا۔اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے۔اس کی جانب سے رعایت کی درخواست کے ساتھ بل لیاقت صاحب کے پاس بھیجا۔انہوں نے کم کر کے آٹھ ہزار کر دیا۔پھر دوبارہ بھیجا تو انھوں نے مزید کمی نہیں کی۔اس پر مریضہ کے دیے ہوئے پیسوں میں اپنے پرس میں سے نکال کر باقی رقم شامل کی اور بل ادا کروا دیا۔کتنے ہی لوگ ایسے آتے تھے جن کے پاس دواؤں کے پیسے نہیں ہوتے تھے تو ڈاکٹر عذرا کے کہنے پر میڈیکل اسٹور کا عملہ دوائیاں ڈاکٹر عذرا کے نام لکھ کر انھیں دوا دے دیتا تھا۔ایک رکشہ والے کو جب ان کی غریب پروری کا علم ہوا تو اس نے اپنی بیوی کو ہسپتال میں بھیج کر انہیں فون کیا اور کہا کہ ''ڈاکٹر صاحب میری بیوی آپ کے پاس ہے اور میں آپ کو سوائے دعاؤں کے کچھ نہیں دے سکتا''۔انہوں نے کہا کہ ''مجھے بھی صرف دعاؤں ہی کی ضرورت ہے''۔اس مریضہ کو ڈلیوری کروا کے اپنے پاس سے دوائیں اور کچھ پیسے دے کر رخصت کیا۔کہتی تھیں کہ ''میں تو مریضوں کے ساتھ اس لیے نرمی کرتی ہوں کہ اللہ میرے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے''۔غریبوں اور خاص طور پر اوپر تلے بیٹیوں والوں سے فیس نہ لیتیں۔خود اپنے گھر سے کبھی مریضوں کے لیے یخنی تو کبھی انڈے بھجواتیں۔ان کی والدہ نے ایک بار دریافت کیا کہ ''کیا مریض اس کی بھی ادائیگی کرتے ہیں؟'' تو کہا کہ ''کیا ہمیں مریضوں کی

عیادت کا حکم نہیں ہے؟''

ہر مریض کو یہ محسوس ہوتا کہ جیسے وہ سب سے زیادہ اسی کے ساتھ مخلص ہیں۔ وہ مریضوں کے جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ ان کا روحانی علاج بھی کرتی جاتیں۔ ماں بننے کے مرحلے سے گزرنے والی خواتین کو تسلی دیتیں کہ ''اس عمل سے صبر کے ساتھ گزرنا ایک مجاہد کے جہاد کے برابر ثواب حاصل کرنے کا موقع ہے''۔ ایک مریضہ نے بتایا کہ میں بیماری کے ہاتھوں اپنے گھر سے ناامید ہو کر ان کے پاس جاتی اور ایک امید کے ساتھ واپس آتی۔ جب دل چاہا ان کے کلینک یا گھر چلی جاتی لیکن انھوں نے نہ کبھی ناگواری کا اظہار کیا نہ فیس کا تذکرہ کیا۔ مجھے سمجھاتی تھیں کہ جو عظیم لوگ ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ہی بیمار کرتے ہیں۔ اگر تم یہ بیماری کا عرصہ صبر کے ساتھ گزار و گی تو کیا پتا اللہ کی کتنی پسندیدہ بندی بن جاؤ۔ اوپر تلے بیٹیوں والے مریضوں کو سمجھاتیں کہ بیٹی خدا کی کتنی بڑی رحمت ہے۔ ہمارے نبی پاکؐ کی بھی چار بیٹیاں تھیں جو بیٹیوں کی اچھی تربیت کرے گا اُسے نبی اکرمؐ کی شفاعت نصیب ہو گی۔ مریضوں سے کہتیں ''اپنے اور اپنے بچّوں کے لیے تو سب ہی دعا کرتے ہیں آپ کشمیر اور فلسطین کے مسلمانوں کے لیے دعا کریں''۔ ہر مریض کو خدا پر کامل یقین، قرآن اور نماز کی تاکید کرتیں۔ مریضوں کے علاوہ پورے اسٹاف کے ساتھ ان کا تعلّق ایک بڑی بہن کی مانند تھا۔

رمضان میں تمام اسٹاف کے لیے سحر و افطار کا اہتمام کرتیں اور عید پر ہر ایک کو جوڑے دیے جاتے۔ رات کی ڈیوٹی کی نرس کبھی سو جاتی تو اسے اٹھانے کے بجائے خود اس کے حصّہ کا بھی کام کر لیتیں ان کے ساتھ سترہ اٹھارہ سال کام کرنے والی نرس رضیہ بتاتی ہیں کہ ''پیسہ اور علم ہماری باجی پہ عاشق تھا۔ بہت ہمّت اور حوصلے والی عورت تھیں۔ جب ان کی سب سے چھوٹی بچّی کی پیدائش پر ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تو میں رونے لگی۔ ٹھیک ہونے پر مجھے کہا ''جو عورت بچّے کی پیدائش پر مر جاتی ہے، وہ تو شہید ہوتی ہے۔ جنّت میں جاتی ہے۔ ہمیشہ حوصلہ قائم رکھتے ہیں۔ موت کوئی ڈرنے والی چیز نہیں ہے۔ اپنے رب سے ملاقات تو خوشی کا مقام ہے، رونے کا نہیں''۔ میرے اپنے بچّے نہیں ہیں تو وہ اپنے سب بچوں کی طرف اشارہ کر کے کہتی تھیں کہ یہ سب رضیہ کے ہیں، کوئی یہ نہ کہے کہ رضیہ کے بچّے نہیں ہیں''۔ دوسری نرس انور

بی بی بتاتی ہیں کہ ''وہ انتہائی سادہ طبیعت خاتون تھیں۔ اتنا سادہ لباس پہنتیں لوگ پہچان ہی نہ پاتے تھے کہ یہ ڈاکٹر ہیں۔ ہمیشہ سلام کرنے میں پہل کرتیں۔ ایک دفعہ میں بہت زیادہ بیمار ہو گئی تو مجھے کہنے لگیں ''انور تم اپنا صدقہ دو۔ دیکھنا تم کتنی جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی''۔ ہمیں ان کے پاس کام کرتے ہوئے کبھی کسی قسم کا ڈر یا جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اگر ہم سے کوئی غلطی یا نقصان ہو بھی جاتا تو وہ ہم پہ ناراض نہیں ہوتی تھیں''۔ ان کی ساتھی ڈاکٹر شمع کہتی ہیں کہ ''بحیثیت ساتھی کے، میں نے انہیں نہایت سادہ، مخلص، سچّی اور ہمدرد ڈاکٹر پایا۔ مریضوں کے ساتھ ان کا رویّہ بہت نرم اور دوستانہ ہوتا، اکثر مریض ان سے اپنے گھریلو مسئلے بیان کرتے اور وہ انہیں بہت پیار اور توجّہ سے سمجھاتیں۔ ڈلیوری کے وقت مریضہ کو بہت پیار کرتیں۔ تسلّی دیتیں اللہ کا ذکر خود بھی کرتی رہتیں اور مریضہ کو بھی تلقین کرتیں۔ اگر کبھی نرس مصروف ہوتی تو مریضہ کا کوئی بھی کام کرنے میں عار نہ سمجھتیں''۔

وسعتِ دل:

ڈاکٹر عذرا بتول کے حسن سلوک کے مستحق صرف ان کے مریض ہی نہ تھے بلکہ ان کی ذات کا فیضان ہر ایک انسان تک وسیع تھا۔ گھر کے ملازم ہوں، محلّے والے ہوں، یا مدد کے لیے آنے والے سائلین سب ان کی سخاوت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ جب بھی پھل یا مٹھائی خریدی تو سسرال والوں کے حصّے بنانے کے بعد اپنے حصّے میں سے گلی میں تندور والی کے بچّوں کا، ڈرائیور کے بچّوں کا، کبھی کسی جمعدار یا دائی کے بچّوں کا حصّہ بھی ضرور لگاتیں۔ گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے والے سائلوں کو گھر کے اندر بلا کر کھانا کھلاتیں اور دس بیس روپے دے کر رخصت کرتیں۔ تندور پر روٹی پکانے والی کے لیے گھر میں ملازمہ کو خاص ہدایت کی ہوئی تھی'' کہ دن میں ان کو دو بار لسّی پلایا کرو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو اس کے بچّوں کا کیا ہو گا؟'' غریب عورتوں سے ازار بند بنواتیں یا کڑھائی کرواتیں کہ اسے مزدوری مل جائے اور سب چیزیں تحفے میں بانٹ دیتیں۔ جو شخص بھی کسی کی ضرورت ان کے سامنے رکھتا فوراً مدد کے لیے تیار ہو جاتیں۔ انہیں پتا چلا کہ ایک یتیم بچّی آگے پڑھنے کی خواہشمند ہے تو فوراً اس کے داخلے کے پیسے دے

دیے اور اطمینان دلایا کہ وہ جہاں تک پڑھنا چاہتی ہے پڑھے۔ میں اس کے اخراجات اٹھاؤں گی۔

ایک غریب خاتون نے آ کر کہا ''مجھے پیسوں کی ضرورت ہے لیکن واپس نہیں کرسکوں گی۔ صرف دعا دے سکتی ہوں''۔ اسے کہا ''مجھے دعا ہی چاہیے'' اور ضرورت پوری کر دی۔ اس عورت نے کہا ''اللہ تمہیں ایمان کی سلامتی عطا فرمائے'' تو اس پر سوچتی رہیں کہ اس نے مجھے کتنی اچھی دعا دی ہے۔ میں ساری دولت بھی اس پر لُٹا دیتی تو کم تھا۔ ایک دفعہ باغ کی سیر کو خاندان کے ساتھ گئیں تو مالی کی بیوی کو دیکھا کہ دو سال سے بڑے بچّے کو دودھ پلا رہی ہے۔ اسے بلا کر منع کیا، سمجھایا کہ اسے کھانے کی عادت ڈالو۔ پرس سے پین اور کاغذ نکال کر دوا لکھ دی اور چند نوٹ چپکے سے ہاتھ میں پکڑا دیے کہ ''اس سے دودھ منگوا کر پی لینا''۔ ملازموں کی عزتِ نفس کا انتہائی خیال رکھتیں۔ کچن میں کام کرنے والی ملازمہ کہتی ہے کہ ''مجھے تو کبھی پتا ہی نہ چلا کہ گھر کی مالک میں ہوں یا ڈاکٹر صاحبہ''۔ شادی پر جانے کے لیے ملازمہ کو سوٹ کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹر صاحبہ سے کہا تو انھوں نے کہا ''میرے سوٹوں میں سے جو تمھیں پسند ہو وہ لے لو''۔ ڈرائیور کو ہمیشہ بھائی کہہ کہ مخاطب کیا اور سفر میں اپنے سے پہلے اس کا خیال رکھا۔ ایک دفعہ سفر سے واپس آئیں تو بچّوں کے لیے مٹھائی، کپڑے اور پیسے دے کر اسے گھر بھیجا۔ ڈرائیور کے یہاں دس سال بعد بیٹا پیدا ہوا تو ازحد خوشی کا اظہار کیا۔ اسی شام خود جا کر بچے کے لیے کئی سوٹ، بیوی اور بچّیوں کے لیے کپڑے لائیں۔ بچّے کا نام تجویز کیا۔ سات دن بعد وہ بچّہ فوت ہو گیا تو غم میں بڑی تسلی دی۔ اس کی بیوی کے پاؤں دباتے ہوئے کہا غم نہ کرو۔ جس کے جتنے بچّے فوت ہوئے ہیں صبر کرنے پر جنّت میں اتنے ہی گھر ملیں گے۔ اللہ سے دعا کرو وہ اور دے گا اور اللہ نے اپنی بندی کی یہ بات بھی سچ کر دکھائی۔ شوہر صاحب جب الیکشن میں کھڑے کیے گئے تو آدھی رات تک گھر واپسی ہوتی تو ہمیشہ ڈاکٹر عذرا استقبال کرتیں اور ڈرائیور سے بھی کہتیں کہ ''نیا مت بھائی۔ آپ بھی کھانا کھا کر جائیں۔ اتنی رات میں گھر جائیں گے تو بھابی پریشان ہوں گی''۔ جب ڈرائیور نے اپنا گھر بنانے کے لیے لیاقت صاحب سے دو لاکھ روپے مانگے اور انھوں نے اس کی فرمائش ڈاکٹر عذرا کے سامنے رکھی تو فوراً کہا

کہ ''دے دیں نا۔ بے چارے کا گھر بن جائے گا۔ آپ نے کیا کرنے ہیں جمع کر کے''۔

بہترین مہمان نواز:

دل کی انتہائی سخی اس عظیم خاتون کا ایک اور امتیازی وصف ان کا مہمان نواز ہونا تھا۔ ان کے شوہر لیاقت صاحب پر کئی تنظیمی ذمہ داریاں تھیں۔ ضلع اوکاڑہ میں جماعت اسلامی، متحدہ مجلس عمل، پیا کی صدارت ان کے پاس تھی جس کے باعث ایک وسیع حلقہ احباب کے مالک تھے۔ کبھی کبھی دس پندرہ افراد ملاقات کے لیے بیک وقت موجود ہوتے تھے اور ان کی مہمان نوازی ڈاکٹر صاحبہ کے سپرد ہوتی۔ اگرچہ کچن انہوں نے ملازمین کے حوالے کیا ہوا تھا اور ان کی آزادی میں کم ہی مخل ہوتی تھیں لیکن مہمانوں کے آنے پر خود جا کر انتظام کرتیں۔ مہمان توقع سے زیادہ ہوتے تو چھوٹی بیٹی جو حافظہ ہے، اس کو بلا کے کہتیں۔ بیٹا سورۃ یٰسین پڑھو، تاکہ کھانے میں برکت ہو جائے۔ اکثر مہمانوں کو کھلانے کے بعد خود اور بچّے اچار سے روٹی کھا کر گزارا کر لیتے۔ خاندان بھر سے کوئی بھی اوکاڑہ آتا، ان کی بہترین مہمان نوازی کرتیں۔ یہ وصف اتنا نمایاں اور معلوم تھا کہ جماعت کے احباب انھیں خود بھی فون کر کے مطلع کر دیتے تھے کہ ''ہم اتنے افراد فلاں جگہ سے آئے ہیں۔ کھانے کا انتظام کر دیں''۔ جب لیاقت صاحب نے ۲۰۰۰ء میں ناظم کا اور ۲۰۰۱ء میں قومی اسمبلی کے الیکشن بھی لڑا تو اس دوران ڈاکٹر عذرا نے جہاں ہسپتال اور پورے گھر کو سنبھالا وہیں روزانہ بے شمار لوگوں کی کھانے اور چائے پانی سے تواضع بھی کی۔

تحریکی زندگی:

اگرچہ ڈاکٹر عذرا کے لیے اپنے ہسپتال، وسیع خاطر تواضع اور نو بچّوں کی ماں ہونے کی ذمّہ داریاں ہی بہت گراں تھیں مگر آفرین ہے کہ رضائے الٰہی کی طلب کے لیے اقامتِ دین کا جو راستہ آپ نے دورِ طالب علمی میں چنا تھا، یہ سب اس راہ میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔ جماعت کی رکنیت کا حلف اٹھایا اور جتنا ہو سکا، اس راہ کے مراحل طے کرتی رہیں۔ پھر تحریک نے آپ کو ضلع اوکاڑہ کی ناظمہ بنا دیا۔ اس ذمّہ داری کے تقاضے نبھانے کے لیے آپ نے نہ صرف شہر

میں بلکہ ضلع کے دور دراز مقامات پر خود جا کر دعوت پھیلائی اور درسِ قرآن کے چراغ روشن کیے۔ جس وقت آپ شادی کے بعد سسرال پہنچیں تو گاؤں کی عورتیں قرآن سے قطعی ناواقف تھیں۔ انہوں نے مسجد سے درس کا اعلان کروایا اور پھر سورۃ عصر پر درس دیا جو اتنا جامع اور پُر اثر تھا کہ خواتین میں اس کا تاثّر بیٹھ گیا اور اس وقت سے ہر آٹھ دن بعد درس کی روایت بن گئی۔ ان کا درس سادہ اور جامع ہوتا جو سب پڑھی لکھی اور اَن پڑھ خواتین کو سمجھ میں آ جاتا۔ درس کے پیچھے موجود کردار کی طاقت کے باعث کی گئی ہر بات دل پر اثر چھوڑ جاتی۔ وہ ہر مکتبہ فکر کے متاثرین میں یکساں مقبول تھیں اور ہر جگہ بلاتکلّف اپنی بات کہہ دیا کرتیں۔ کسی بھی جگہ درس کے لیے بلایا جاتا تو انکار نہ کرتیں۔ گاڑی نہ ہوتی تو رکشہ میں جا کر دیہاتوں میں درس دے آتیں۔ اس معاملہ میں رب پر اتنا توکّل تھا کہ لیبر روم میں کوئی مریضہ بھی ہوتی تو اندازہ کر کے وہ یہ کہہ کر چلی جاتیں کہ ''اتنی دیر میں ان شاء اللہ کچھ نہیں ہوگا'' اور واقعتاً کبھی ان کے پیچھے ایسا کوئی مسئلہ نہ ہوا۔ درس کے دوران اکثر کہتیں 'اے اللہ میری جان تیرے نام پر قربان۔ میرے والدین اور بچّے تیرے نام پر قربان' اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔

الیکشن کے دوران بے شمار گاؤں دیہاتوں تک جا کر ووٹ کی اہمیت اور اسے صحیح لوگوں کے حق میں استعمال کرنے کی اہمیت سمجھائی۔ ۱۹۹۶ء میں واجپائی کی آمد پر احتجاج کے باعث جن کارکنانِ جماعت کو گرفتار کیا گیا، اس میں ان کے شوہر بھی شامل تھے۔ آپ نے اس موقع پر کسی پریشانی کے اظہار کے بجائے کہا کہ ''راہِ حق میں تو یہ منزلیں آتی ہی ہیں۔ چلو ہمیں بھی سنّتِ یوسفیؑ پر عمل کرنے کا موقع ملا''۔ اس سلسلے میں جب نظم کی جانب سے دیگر گرفتار کارکنان کے گھروں پر جا کر تسلّی دینے کی ہدایت آئی تو آپ کھیتوں میں آدھا آدھا کلومیٹر تک پیدل چل کر سرکنڈوں سے بنے ہوئے جھونپڑوں تک گئیں اور وہاں ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر اہلِ خانہ کو اس طرح سمجھاتیں کہ عورتیں کہہ اٹھتیں کہ ''اگر ہمارے بھائی بیٹوں کی وجہ سے اسلام کی سربلندی ہوتی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ آپ دوسرے مردوں کو بھی لے جائیں''۔ کچھ خواتین کی جانب سے کڑوی کسیلی باتیں بھی سننی پڑیں جو صبر سے برداشت کرتیں۔

خود اپنے گھر میں قریبی طالبات اور خواتین کے لیے ترجمہ قرآن کی کلاس شروع کر رکھی

تھی جو صبح ہسپتال جانے سے پہلے لیا کرتیں اور خواہ رات بھر ہسپتال سے جاگ کر آئی ہوتیں لیکن اس کلاس کی وجہ سے صبح نہ سوتیں۔ طالبات نے بتایا کہ ''ہم نے ان سے ایک سال میں سولہ پارے پڑھے''۔ رات بھر جاگ کر مریضاؤں کا خیال کرتیں اور صبح ہسپتال میں بیٹھ کر اپنی تنظیمی رپورٹ تیار کر رہی ہوتیں''۔ ان کی نائب بتاتی ہیں کہ ''جب نظم بالا سے دورے پر ذمہ دار آئی ہوتیں تو ان کے سامنے انتہائی احتیاط کے ساتھ اپنی رپورٹ دیتیں۔ ذمّہ داری کی بابت اللہ کے حضور جوابدہی کے احساس سے بہت ڈرتیں۔

ساتھ کام کرنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتیں۔ مشکلات میں ہمّت بندھاتی رہتیں اور کام کی حکمت عملی ان کے مشورے سے تیار کرتیں کبھی اپنی تھکاوٹ یا تکلیف کو ظاہر نہیں کیا اور دوسرے کارکنان کو بھی یہی نصیحت کرتیں کہ ''اپنی تکلیف یا تھکن کا ذکر نہیں کرتے ورنہ اجر میں کمی آ جاتی ہے''۔ بطور ناظمہ مشکل خود برداشت کر کے کارکنان کو آسانیاں دینے کی کوشش کرتیں۔ پروفیسر عرفان صاحب کے دس روزہ فہم القرآن کورس میں سارا وقت دوڑ دھوپ میں لگی رہتیں۔ روزانہ اختتام پر جب تک ساری خواتین چلی نہ جاتیں وہاں موجود رہتیں۔ دیگر خواتین کو گاڑیوں میں بھجوا کر خود چھوٹے چھوٹے بچّوں کے ساتھ پیدل واپس آ جاتیں۔ ایک دن کسی بڑے اجتماع میں ناظمہ طعام تھیں۔ خواتین زیادہ تھیں کھانا کچھ کم تھا۔ سب خواتین کو کھانا کھلانے کے بعد اجتماع گاہ کا چکّر لگا کر بچا ہوا کھانا جمع کیا اور وہی نان کے بچے ہوئے ٹکڑے خود بھی کھائے اور بچّوں کو بھی کھلا دیے۔

امانت کی حفاظت کا حد درجہ احساس تھا۔ جماعتی گاڑی کو کبھی ذاتی ضروریات کے لیے استعمال نہیں کیا۔ البتہ اپنی ذاتی گاڑی کو جماعتی کاموں میں خوب استعمال کرتیں۔ جمعیت طالبات سے بہت لگاؤ تھا اور اتنی مصروفیات کے باوجود طالبات کا ہفتہ وار اسٹڈی سرکل بھی کنڈکٹ کرتی تھیں اور ذہنوں میں موجود سارے سوالات کے تسلّی بخش جوابات دیا کرتیں۔ اپنی زندگی کا آخری درس انھوں نے سانحۂ مسجد اقصیٰ پر دیا جو خلافِ معمول طویل تھا جس میں آپ نے شرکا پر یہود و نصاریٰ کی تمام سازشوں کو اچھی طرح واضح کیا تھا۔

صبغۃ اللہ:

صوفیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ''طمع نہیں کرتے، جمع نہیں کرتے اور منع نہیں کرتے''۔ ڈاکٹر عذرا بتول کی زندگی انہی اوصاف کا نمونہ تھی۔ لاکھوں کمانے والی اس ڈاکٹر کی الماری جب بھی کھولی جاتی اس میں ذاتی کپڑے کم اور غریبوں اور بیواؤں کے لیے سلے ہوئے کپڑے زیادہ ملتے۔ دوسروں کے لیے جب خریداری کرتیں، اچھی سے اچھی چیز لاتیں اور جب اپنے لیے تو انتہائی سادہ چیز منتخب کرتیں۔ کہتی تھیں کہ ''میرے نبی ﷺ نے تحفہ اچھے سے اچھا دینے کی ہدایت کی ہے اور خود سادگی کو شعار بنانے کو پسند کیا ہے، اس لیے میں تو اپنے لیے قیمتی کپڑے جوتے نہیں بنا سکتی''۔ اپنے علاوہ اپنے بچّوں کے لیے بھی ہمیشہ سادگی پسند کی اور انھیں نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔

زندگی کی نمایاں پہچان نرمی سادگی اور ہونٹوں پر ہمیشہ موجود مسکراہٹ تھی جس کی موجودگی میں ہونٹوں کی مزید آرائش کی ضرورت نہ پڑتی۔ جہاں جگہ ملتی سو جاتیں۔ گرمیوں میں چھت پر جا کر بان کی چارپائی پہ بغیر بستر کے سو جاتیں، کوئی دیکھتا تو بعد میں جا کر پنکھا لگا دیتا۔ گھر میں A-C لگانے کی بات ہوئی تو سخت مخالفت کی اور کہا کہ ''نہ میں خود اس بیماری کا شکار ہوں گی نہ اپنے بچّوں کو ہونے دوں گی''۔ بچّوں کو سمجھایا کرتیں کہ ''پاکستان میں کفر، اسلام کو مٹانے کے درپے ہے، پہلے اسلام اور پاکستان کی فکر کرو، جو لوگ آسائشات کے عادی ہو جاتے ہیں، انہیں شکار کرنا آسان ہو جاتا ہے''۔ ان کی زندگی سورۃ العصر کی تفسیر تھی۔ کارکنان کو سمجھایا کرتیں ''انسان چاہتا ہے اس کا بدن اور جسمانی صلاحیتیں باقی رہیں۔ چنانچہ ان کو اللہ کی راہ میں لگا دو۔ جو اس راہ میں صَرف ہو گیا وہ بچ گیا جس کو بچا کے رکھا وہ ضائع ہو گیا''۔ خود انہوں نے دنیاوی چیزوں سے محبت کی، نہ اس میں دوسروں سے بڑھنے کی کوشش کی۔ ایک دفعہ کہا ''میں نہیں چاہتی کہ میرا لباس گھر کے دوسرے افراد یا ہاسپٹل کی ملازم خواتین سے بہتر ہو''۔

دواؤں سے زیادہ اللہ کی قدرت پر یقین رکھتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ ''بیماری آنے پر جتنا خرچہ آتا ہے وہ میں پہلے ہی صدقہ نکال دیتی ہوں بس اللہ تعالیٰ شفا یاب رکھتے ہیں''۔ شادی

کے وقت شوہر سے کہا میں اپنی آمدنی کا ۱۰/احصّہ اللہ کی راہ میں نکالتی ہوں۔ انہوں نے کہا۔ آپ اس عمل کو جاری رکھیں۔ بعد میں کہتی تھیں کہ ''اب میرا رب مجھے بے حساب دے رہا ہے تو میں بھی اس کی راہ میں بے حساب دے رہی ہوں''۔ ان کی زندگی کا سانچہ قرآن وسنّت کے مطابق تھا۔ ہر اس عمل کو زندگی میں اپنانے کی خواہاں تھیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک پسندیدہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کے اس دور میں آپ کے دس بچّے تھے جس میں سے ایک بچّے کا ابتدائی عمر میں انتقال ہو گیا تو کہا ''ہم اللہ کی رضا پر راضی ہیں چلو ہماری آخرت کا بھی کچھ سامان ہو گیا''۔ لوگ حیران ہو کر پوچھتے تھے کہ آپ ڈاکٹر ہیں اور آپ کے اتنے بچّے؟ تو جواب دیتی تھیں کہ ''جب اللہ کے پیارے نبیؐ کو زیادہ بچّے جننے والی عورت پسند ہے تو میں کیوں اس شرف سے محروم رہوں؟ اللہ مجھے مجاہد دے رہا ہے''۔

تربیتِ اولاد:

انھوں نے اولاد کی یہ نعمت پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ وصول کی اور اس کے سارے حقوق ادا کیے۔ بچّوں کے کام خود کرنے کی کوشش کی۔ آیا کے حوالے نہیں کیے۔ بچّوں کی شرارتوں سے الجھتی نہیں تھیں، صرف اس وقت ڈانٹتیں جب کوئی ناگوار بات ان کی زبان سے سنتیں۔ پانچ وقت کی نماز کی انتہائی تاکید کرتیں۔ بچّوں کے دل میں اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب کی محبت ڈالتیں۔ خود لوری سناتیں کہانیاں سناتیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹے نے حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ خود ان سے روز ایک پارہ سنتی تھیں اور اپنی مصروفیات میں سے اس کا وقت ضرور نکال لیتیں۔ بچّوں کے اخلاق و معاملات پر کڑی نظر رکھتیں۔ بیٹے نے ایک دفعہ اپنے کزن کو مارا تو شوہر سے کہہ کر پٹائی لگوائی۔ بچّوں کو نازنخروں والا نہیں بنایا۔ سخت کوشی کو بچّوں کے لیے پسند کرتی تھیں کہ آگے چل کر انھیں مجاہد بننا ہے۔ کسی حادثہ سے پریشان نہیں ہوتی تھیں۔ کہتی تھیں ''میں تو روز صبح اپنے بچّے اللہ کے حوالے کر دیتی ہوں، وہی حفاظت کرنے والا ہے اور ویسے بھی چوٹیں لگنے سے ہی بچّے جہاد کے لیے پکّے ہوتے ہیں آخر انہوں نے میدانِ جہاد میں بھی تو جانا ہے''۔ ایک دفعہ بچّوں نے شکایت کی کہ ''فلاں فلاں چیز

ہمارے پاس نہیں ہے۔ آپ کیسی امّی ہیں، ہمیں کچھ دلاتی نہیں ہیں''۔ کہنے لگیں ''تو پھر کیا ہوا؟ میں تو یہی دعا کرتی ہوں کہ اے اللہ میرے بچّوں کو اس جہاں میں کوئی کمی آجائے تو خیر ہے لیکن انہیں آخرت میں کسی چیز سے محروم نہ کرنا''۔ بڑے بیٹے نے جب کہا کہ ''میٹرک کے امتحان کے باعث اس سال میں تراویح میں قرآن نہیں سنا سکوں گا'' تو اس سے کہا ''دنیا کے نمبروں سے کیا ہوتا ہے؟ دس نمبر کم آ گئے تو کیا ہوا؟ لیکن قرآن ضرور سنانا''۔ لوگ انہیں بچّوں کی کامیابی پر مبارکباد دیتے تو کہتیں کہ، ''میں اپنے بچّوں کے اس دنیا میں اعلیٰ کیریئر کے بارے میں فکرمند نہیں مجھے تو یہ فکر زیادہ رہتی ہے کہ میرے بچے اچھے مسلمان بنیں''۔

رب سے ملاقات:

قریبی افراد بتاتے ہیں کہ ان کی دعاؤں میں ہر وقت شہادت کی دعا بھی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی جذبات کا اظہار یہ کہہ کر کرتیں کہ 'اگر میرے رب نے مجھے شہادت سے نوازنے کا فیصلہ کرلیا تو میں اس کو قبول کرنے میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہیں کروں گی، میں ابھی مرنے کے لیے تیار ہوں''۔ عین عالم جوانی میں، جبکہ گود میں دس ماہ کی دودھ پیتی بچّی موجود ہو، اچھی آمدنی ہو، بڑا گھر اور خاندان ہو، اپنے رب سے ملاقات کا اس درجہ شوق وہی رکھ سکتا ہے جس نے اس کی بھرپور تیاری کی ہو۔ اللہ نے ان کی خواہش کو شرفِ قبولیت بخش دیا۔

۶ ستمبر ۲۰۰۳ء کو وہ اپنی گاڑی میں دونوں چھوٹی بچّیوں کے ساتھ ڈاکٹرز کی تربیت گاہ میں شرکت کے لیے لاہور روانہ ہوئیں، راستے میں اینٹوں کے ٹرالر کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوگیا اور انہوں نے موقع پر ہی شہادت کی سعادت حاصل کرلی جبکہ دونوں بچّیوں کو خراش تک نہ آئی۔ چند گھنٹوں میں ہی یہ خبر پورے ضلع اور دیگر اضلاع تک پہنچ گئی۔ مرد و خواتین کی کثیر تعداد ان کے گھر پر جمع ہوگئی۔ اس شام اوکاڑہ کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں شاید ہی کوئی ہوگا جو غمزدہ نہ ہو۔ بہت سے گھروں میں اس دن چولہا نہ جلا۔ رکشے اور تانگے والوں سے لے کر، چھابڑی فروش اور تندور چی تک، ڈاکٹرز اور نرسوں سے لے کر حکیموں اور مریضوں تک، علما اور مشائخ سے لے کر مدارس کے اساتذہ اور طلبا تک، بلدیاتی نمائندوں سے لے کر سرکاری ملازمین تک سبھی

جنازے میں شرکت کے لیے پہنچ گئے۔ شیعہ، سنی، دیوبندی، سلفی، سب بڑی تعداد میں موجود تھے۔ تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین بھی موجود تھے۔ اوکاڑہ کی وسیع مسجد کی چھت کے نیچے کئی طویل صفیں بن جانے کے بعد باہر کا صحن بھی بھر گیا، اس کے بعد وسیع و عریض میدان بھی پُر ہوگیا اور پھر راہداریاں اور گزرگاہیں بھی نمازیوں سے پُر ہوگئیں۔ ساٹھ ستّر سال کے بزرگ شہری جو یہاں جنازے میں شریک ہو رہے تھے، گواہی دے رہے تھے کہ اتنا بڑا جنازہ اوکاڑہ کی تاریخ میں کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ دوسری نماز جنازہ اسی گاؤں میں ادا کی گئی جہاں وہ دلہن بن کر گئی تھیں۔ عشاء کی نماز حافظ قرآن بیٹے نے پڑھائی اور سورۃ البقرہ کی آیات کے ذریعہ مصیبت میں مومن کے لیے صبر کی نصیحت کا اعادہ کیا۔ یہاں بھی جنازے کی نماز کے لیے ۱۹ صفیں بنیں جو گاؤں کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ بن گیا اور پھر ڈاکٹر عذرا کی خواہش کے مطابق رات کے اندھیرے میں انھیں ان کی آخری آرامگاہ پہنچا دیا گیا۔

اٹھارہ سال قبل اس گھر میں دلہن اور چوتھے نمبر کی بہو بن کر آنے والی عذرا رخصت ہوئی تو ہر خاندان والا یہ محسوس کر رہا تھا جیسے سب سے زیادہ اسی کا نقصان ہوا ہے۔ ہر ایک نے کہا کہ ''آج تک اس نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے ہمارا دل دکھا ہو''۔ یہ عجیب بات ہے کہ کسی کے سامنے آج بھی ڈاکٹر عذرا بتول کا ذکر کیا جائے، ان کی باتیں بیان کی جائیں تو سننے والا خواہ واقف ہو یا ناواقف، آشنا ہو یا ناآشنا اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ وہ آج بھی اپنی نیکیوں کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ہماری بے پناہ خوبصورت یادوں میں زندہ ہیں۔ بے شمار مریضوں اور لوگوں کی دعاؤں میں زندہ ہیں۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

ماخذات

۱۔ ''ڈاکٹر عذرا بتول''۔ خواتین میگزین پبلکیشنز
۲۔ ڈاکٹر لیاقت علی کوثر صاحب۔ شوہر

نورجہاں کنول

۱۹۵۹ء تا ۲۰۱۱ء

اندرون سندھ رواج تھا کہ جس گھر میں درس ہوتا وہ درس دینے والی خاتون کو مٹھائی، دوپٹہ یا اسی قسم کی کوئی چیز تحفے میں ضرور دیتے۔ ادی نورجہاں نے یہ روایت قائم کی کہ جو بھی تحفہ ملتا وہ اسے اپنا سمجھنے کے بجائے ناظمہ کے حوالے کر دیتیں اور کہتیں کہ ''یہ تحفہ اللہ کے دین کے کام کے سلسلے میں ملا ہے، اس پر اللہ کا حق ہے، ہمارا نہیں۔ آپ اسے بیت المال میں جمع کروا دیں۔ اگر خود کسی چیز کو استعمال کرنا چاہتیں تو بازار کے نرخ کے حساب سے اتنی رقم بیت المال میں جمع کروادیتیں اور پھر وہ چیز ہاتھ میں لیتیں''۔

سندھ کے شہر شکار پور میں ناظمات کا اجتماع منعقد ہو رہا تھا۔ ناظمہ صوبہ منظور فاطمہ ناظمات کا استقبال کر رہی تھیں۔ ایک خاتون نے داخل ہو کر برقع اتارا تو گویا اجالا پھیل گیا۔ خوبصورت خاتون، نئے جوڑے میں اور بھی نکھری ہوئی لگ رہی تھیں۔ انہوں نے پرس میں سے کچھ پیسے نکالے اور منظور فاطمہ کو دیتے ہوئے کہا، ''آپا یہ پیسے صدقے کی مد میں ڈال دیں۔ اللہ تعالیٰ نے نیا جوڑا دیا ہے، یہ اس کا صدقہ ہے''۔ ہر نعمت پر رب کا شکر اور ہر آزمائش میں صبر کرنے والی، ہر دکھ سہہ کر بھی لبوں پر مسکراہٹ قائم رکھنے والی، یہ ہستی نور جہاں کنول کی تھی۔ اندرونِ سندھ کا ماحول ایک طرف غربت، جہالت، بے روزگاری اور قدامت پرستی کی شہرت رکھتا ہے تو دوسری طرف جاگیردارانہ وڈیرا شاہی نظام اور پیری فقیری کے لیے معروف ہے۔ تقلید اور تعصب کے اندھیروں سے باہر آ کر، حق کی وسیع شاہراہ پر کھڑے ہونا اور دوسروں کو بھی اس کی طرف بلانے کا عمل جاری رکھنا، وہاں مردوں کے لیے بھی آسان کام نہیں اور خواتین کے لیے تو گویا پہاڑ کھودنے کے مترادف ہے۔ اللہ رب العالمین کا احسان ہے کہ اس نے جماعت اسلامی کو یہ اعزاز بخشا کہ اس کے دامن میں ایسی کارکن خواتین بھی موجود ہیں جنہوں نے مقابل کی طاقت و قامت اور اپنی ناتوانی سے متاثر ہوئے بغیر جدوجہد کا تیشہ کبھی ہاتھ سے نہیں رکھا۔ اور سنگلاخ زمینوں کو اپنے کردار و عمل کی پختگی اور محبت و انسیت کی نرمی سے دعوتِ حق کی قبولیت کے لیے نرم کر دیا ان میں نور جہاں کنول بھی شامل ہیں۔

ذاتی زندگی:

۳۱ جولائی ۱۹۵۹ء کو جیکب آباد میں آنکھ کھولنے والی ادی (بہن) نور جہاں شادی کے بعد شکار پور آ بسیں۔ یہ ان کی پہلی اور ان کے شوہر کی دوسری شادی تھی اور سندھ کے معروف رواج وَٹے سٹے کے تحت انجام پائی تھی۔ اللہ نے انہیں اتنی حسین شکل وصورت سے نوازا تھا کہ دور دور سے لوگ اس نئی دلہن کو دیکھنے آتے تھے۔ ناظمہ صوبہ سندھ منظور فاطمہ ان کے پڑوس میں رہتی تھیں، جلد ہی ان سے دوستی ہوگئی اور منظور فاطمہ نے ان سے اپنی دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے ان کی دوستی اس ہستی سے کرانے کی کوشش کی جو بندے سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ ادی نور جہاں نے بچپن میں گھر پر ایک خاتون سے قرآن پاک اور چند جماعتیں پڑھی ہوئی تھیں۔ تسلسل

نہ ہونے کے باعث وہ پڑھائی بھول چکی تھیں۔ لیکن انہیں پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ منظور فاطمہ نے اپنے گھر بلا کر نماز سکھائی، ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے درس سنائے پھر سندھی میں قرآن پاک کا ترجمہ پڑھانا شروع کیا۔ اس کے بعد ان کے ساتھ مل کر سندھی میں تفہیم القرآن اور دینی کتابیں پڑھنی اور ان پر گفتگو شروع کی۔ دین کی سچی تعلیمات ادی نور جہاں کے دل میں اتر گئیں اور انہیں بدل کر رکھ دیا۔ پہلے وہ عام خواتین کی طرح فیشن کی دلدادہ اور ٹی وی ریڈیو کی شوقین تھیں۔ اب انہیں مقصدِ زندگی سمجھ آیا تو تحریک میں شامل ہو کر، اس کے نصب العین کو اپنا نصب العین بنا لیا۔

آغازِ سفر:

۱۹۸۱ء میں جماعت اسلامی میں شمولیت کے بعد وہ خندہ پیشانی سے ہر تنقید یہ کہہ کر ٹال دیتیں کہ ''ہاں میں ملاّنی ہوں''۔ کوئی کتنا بھی الجھے وہ اس کی بھی خدمت میں لگی رہتیں اور تعلقات میں فرق نہ آنے دیتی تھیں۔ اپنی ناظمہ کے پاس جا کر سیرتِ پاک ﷺ کے واقعات پڑھتیں، دہراتیں اور نئے عزم کے ساتھ آپ وجود کو اس راہ پر چلنے کے لیے تیار کرتیں۔ اللہ نے چار بیٹوں اور پانچ بیٹیوں سے نوازا تھا۔ گھر میں شوہر کے والدین اور چھوٹے بہن بھائی بھی موجود تھے۔ ان سب کی خدمت کرتے ہوئے دین کے کام کو جاری رکھا۔ یہاں تک کہ سب کے دل بدلنے لگے اور شوہر صاحب بھی حلقہ خواتین کے ساتھ بہترین تعاون کرنے لگے۔

اپنے بچوں کے لیے ان کی خواہش اور کوشش تھی کہ وہ بھی اللہ کی راہ پر چلیں۔ جب بچے چھوٹے تھے تو انہیں بچوں کے اجتماع میں لے جاتیں۔ لڑکوں کو نماز کے لیے مسجد اور بزمِ ساتھی کے پروگرامز میں بھیجتیں۔ بڑے ہوئے تو جمعیت کے پروگرامز میں شرکت پر آمادہ کرتیں۔ اپنی ایک بیٹی کو جامعۃ المحصنات سے عالمہ کا کورس کروایا، لڑکیوں کو جمعیت طالبات کے پروگرامز میں بھیجتیں۔ بچے بڑے ہوئے تو ان سے منسلک رشتوں کے ساتھ بھی بہترین حسنِ سلوک کیا۔ بہترین ماں ہونے کے ساتھ ساتھ، بہترین ساس بھی تھیں۔ بہو کے ساتھ ایسا حسنِ سلوک رکھا کہ وہ ان کی وفات کے بعد اب تک ان کو یاد کرتی ہے۔ طبیعت کی خرابی کے باوجود پوتوں پوتیوں کو نہلانے، دھلانے، تیل کی مالش کرنے کا کام بہت خوشدلی سے انجام دیتیں۔ ساس آخر وقت میں بالکل بستر پر تھیں۔ ان کی بے حد خدمت کرتیں اور صفائی، ستھرائی، کھانے، علاج اور تمام ضروریات کو خود سنبھالتیں۔

تحریکی زندگی:

جماعت اسلامی میں شمولیت کے بعد دل میں دوبارہ سے پڑھنے لکھنے کی لگن جاگی۔ افسردہ ہوکر کہتیں کہ ''کاش میں کچھ لکھ پڑھ سکتی تو میں بھی درس دیتی''۔ منظور آپا نے انھیں مشورہ دیا کہ جب بچے سو جائیں تو میرے پاس آجایا کریں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور آہستہ آہستہ پڑھنا بھی سیکھا اور لکھنا بھی۔ قرآن کی تلاوت میں بھی درستگی پیدا کی اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ مدرّسہ بھی بن گئیں۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ بڑی صابر اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ اس وقت حالات ایسے تھے کہ جیسے دین کا کام کرنا کوئی بہت بڑا جرم ہو، جماعت کی خواتین کو لوگ عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے اور مذاق اڑاتے۔ وہ سب خواتین کو حوصلہ دلاتی رہتیں۔ پلاننگ کے بعد مشکل سے مشکل کام بھی اگر ان کے سپرد کر دیا جاتا تو وہ کبھی کرنے سے انکار نہ کرتی تھیں۔ ایسے ایسے گاؤں گوٹھوں میں جہاں اب تک جماعت کا کوئی مرد نہ گیا ہوتا وہاں ادی نور جہاں پہنچ جاتیں۔ ضلع شکارپور کی نظامت کے دوران جیکب آباد۔ کندھ کوٹ اور کشمور کی نگرانی اِن کے ذمے تھی۔ خود بتاتی تھیں کہ ہم نے کھوتے گاڑیوں (گدھے گاڑی) میں جاجا کر دین کی دعوت پہنچائی ہے۔ حق کے راستے میں گدھا گاڑی پر بیٹھنے میں بھی عار نہ تھا۔ وہ اسی کو غنیمت جان کر اس پر سفر کر کے اپنا کام پورا کر کے آتیں اور خوشی خوشی آ کر رپورٹ دیتیں۔

رمضان المبارک کے دوران نئی نئی جگہوں پہ دورہ قرآن کرانے خود جاتیں کہ کہیں کوئی قرآن پڑھنے اور سننے سے محروم نہ رہ جائے۔ طاق راتوں میں مختلف گوٹھوں میں شبِ بیداری رکھواتیں اور انہیں شبِ بیداری کا سارا طریقہ دکھا اور سمجھا کر اگلے سال کسی نئے مقام پر شبِ بیداری کرواتیں۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ خواتین دعوتِ دین کو قبول کرلیں۔

کونسلرشپ:

جنرل پرویز مشرف کے دور میں جب بلدیاتی انتخاب میں خواتین کو ۳۳ فیصد نمائندگی دینے کا فیصلہ کیا گیا تو پہلے مرحلہ میں سندھ کے اضلاع لاڑکانہ، سکھر، جیکب آباد اور شکارپور میں انتخابات کا اعلان کیا گیا۔ جماعت اسلامی کی شوریٰ نے خواتین کی سیٹوں پہ بھی نمائندہ خواتین کو کھڑے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن ان اضلاع میں خواتین کا اس کام کے لیے نکلنا بے حد

مشکل امر تھا۔ گھروں سے اجازت بھی نہیں ملتی تھی اور ماحول بھی بہت حوصلہ شکن تھا۔ ایسے ماحول میں ادی نور جہاں کا حوصلہ اور ہمت قابلِ دید تھی۔ جب انہیں ضلعی سطح پر الیکشن لڑنے کے لیے نامزد کیا گیا تو انہوں نے نظم کا فیصلہ قبول کیا اور قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔ پھر ضلعی ذمہ دار کی حیثیت سے اس پورے عمل کی نگرانی بھی کی۔ کبھی کورٹ کے چکر لگاتیں تو کبھی ایک یوسی میں اور کبھی دوسری یوسی میں نظم اور کارکنان کے ساتھ ہوتیں۔ منتخب ہونے کے بعد انہوں نے اپنی ذمہ داری دیانتداری کے ساتھ نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہر اجلاس میں شرکت سے قبل ضلعی امیرِ جماعت کی رہنمائی لیتیں اور اس کے مطابق بات کرتیں۔ حکومت کی طرف سے جو الاؤنس ملتا اسے بیت المال میں جمع کروا دیتیں۔ عوام الناس کی فلاح کے لیے انہوں نے گلیوں میں پختہ سڑکیں بنوائیں، مستحق خواتین کو سلائی مشینیں دلوائیں، مستحق بچوں کی فیس کے لیے فنڈ سے پیسے جاری کروائے اور ہر مسئلے کے حل کے لیے اپنا بھرپور تعاون پیش کیا۔

سراپا محبت:

ہر خاتون سے حسنِ سلوک کے ذریعے تعلق بڑھانے کی کوشش کرتیں۔ سب کے کام آتیں۔ کبھی کسی کی عیادت کو جارہی ہیں، کبھی کسی کو ہسپتال لے جارہی ہیں، کسی کے کپڑے سی کر دے رہی ہیں۔ محبت ان کے خمیر کا حصہ تھی۔ مہمان نوازی ان کے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ مہمانوں کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتی تھیں اور انتہائی عزت و احترام کے ساتھ ان کی تواضع کرتی تھیں۔ شعبہ ورکنگ ویمن کی ٹیم ہر ماہ اندرونِ سندھ کے دورے میں ہنر مند خواتین سے کپڑوں پر کڑھائی کروانے کے لیے شکارپور جاتی تھی تو اسے رات اپنے گھر پر ٹھیراتی تھیں۔ پوری ٹیم اعتراف کرتی ہے کہ ''ہم نے انہیں بے حد مخلص، انتہائی محبت کرنے والی اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کرنے والی پایا۔ ان کا گھر چھوٹے چھوٹے چار کمروں پر مشتمل تھا۔ ٹیم کے افراد کبھی چار اور کبھی پانچ بھی ہوجاتے تھے۔ ان کی رہائش کی وجہ سے کبھی گھر کے مردوں کو مشکلات بھی پیش آتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی پیشانی پر بَل نہیں آنے دیا۔ دورے کا وقت اور دن طے شدہ تھے۔ جس کے حساب سے وہ خود ہی ہر ماہ کراچی فون کر کے دریافت کرتی تھیں کہ آپ لوگ اپنے وقت پہ آرہے ہیں ناں؟ پورا خیال رکھتی تھیں کہ ہمارا وقت بالکل ضائع نہ ہو اور ہماری آمد و رفت کے

حساب سے ناشتہ، کھانے وغیرہ کا انتظام کرتی تھیں۔ ہمارے ساتھ ہمارے ڈرائیور صاحب کا بھی بہت خیال رکھتی تھیں اور یہ محبت نہ صرف انہوں نے دمِ آخر تک کی بلکہ اپنے بچوں میں بھی اسی طرح منتقل کردی کہ آج جب وہ اس دنیا میں نہیں تب بھی ان کے بیٹے بہو اصرار کر کے شعبہ ورکنگ ویمن کی ٹیم کو اپنے گھر میں روکتے ہیں اور بہو بیٹیاں اسی طرح سب کی خدمت کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ ٹیم کے افراد کے کوٹ اسکارف تک دھوکر ڈال دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہماری امی آپ سے محبت کرتی تھیں، اس لیے ہمیں بھی آپ لوگوں سے محبت ہے''۔

ان کی محبت تمام تحریکی بہنوں کے لیے سگی بہنوں سے بڑھ کر تھی۔ ناظمہ صوبہ منظور آپا کے گھر دورے پر نظم بالا کے افراد آتے تو ان کے بچے نور جہاں خالہ کو بلالاتے۔ وہ خوشی خوشی آتیں اور گھر کا سب کام مل کر کرواتیں اور مہمانوں کی خاطر داری کرتیں۔

صبر و تحمل:

اپنے عمل سے دوسروں کی رہنمائی کرتی تھیں۔ ایک دفعہ حیدرآباد کسی تربیت گاہ میں شرکت کے لیے دیگر تحریکی بہنوں کے ساتھ ٹرین سے روانہ ہوئیں۔ اسٹیشن آنے پر سب ساتھی اتر گئے لیکن ان کو علم نہ ہوسکا۔ آخر وقت میں پتا چلا جب ٹرین چلنا شروع ہوچکی تھی۔ جلدی میں نیچے اتریں تو سیڑھیوں سے پلیٹ فارم پہ گر گئیں اور گھٹنوں میں شدید چوٹ آئی لیکن صبر کے ساتھ اس تکلیف کو برداشت کیا اور ساتھیوں پر نہ ناراض ہوئیں نہ تکلیف کا اظہار کیا۔ اطاعت نظم میں بے حد چست تھیں۔ اپنی رپورٹ بروقت نظم کے حوالے کرتیں۔ سارے کام چھوڑ کر پہلے جماعت کا کام کرتی تھیں۔

احساسِ امانت:

اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے مال سے بھی تحریکِ اسلامی کو مضبوطی فراہم کرنے کی فکر غالب رہتی تھی۔ اپنے شہر و ضلع میں بیت المال کو مضبوط بنانے کے لیے کوشاں رہتی تھیں۔ بہنوں کو طرح طرح سے جذبہ ابھار کر اعانت اور فنڈ دینے کے لیے آمادہ کرتی تھیں اور خود اپنا حصہ سب سے پہلے ڈالتی تھیں۔ حسابات کے صاف رکھنے اور امانتوں کی حفاظت کی فکر غالب رہتی تھی۔ اندرونِ سندھ رواج تھا کہ جس کے گھر میں درس ہوتا وہ درس دینے والی خاتون کو مٹھائی، دوپٹہ یا اسی قسم کی کوئی چیز تحفے میں ضرور دیتیں۔ ادی نور جہاں نے یہ روایت قائم کی

کہ جو بھی تحفہ ملتا وہ اسے اپنا سمجھنے کے بجائے اپنی ناظمہ کے حوالے کردیتیں اور کہتیں کہ ''یہ تحفہ اللہ کے دین کے کام کے سلسلے میں ملا ہے۔ اس پر اللہ کا حق ہے، ہمارا نہیں۔ آپ اسے بیت المال میں جمع کروادیں''۔ اگر خود کسی چیز کو استعمال کرنا چاہتیں تو بازار کی قیمت کے حساب سے اتنی رقم بیت المال میں جمع کروا دیتیں اور پھر وہ چیز ہاتھ میں لیتیں۔ کارکنان کو بھی یہی تاکید کرتیں کہ ایسے تحائف امانت ہیں۔ اس پر ہمارا حق نہیں ہے۔ اس ضمن میں آپ اتنی حساس تھیں کہ گاؤں گوٹھوں میں جانے پر وہاں کے لوگ اپنی زمین کی تازہ سبزی بھی دیتے تو وہ بھی بیت المال میں جمع کرادیتیں۔ یہاں تک کہ اگر ہر ادھنیا بھی ملتا تو ناظمہ کو اس کے پیسے ادا کر کے اپنے استعمال میں لیتیں۔

آخری ایام:

آخر عمر میں شوگر اور دل کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ گھٹنوں میں بھی درد رہتا تھا لیکن جماعت کے کام میں لگی رہتی تھیں۔ آنکھوں میں تکلیف کے باعث انہیں گمبٹ شہر لے جایا جارہا تھا تو اپنی بیٹی سے سفر کے دوران بھی جماعت سے متعلق ہی باتیں کرتی رہیں۔ ڈاکٹرز نے آنکھوں کا آپریشن تجویز کیا لیکن اس سے پہلے ہی بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا اور وہ کوما میں چلی گئیں۔ پہلے انہیں سکھر اور پھر کراچی لایا گیا۔ لیکن ۳ مارچ ۲۰۱۱ء کو وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئیں اور اپنی محبت بھری یادیں چھوڑ گئیں۔ ان کی بیٹی بتاتی ہیں کہ انتقال کے وقت بہت تیز بارش ہورہی تھی لیکن جب جنازہ اٹھایا گیا تو بارش رک گئی اور تدفین مکمل ہونے کے بعد دوبارہ شروع ہوگئی۔ جس گلی سے جنازہ لے کر گئے وہاں خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جس کا ان کی میت میں آنے والے ہر شخص نے ذکر کیا۔ اللہ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور ان کی بھلائیوں اور نیکیوں کے طفیل وادیٔ مہران کو دعوتِ حق کا گلستان بنادے۔ آمین!

ماخذات

۱۔ منظور فاطمہ صاحبہ۔ سابقہ ناظمہ صوبہ سندھ ۲۔ رخسانہ نصیر صاحبہ۔ ممبر ورکنگ ویمن آرگنائزیشن
۳۔ سلمٰی مظاہر صاحبہ۔ ممبر ورکنگ ویمن آرگنائزیشن ۴۔ نسرین رمضان صاحبہ۔ ممبر ورکنگ ویمن آرگنائزیشن
۵۔ فوزیہ صاحبہ۔ بیٹی

u v